اور اُردو کا علمی و ادبی ماہنامہ آجکل دلّی بمناسبت جشن استقلال ہند

۱۵ اگست ۱۹۵۹ء

پدرِ ملت مہاتما گاندھی می گوید:

ہند بہ تمام کسانی تعلق دارد، کہ درینجا متولد و بزرگ شدہ اند، درجای دیگر وطنی ندارند، کہ متوجہ آن گردند۔
بدین قرار ہند ہمانقدر بہ پارسیہا، بہ یہودیہا، بہ مسیحیہا، بہ مسلمانہا و سائر [illegible]وم غیر ہندو تعلق دارد کہ مال ہندوہا ہم ہست۔
در ہند آزاد تسلط و اولیت و برتری با ہندوہا نخواہد بود، [illegible]ند متعلق بہ تمام ہندیانست، و برروی موضوع اکثریت مذہبی یا [illegible]وہہا و فرقہ ہای مذہبی تکیہ نخواہد داشت۔
بلکہ بر تمام مردم ہند بدون ہیچگونہ تبعیضی و امتیازی [illegible]لی خواہد بود۔

پنج شیل

طبیعی ترین نتیجۂ ہمین طرزِ فکر است کہ بنام "پنج شیل" یا پنج اصل نخستین بار در آوریل ۱۹۵۴ء در بیانیۂ مشہور "نہرو چو این لای" انتشار یافت، و از آن پس کشورہای متعدد دیگری ہم بآن ہا پیوستہ اند۔ این پنج اصل کہ اکنون شہرت جہانی یافتہ است بدین قرار است:-

احترام متقابل تمامیت ارضی و حق حاکمیت متقابل۔

عدم تجاوز۔

عدم دخالت متقابل در امور داخلی طرف دیگر۔

برابری حقوق و رعایت منافع متقابل۔

ہم زیستی مسالمت آمیز۔

نہرو میگوید: "امیدوارم این اصول نہ فقط از طرف کشورہای آسیا بلکہ از طرف تمام کشورہا و تمام ملت ہا مورد قبول و عمل واقع شود"

آہنگ دہلی

نگران

ڈاکٹر سید امیر حسن عابدی۔ ایم اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی

مدیر

سید عظمت علی رضوی معاون ہاشم طرزی بی اے

فہرست مضامین

جلد ۲ شمارہ ۳	بابتہ ماہ اگست سنہ ۱۹۵۹ء	قیمت فی کاپی ۸/ سالانہ چندہ ۵/

سرود ملی هند سرودی است که بنام «جانا گانا مانا» معروف است و بوسیله شاعر معروف هند رابیندرانات تاگور ساخته شده است. این سرود نخستین بار در دومین روز انعقاد جلسات کنگره ملی هند در ۲۷ دسمبر سال ۱۹۱۱ خوانده شده و بنام «بهارات ویدهاتا» در شماره ژانویه مجله «تاتوابودهینی پاتریکا» که از طرف تاگور منتشر میگشت چاپ شد. خود شاعر این سرود را بزبان انگلیسی ترجمه کرد و در سال ۱۹۱۹ بنام «سرود بامدادی هند» منتشر ساخت. در مجلس مؤسسان هند این سرود ملی انتخاب گردید که متن کامل آن پنج بند است و فقط دو بند آن در مواقع رسمی خوانده میشود که ترجمه آن چنین است

ای تو که صاحب اختیار ارواح همه مردمان هستی

وای تو که سرنوشت هند را در دست داری

نام تو دلهای مردم پنجاب و سند و گجرات و

مراتیها و دراویدیها را مانند فرزندان اوریسا و بنگال باهتزاز می آورد

کوهستان های بندهیا و هیمالیه طنین نام تو را منعکس میسازند

و رودهای گنگ و جامنا آنرا با ترانه های دلنشین بهم می آمیزند.

و امواج اقیانوس هند ترا می ستایند

مردم برای دریافت رحمت تو در نیایش اند و سرود و ستایش تو را می سرایند رستگاری تمام مردم

در دست توانای تو است. ای تو که سرنوشت هند را در دست داری

درود، درود، درود بر تو باد!

جانا گنا منا - آدهی نایاکا جایا هه - بهاراتا - بهاگیا - ویدهاتا - پنجابا - سیندهو - گجراتا

مراتا - دراویدا - اوتکالا - بانگا - ویندهیا هیماچالا - یامونا - گانگا - اوچ چالا -

جالادهی تارانگا - تاوا شوبها نام جاگه تاوا شوبها آشیزا ماگه گاهه تاوا - جایا - گاتها -

جانا گنا - مانگالا - دایاکا - جایا هه -

بهاراتا - بهاگیا - ویدهاتا - جایا هه، جایا هه جایا هه

جایا جایا جایا، جایا هه -

ڈاکٹر شیخ یوسف الفوزان سفیر کبیر سعودی عرب

منتعینہ نئی دہلی

سفارت کبریٰ شاہنشاہی
سعودی عربیہ

نئی دہلی ۱۵ مورخہ ۵ اردت ۱۹۵۹ء

نشان مجاریہ ۱۴/۱۷/۷۹

جناب والا

از نامہ گرامی مورخ یکم اوت سال ۱۹۵۹ میلادی باکمال مسرت اطلاع پیدا کردم کہ شمارہ مخصوص مجلہ وزین آہنگ بزودی منتشر خواہد شد۔

من این فرصت را مغتنم شمردہ کامیابی محق "آہنگ" را از خداوند متعال مسالت می نمایم۔

مخلص شما

یوسف الفوزان ۔ سفیر کبیر

سفارت کبریٰ شاہنشاہی
سعودی عربیہ

نئی دہلی ۱۵ مورخہ ۱۵ راگست ۱۹۵۹ء

نشان مجاریہ ۱۴/۱۷/۷۹

جناب والا

مجھے آپ کے مکتوب مورخہ یکم اگست سنہ ۱۹۵۹ء سے یہ معلوم ہو کر مسرت ہوئی کہ آپ اپنے موقر رسالہ آہنگ کا خاص نمبر شائع کر رہے ہیں۔ میں دعا کرتا ہوں کہ "آہنگ" کو کما حقہٗ کامیابی ہو۔

آپ کا مخلص

یوسف الفوزان ۔ سفیر کبیر۔

ہز ایکسی لنسی

آقائی مشفق کاظمی سفیر کبیر شاہنشاہی ایران

متعینہ دہلی نو

سفارت کبری شاہنشاہی ایران

دہلی نو شمارہ ۱۷۱۰ تاریخ ۲۵/۵/۱۳۳۹

مدیر محترم مجلہ شریفہ ماہیانہ آہنگ

باکمال مسرت اطلاع پیدا کردم مدیر محترم آن مجلہ شریفہ ماہیانہ در نظر گرفتہ کہ بمناسبت جشن دوازدہمین سال استقلال ہند نسخہ مخصوص حاوی از مقالات فرہنگی و ادبی بقلم نویسندگان معروف منتشر نمایند چنانکہ قبلاً ہم گفتہ شدہ موجب نہایت خوش وقتی است کہ مجلہ وزین شما در مدت کوتاہ انتشار خود در پیشرفت امور فرہنگی و بخصوص ترویج زبان فارسی گامہای بزرگی برداشتہ و امید است کہ دوران کامیابی در انجام این منظور عالی برای مدیر محترم و ہمہ کارکنان مجلہ شریفہ ہموارہ ادامہ داشتہ باشد۔

سفیر کبیر
مشفق کاظمی

سفارتخانۂ شاہنشاہی ایران

نئی دہلی۔ مورخہ ۲۵ مرداد ۱۳۳۸ نمبری ۱۲۶۴

مدیر محترم ماہنامہ موقر آہنگ

مجھے یہ اطلاع موصول ہو کر انتہائی مسرت ہوئی کہ ماہنامہ موقر "آہنگ" کے مدیر محترم نے ہندوستان کی آزادی کی بارہویں سالگرہ پر ایک خصوصی نمبر شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے جو مشہور ادیبوں کے لکھے ہوئے علمی و ادبی مضامین پر مشتمل ہوگا۔

جیسا کہ اس سے پہلے بھی کہا جا چکا ہے، یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ اجراء کے بعد قلیل مدت کے اندر ہی رسالہ نے تعلیمی امور کی ترقی خاصکر فارسی اور اردو زبان کی ترویج میں زبردست قدم اٹھایا ہے میں اس عظیم الشان مقصد کی تکمیل میں مدیر محترم اور جملہ کارکنان آہنگ کی کامیابی کا متمنی ہوں۔

سفیر کبیر
مشفق کاظمی

سفارت خانہ متحدہ عرب جمہوریہ در ہند نئی دلی

سفارتخانۂ متحدہ عرب جمہوریہ در ہند
امور ثقافت خیابان رتیندن دہلی نو
۸ اوت ۱۹۵۹ء نشان مجاریہ ۹۲/سی

مدیر محترم - مجلہ آہنگ دہلی

جناب والا -

مرقومۂ گرامی مورخ یکم اوت ۱۹۵۹ء وصل گردید ممنون میباشد۔ اُمید دارم کہ بمناسبت سیزدھمی جشن استقلال ہند، برای اشاعتِ خصوصی آہنگ مقالہ ای علمی و ثقافتی، برای انتشار زود تر ارسال خواہم کرد۔ شمارہ آہنگ جولائی ۱۹۵۹ء تا ہنوز موصول نشد۔ مشتاقم۔ اگر زود ترسیل شود، باعثِ تشکر میباشد۔

مخلص شما

دکتور ریاض العتر

سفارتخانہ متحدہ عرب جمہوریہ در ہند
کلچرل بیورو
۹ - ریٹینڈن روڈ۔ نئی دلی
مورخہ ۸ اگست ۱۹۵۹ء نشان مجاریہ سی/۹۲

مدیر محترم ماہنامہ آہنگ دہلی

جناب والا

گرامی نامہ مورخہ یکم اگست ۱۹۵۹ء کے لئے ممنون ہوں اور اُمید کرتا ہوں کہ تیرھویں جشن آزادی پر آپ کی خاص اشاعت کیلئے اپنا مضمون تعلیم ثقافت کے موضوع پر عنقریب ارسال کر دوں گا۔

آہنگ کا جولائی ۱۹۵۹ء کا شمارہ مجھے نہیں ملا۔ اُسے دیکھنے کا اشتیاق ہے جلد بھیجئے مہربانی ہوگی۔

آپ کا مخلص

ڈاکٹر ریاض العتر کلچرل اتاشی

ہز ایکسی لنسی

ڈاکٹر اے۔ اے۔ فیضی سابق سفیر ہند متعینہ مصر،

سابق ممبر یونین پبلک سروس کمیشن حکومت ہند حال وائس چانسلر یونیورسٹی آف جموں و کشمیر سرینگر

معاون ریاست دانشگاہ جموں و کشمیر
سرینگر۔ روز ۷ اوت ۱۹۵۹ میلادی
نشان مجاریہ وی سی/۸/۸/۲۰۳۸

وائس چانسلر یونیورسٹی آف جموں اینڈ کشمیر
سری نگر مورخہ ۷ اگست ۱۹۵۹ء
نشان مجاریہ وی سی/۷/۸/۲۰۳۸

VICE-CHANCELLOR

مدیر محترم مجلۂ آہنگ

با کمال تشکر وصول نامہ مورخ یکم اوت را بدین وسیلہ اعلام میدارم، پیغام ذیل برای مجلۂ آہنگ ارسال میگردد۔

"در قرون وسطی فارسی زبان رسمی ہند بود و تاثیر آن از زبانہای ہندی محو نشدنی است، و نظر باینکہ زبان اردو وجود خود را بیشتر بہ زبان فارسی مدیون است، انتشار مجلہ ای ادبی بزبانہای فارسی و اردو بسیار مناسب بنظر میرسد۔ انتظار میرود علاقمندان زبانہای اردو و فارسی از مجلۂ آہنگ استقبال گرمی نمودہ پیشرفت آنرا آرزو خواہند کرد۔"

مخلص ع۔ ای۔ فیضی

مدیر محترم مجلہ آہنگ

آپ کے مکتوب مورخہ یکم اگست کا شکریہ ادا کرتا ہوں حسب ذیل پیغام برائے اشاعت آہنگ ارسال خدمت ہے۔

"قرون وسطیٰ میں فارسی ہی ہندوستان کی سرکاری زبان تھی فارسی کا ہندوستانی زبانوں پر اتنا اثر پڑا ہے کہ اسے مٹایا نہیں جا سکتا۔ وقت کا یہ ایک بہت بڑا تقاضہ ہے کہ کوئی ادبی پرچہ دونوں زبانوں فارسی اور اردو کیلئے وقف ہو۔ اردو وہ زبان ہے جو زیادہ تر فارسی کے اثر سے عالم وجود میں آئی ہے "آہنگ" اس ضرورت کو پورا کر رہا ہے مجھے امید ہے کہ مذکورہ بالا دو زبانوں میں شغف رکھنے والے جملہ حضرات "آہنگ" کا خیر مقدم کریں گے اور اس کی کامیابی کے متمنی ہوں گے۔"

مخلص۔ اے۔ اے۔ فیضی

وحال صدر مجلس تعلقات عامہ برائے مرکزی علاقہ دہلی

اولڈ سکریٹریٹ دہلی

مورخہ ۱۱ راوت ۱۹۵۹ میلادی

مجلہ آہنگ قریب یکسال ونیم است منتشر میشود این مجلہ ادبی و فرہنگی زبان فارسی است کہ قسمتی از آن بزبان اردو چاپ میشود۔ زبان فارسی تا پایان دورہ مغول زبان رسمی ہند بود بنا بر این نسلی کہ در دوران غائلہ معروف ہند (کہ در سال ۱۸۵۷ بوقوع پیوست) بہ بلوغ رسید آشنائی کاملی با فارسی داشت فارسی تا یک نسل دیگر بقدمت خود باقی ماند۔

جد من در ہنگام غائلہ مزبور پنج سال داشت وی پدرم را نیز فارسی آموخت حتی در قرن جاری من در آغاز تحصیل خود بعد از تشریح الحروف کریما پند نامہ عطار را خواندم البتہ فرزندان من فارسی نمی دانند دو پسر بزرگتر من زبان اردو و عربی در جامعہ ملیہ آموختند ولی فارسی اصلاً نیاموختند دختر و پسر کوچکتر ... در خانوادہ ہای مسلمین نیز ہمین روش ادامہ دارد یعنی دانش آموزانیکہ زبان عربی و قرائت قرآن مجید میاموزند معمولاً فارسی نمی خوانند اگرچہ احتیاج بگفتن نیست کہ زبان اردو از زبان فارسی بیشتر متاثر است تا از زبان عربی و از نظر نژاد زبان فارسی سامی نیست بلکہ آریائی است من خوشوقتم کہ آہنگ برای ترویج و احیاء زبان فارسی ہمت گماشتہ است۔ کامیابی این مجلہ را از ایزد منان خواستارم۔ مجلہ در خور تشویق است

گوپی ناتھ امن

اولڈ سکریٹریٹ دہلی

مورخہ ۱۱ راگست ۱۹۵۹ء

رسالہ "آہنگ" تقریباً ڈیڑھ سال سے جاری ہے۔ یہ فارسی کا ادبی اور ثقافتی رسالہ ہے جس میں کچھ اردو بھی ہوتی ہے فارسی یا مغلوں کے آخری دور تک سرکاری زبان رہی ہے اسی لئے جس نسل نے غدر کے زمانے میں ہوش سنبھالا وہ فارسی سے بہت مانوس تھی اور ایک نسل بعد تک فارسی کا چلن رہا۔

میرے دادا کی عمر غدر کے زمانے میں پانچ سال کی تھی انھوں نے میرے والد کو بھی فارسی پڑھائی یہ تو خیر پچھلی صدی کی بات ہے میری بھی جب تعلیم شروع ہوئی تو "تشریح الحروف" کے بعد کریما پند نامہ عطار ہی پڑھایا گیا۔ میری جو نسل چل رہی ہے یہ فارسی سے محروم ہے یعنی بڑے اور منجھلے لڑکے نے جامعہ ملیہ میں اردو اور عربی تو پڑھی فارسی نہیں پڑھی مسلم گھرانوں میں بھی یہی حال ہے کہ جو بچے قرآن شریف پڑھتے ہیں وہ عام طور پر فارسی سے نابلد ہیں اگرچہ یہ حقیقت محتاج تشریح نہیں کہ اردو پر فارسی کا اثر عربی سے کہیں زیادہ ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ نسلی اعتبار سے فارسی سامی نہیں ہے بلکہ آریائی زبان ہے۔

مجھے خوشی ہے کہ "آہنگ" نے فارسی کے احیاء کیلئے یہ آہنگ کیا ہے خدا کرے اُسے کامیابی ہو۔ پرچہ حوصلہ افزائی کا مستحق ہے۔

گوپی ناتھ امن

بیاد ہند

اثر خامہ جناب آقای دکتر علی اصغر حکمت سابق سفیر کبیر ایران در دہلی

"ساقی حدیثِ سرو و گل و لالہ میرود! — بر نای بلبلان بچمن نالہ میرود"
بادِ بہار سوی بہارات میوزد — دشتِ بہار پُر گہر از ژالہ میرود
از خاکِ اگرہ آتشِ موسیٰ رود بباد — گنگ است آبِ خضر و بنگالہ میرود
گلگون زمین زخونِ جوانانِ راجپوت — بر دشت و بر دمن چمنِ لالہ میرود

خرّم دیارِ ہند ز جمنا و گنگ و سند
"این بحث با ثلاثۂ غسالہ میرود"

"می دہ کہ نو عروسِ چمن حدِ حسن یافت" — زربفت ساری بقدش دستِ مہر بافت
گوئی ز خاکِ ہندُو ابروی دلفریب — ناگاہ زُہرہ با دو ہلال از اُفق بتافت
مشاطۂ وجود بہا زیب و دست بند — خوشتر ز ماہ و مشتریش زیوری نیافت
تا سہرہ بند قامتِ موزونِ او شود — گل پردہ برگرفت و ز خلوت برون شتافت

داماد طبع در طلبِ نو عروسِ ہند
"کار این زمان ز صنعتِ دلّالہ میرود"

"آن چشمِ جادوانہ عابد فریب بین" — در ہند زلفِ او دلِ نا بی شکیب بین
ہندوستان بباغِ جہان نغز گلبنی است — پیرامنش غزلخوانِ صد عندلیب بین
آدم بہشت بر سرِ ہندوستان بہشت — خاکش ز پای او ہمہ پُر عطر و طیب بین
فیضی بجوز اکبر و آئینِ او بخوان — بگشای چشم و مرقدِ اورنگ زیب بین

بنگر بداستانِ دو صد سالہ جادوئی
"کش کاروانِ سحر بدنبالہ میرود"

"شکر شکن شوند ہمہ طوطیانِ ہند" — گر دُور دان ز ایران گر کاروانِ ہند

راز درونِ هند ز بیرونی است فاش　　بو معشر است راهبر و راز دانِ هند

خود روزبه کجاست که پندِ کلیله را　　آرد بنزد اهلِ ادب ارمغانِ هند

علم حساب بین بجهان ز اختراعِ صفر　　پُر گشت بی‌حساب ز دانش جهانِ هند

می آید آن صنم ز بنارس بملک پارس

"چون قند پارسی که به بنگاله میرود"

طی زمان ببین و مکان در طریقِ شعر　　مشکین مشام جان ز ختام رحیق شعر

پُر کن دل از جواهرِ منظوم رامایان　　گاهی انیسِ نثر شود که رفیق شعر

دریاب گفته‌های کالیداس و تولسیداس　　دُرِ خرد بجوی ز بحرِ عمیق شعر

آن پنج شیشه از می چون لعل خسروی است　　یاقوت جان نهاده بجامِ عقیق شعر

ماهِ دو هفته دخترِ نوزادِ طبع ماست

"این طفل یکشبه رهِ یکساله میرود"

از ره مرو ز عشوهٔ دنیا که این عجوز　　خونش بود ز تیغ کرشنا روان هنوز

روی زمین ز عیدِ هُلی گشته پُر حلل　　زان سرخ روی و زرد جبین است دلفروز

از بختِ رام و جشنِ دوالی ببسیطِ خاک　　روشن چو آفتاب و شبِ تار همچو روز

در راهِ عشق چون زنِ هندو قدم گذار　　مردانه جان خویش فدا ساز و تن بسوز

غافل مشو که عالِ مستعمران بشرق

نکاره می نشیند و محتاله میرود

"باد بهشت میوزد از بوستانِ شاه"　　بنگر جمالِ تاجِ محل در فروغ ماه

آرد صبا بساطِ طرب در نشاطِ باغ　　افراشت گل بباغ شلیمار بارگاه

برخوان کتیبه‌های اشوکا که بوده است　　چرخش چو آسمان و زمین عرصهٔ سپاه

بنگر بنقش‌های اجنتا که ایلچیان　　ز ایوانِ خسرو آمده تا پیشگاه شاه

از هجرِ هند خونِ دل از دیده میچکد

"وز ژاله باده در قدح لاله میرود"

چون سامری مباش که زر دید از خری | چون برہمن زگاؤ مکن جوی رہبری
اندر سطور گیتا مرد حکیم خواند | راز نہان اہل جہان زآدم و پری
رمزی زکار خلقت و مرگ حیات تو | شیوا و وشنواست و برہما چو بنگری
دست طلب بگنج پنی شاد و رگ وید | می آوری وگوہر اسرار می بری

ہندوی علم باش کہ از جہل آن جہود
"موسی بہشت و در پی گوساله میرود"

"حافظ ز شوق مجلس سلطان غیاث دین" | روح القدس بشعر ترش خوانده آفرین
آن شاه نامور که زمین لسان غیب | نامش بعز دولت جاوید شد قرین
تا شد غلام خواجۂ شیراز شاه ہند | صیت جلال او ز دکن رفت تا بچین
ایران و ہند راست دو میراث "باستان" | شعر ادیب و رای خرد مند راستین

حکمت زیاد ہند و ز ہجران بتان ہند
"خامش مشو که کار تو از ناله میرود"

خوش باش!

باده نشین، که ملک محمود اینست!
وز چنگ شنو، که لحن داؤد اینست!
از آمده و رفته دگر یاد مکن،
حالی "خوش باش" زانکه مقصود اینست!

دلگیر مشو!

نیکی و بدی، که در نہاد بشر است
شادی و غمی، که در قضاؤ قدر است
با چرخ مکن حواله کاندر ره عقل،
"چرخ از تو ہزار بار بیچاره تر است"

حکیم عمر خیام

ظفر خان احسن

دکتر امیر حسن عابدی
ایم، اے، پی، ایچ، ڈی۔
دلی یونیورسٹی۔ دلی

خواجہ احسن اللہ مخاطب بہ ظفرخان و تخلص بہ احسن پسر خواجہ ابوالحسن تربتی ملقب بہ رکن السلطنت است۔ خواجہ ابوالحسن در روزگار پادشاہی اکبر (۹۶۳ - ۱۰۱۴ = ۱۵۵۶ - ۱۶۰۵) بہ ہند رسید و مورد عنایت آن پادشاہ واقع گردید و در عہد جہانگیر (۱۰۱۴ - ۱۰۳۷ = ۱۶۰۵ - ۱۶۲۷) بمقام رفیع منصب پنجہزاری رسید. در سال ۱۰۳۳ ہجری (۱۶۲۳ - ۱۶۲۴ میلادی) استانداری کابل بخواجہ ابوالحسن واگذار گردید، و ظفرخان بجای پدر خود از آن سال در کابل فرمانروائی کرد۔ صایب (۱) باشتیاق ملاقات وی از ایران بکابل رو بہ یار گشت و در آنجا بخدمت او رسید و چند سال در آنجا بسر برد۔ در سال ۱۰۳۹ ہجری (۱۶۲۹ - ۱۶۳۰ میلادی) ظفرخان از کابل بہند آمد و صایب ہمراہ او بآن سرزمین روانہ گشت۔

خواجہ ابوالحسن در عہد شاہجہان (۱۰۳۷ - ۱۰۶۸ = ۱۶۲۸ - ۱۶۵۸) بمنصب شش ہزار ذات و شش ہزار سوار رسید و در سال ۱۰۴۱ ہجری (۱۶۳۱ - ۱۶۳۲ میلادی) استاندار کشمیر گشت و از طرف وی ظفرخان بکشمیر رفت پس از درگذشت ابوالحسن در سال ۱۰۴۲ ہجری (۱۶۳۳ میلادی) ظفرخان منصب سہ ہزاری دریافت و مستقلاً بمقام استانداری کشمیر نایل شد و تبت را فتح کرد ہنگامیکہ ظفرخان بکشمیر حرکت کرد صایب ہم در بار شاہجہان را ترک نمود و ہمراہ او بآن استان رہسپار شد۔ در سال ۱۰۴۸ ہجری (۱۶۳۸ - ۱۶۳۹ میلادی) ظفرخان از فرمانروائی کشمیر معزول شد و در سال ۱۰۵۱ ہجری (۱۶۳۸ - ۱۶۳۹ میلادی) ظفرخان دوبارہ استاندار کشمیر گشت اما پس از چندی مجدداً از کار برکنار گردید۔

اقامت ظفرخان در کشمیر از نظر شعر و ادب بسیار مؤثر بود، زیرا در این مدت بیشتر شاعران آن زمان پیرامون او گرد آمدہ بودند و در خانۂ او مشاعرہ می کردند و از یکدیگر چیزی میجستند. ظفرخان عادت داشت کہ در مجالس بزم غزلی را باقتراح گذارد و شعرا در آن طبع آزمائی کنند۔ این عادت او باعث رونق شعر و شاعری گردید ہنگامیکہ او از کشمیر حرکت کرد مجلس شعر و ادب نیز برہم خورد، و ہم در این باب است کہ کلیم (۲) افسوس میخورد و می گوید۔

از ظفرخان بود آن صحبت و طرح غزل باکہ دیگر زلف معنی را پریشان میکنیم

در سال ۱۰۶۲ ہجری (۱۶۵۲ - ۱۶۵۲ میلادی) ظفرخان بکومت تتہ منصوب شد اما در سال ۱۰۶۶ ہجری (۱۶۵۵ - ۱۶۵۶ میلادی) بدربار شاہجہان برگشت ظفرخان از طرفداران دارا شکوہ (۱) بودہ و بس در عہد عالمگیر (۱۰۶۸ - ۱۱۱۸ = ۱۶۵۸ - ۱۷۰۷) گوشہ نشینی اختیار نمود۔ اما از دربار شاہی چہل ہزار روپیہ سالیانہ بوی می رسید۔ بالآخرہ در سال ۱۰۷۳ ہجری (۱۶۶۲ - ۱۶۶۳ میلادی) ظفرخان در لاہور درگذشت و در آرامگاہ پدرش مدفون شد۔

ظفرخان در ایام جوانی ہمہ گونہ خوشگذرانی می پرداخت و بہ اوامر و نواہی شرع اعتنائی نمیکرد تا اینکہ شب دوشنبہ بیست و دوم جمادی الاول سال ۱۰۶۳ ہجری (۱۶۵۳ میلادی) حضرت رسول را در خواب دید و بر دست وی توبہ کرد چنانکہ در قطعہ ذیل میگوید۔

ظفرخان خواب دید از بخت بیدار کہ بردست رسول آورد انابت
برای خواب خود تاریخ میجست خرد گفت آگہی بودہ بخوابت"

پس از توبہ بانجام دادن وظایف دینی و خواندن دعاہا

---

(۱) در سال ۱۰۸۱ ہجری (۱۶۷۰ - ۱۶۷۱ میلادی) درگذشتہ است۔

(۲) در سال ۱۰۶۹ ہجری (۱۶۵۹ میلادی) درگذشتہ است۔

متوجه گردید دانشمندان آن روزگار ادعیه و اذکار منقوله از ائمه اطهار را در کتابی بنام "احسن الدعوات"[1] برایش جمع آوری کردند و برای استفادهٔ او در توضیحات سودمند بفارسی بر آن افزودند۔

ظفرخان یکی از مربیان شعر و ادب فارسی بشمار میاید و علت آمدن شعرای ایران خاصه صایب به هند همین توجه او بوده است۔ بسیاری از شاعران در درگاه او بودند و با او آشنائی داشتند، صایب، کلیم، قدسی[2]، غنی[3]، دانش[4]، صیدی[5]، سالک قزوینی از آن جمله اند۔ نیز ظفرخان در اشعار خود شعرای ذیل را تقدیر کرده است۔

بود رخشنده چون خورشید پیدا از نطش ازان از شاعران احسن پسندیدم سلیمی را
میتوانم برابر باب سخن گفت احسن میر معصوم من امروز ز سنجر کم نیست
همچو احسن شعر من از طرز صایب تربیت طبع یاران کی پسند طبع رنگین من است
بشکند دل ز صحبت معصوم صایب احسن گواه حال من است
کو عرفی و کو طالب و کو سنجر احسن در ملک سخن شاعر مشهور نمانده است
بجاست طعنهٔ عرفی بشیخ شد احسن کجا طبیعت طفلانه و کجا زنار

ظفرخان تذکره ای تهیه کرده بود که در آن شعرای همزمانش منتخبات آثار خود را نوشته بودند و بر پشت برگ شعر هر شاعر صورت او کشیده شده بود۔ مؤلف سفینهٔ آن تذکره را دیده بود و صاحب کلمات الشعرا می نویسد "یک ورق که بر او شبیه کلیم بود فقیر دیده"[6] مؤلف شمع انجمن در بارهٔ ظفر مینویسد۔ "افتخارش همین بس است که مثل میرزا صایب مادح آستان اوست"[7] صایب در مدح او می سراید۔

خانخانان را بهرم در رزم صایب دیده ام در سخا و در شجاعت چون ظفرخان تو نیست

---

(۱) نسخهٔ خطی این کتاب در کتابخانهٔ مجلس بشمارهٔ ۸۲۴ موجود است
(۲) در سال ۱۰۵۶ ہجری (۶-۱۶۴۶ میلادی) درگذشته است۔
(۳) در سال ۱۰۷۹ ہجری (۹-۱۶۶۸ میلادی) درگذشته است۔
(۴) در سال ۱۰۷۴ ہجری (۶-۱۶۶۵ میلادی) درگذشته است۔
(۵) در سال ۱۰۶۹ ہجری (۹-۱۶۵۸ میلادی) درگذشته است
(۶) ص ۶۰ (۷) ص ۵۳۰

از ایران صایب شعر ذیل بظفرخان نوشت۔

در هندوستان با احسان یاد کردی گشته ام ورنه هر نخلی بپای خود ثمری افکند

و خان مزبور پنجهزار روپیه برایش فرستاد۔

مؤلفین خزانهٔ عامره و همیشه بهار بجای ظفرخان جعفرخان نوشته اند و صایب را دوست وی میگویند، و شاید این درست نباشد۔

میتوان گفت که در عهد شاهجهان در میان امرای هند بزرگترین حامی شعرا ظفرخان میباشد۔ سراج الدین علی خان[1] آرزو می نویسد "بعد از عبدالرحیم خانخانان مثل او از امرای هند چرخ ربع مسکون نشان نداده اند"[2] او خود شعر میسرود و از صایب استفاده میکرد چنانکه میگوید۔

طرز یاران پیش احسن بعد ازین مقبول نیست تازه گوئیهای او از فیض طبع صایب است

نسخهٔ خطی کلیات احسن (۳۲۹ بانکی پور) دارائی ترجیع بند ساقی نامه (۵۶ بیت) و غزلیات (۳۰۷۶ بیت) رباعیات (۱۵ عدد) و مثنوی (۲ عدد) میباشد۔

ظفرخان در شاعری بر هنر خود فخر میکند۔

از طبع ما بلند بود رتبهٔ سخن معراج شاعران بود اندازه بیت ما
همه صایب پسند شد احسن فکرهایم زبسکه رنگین است
میان اهل سخن لاف میزنم احسن که رتبهٔ سخنم کمتر از فغانی نیست
احسن زبسکه شهرت عالم نورد ما این شعر تازه را بخراسان که میبرد
احسن ز شعر تازه چه از فکر دور دست بازار نظم عرفی و سنجر شکسته

دیوان احسن دارای اشعار خوب است که از لحاظ سادگی و صفائی و روانی قابل توجه است چنانکه از ابیات ذیل معلوم میشود۔

ما و غم هجر تو بهم ساخته بودیم بیجو صلی کرد دل بجگر ما
دیده زلف تو گر بی سر و سامانی ما که چنین گشته پریشان به پریشانی ما
منکه بودم عمرها هم صحبت جام شراب زاهدم گردد ری میخانه چی سازد مرا
در حیرتم که دشمنی کفر و دین چراست از یک چراغ کعبه و بتخانه روشن است

---

(۱) در سال ۱۱۶۹ ہجری (۱۷۵۵ میلادی) درگذشته است۔
(۲) مجمع النفائس ، ۱۷۵

متاعی هنر دار رحمت کجاست محشر تهی دست خواهیم رفت
شرمگین طفل دلربا این است ناز پروردهٔ حیا این است
تا خوانده پاره میکنند آن شوخ نامهٔ ام دردا قسم ازین که بمضمون نمیرسد
دوستی با هرکه ورزیدم بخونم تشنه شد اعتمادی بر وفای مردم دنیا نماند
بود در مستی هم آغوش من آن مه بی حجاب تا سحر گرد کنارم آفتاب افتاده بود
از صباحت منکش بیهوده ای آشفته دل گرگره از زلف بگشاید بکاکل میزند
تا بنا قسم پیش لطفت از تهی دستی خجل درده نقد زندگی جنس گناه آورده ام
گوشه چشمی اگر ساقی بما دادن بجاست عمرها در گوشهٔ میخانه خدمت کرده ام
هرچند جور بیش کنی من وفا کنم شاید که رفته رفته ترا آشنا کنم
زلف مشکین را بعارض تا پریشان کرده صبح را شرمندهٔ شام غریبان کرده

شعر ذیل از انتخابات صایب است ۔
ز خشکم جنگ نی را در خروش آورده است تو به من خون مینا را بجوش آورده است
نیز در بعضی جاها ترکیبات خوب آورده شده است ۔
بطوطی شکر بهان از لاله و گل گفتگو دارم بطوطی شکربان آئینهٔ رخسار میگویم
اما گاه گاهی لغاتی می آورد که با مزاج و نزاکت غزل نمیسازد۔
عالمی آمد آزاد از سنگ سپهر تیشه ارشاد شهادت میکند فرهاد را
شوخ حبشی که جام بجام ابر و داد خواستم بوسه بدستم گل شفتالو داد

یکی از مختصات احسن بکار بردن عناصر هندی استکه در اشعار وی نمایان است و معشوق وی هندی رنگ و هندی نژاد بوده است ۔ چنانکه در اشعار ذیل دیده میشود۔
عشق هندو پسری ساخته سوزان مرا این چه هندوست که از آتش سوزد خاشاک
در فصل زعفران می حمرا غوان خوش است با شوخ سبز چهرهٔ هندوستان خوش است
انصاف هند هند بجز فهم عراقیان محبوب هندو بادهٔ هندوستان خوش است
برهمن زاده رهزن دین است عشق آسان رهزن ولایت نیست
هستمارا سبحه دادن دید او زنار بند صحبت ما گرمی با شوخ هندو می شود
ای عزیزان مثل این پسران گلگون هند خون دی گوید عزیز مصر اگر پیدا شود
از غم سلسلهٔ سبحه ذکر آزادم تا مرا رخصت زنار بت هندو دادی
مجو دیده بر باش ام ام ونیست ام تعلم دلبری چون آن بت هندو بی باشد
تنار وسواد روشن خط بتان هند احسن چه صابیا سوی ایران نمیبرد

از میان مثنویهای احسن یکی مثنوی "جلوهٔ ناز" است که دارای ۶۷۰ بیت و در تعریف کشمیر سروده شده است ۔ امتیاز مثنوی مزبور در آوردن لغات هندی است چنانکه در ابیات ذیل خواهیم دید ۔

ز تنبولی و از بقال و عطار بسر گرم ست در هر کوچه بازار
هندوستان ندارد ماهی سو بت جیوت دل اسیر دزوز
زنی شکل که خیزد دیگر آهنگ ز رشک بانسلی دارد دل تنگ
کمانچه هم ازین حلقه بخته ز تیر طعن سارنگی ست خسته
پکاوج گشت تا به دهلی ساز بتا زا گرم شد هنگامهٔ ناز
ز خوبان چمن تا کام گیرم ز چنپه کهربائی جام گیرم
نهال بوتسری آن زیب گلشن که چو گل میتوان بردن بخرمن
ز گلها کیوره گردید ممتاز درو پیچیده بو چون نغمه در ساز
ز جوش بیل داز جوهی و جاهی نگه میشود کشتی تباهی
شگفته آنچنان گلهای کچنار که گوئی آتش افتاده بگلزار
ز طوطی وز مینا و ز کویل ز هر یک آنکه آهنگش برد دل
ز کمرکت بزم مستان گشت روشن ز شمع او گلستان گشت روشن
بود از پالسه و ز بیر و جامن بگلشن باغبان را چشم روشن
ز کیله چون بتقریبی سر دم بود بر روح افیونی
ز وصف پان کنم رنگین سخن را که نامش میکند خوشبو دهن را
گرفته یک قلم اقلیم دل را جهانگیری مسلم شد کنول را

مثنوی دوم "میخانهٔ راز" که در خدمت زاهدان ریاشعار سرائیده شده و دارای ۵۵۰ بیت می باشد۔ مثنوی مزبور در ظرف شش ماه سروده شده است ۔
بشش ماه این نسخه منظوم گشت بمیخانهٔ راز موسوم گشت

میرزا جلال طباطبائی در نثر دیباچه ساقی نامه (۱۸/ع علیگر) نوشته است که با عبارت ذیل شروع می شود۔
"سرخوشی پیمانه کشان مصطبهٔ عرفان از سرجوش خمکدهٔ حمدنشا بخشی ست که ذوق کیف رسائی شوقش زبان صراحی را از دهان جام بکام رسانیده"
و اضافه می کند۔
"ابو الفضائل ظفر خان احسن .... کاشانه یکتائی .... درین من .... بر طاق بلند نهاده" مؤلف فهرست کتابخانه

کسیکہ سِرِّ نہان است در علن، ہمہ اوست
عروس، و خلوت، و ہم شمعِ انجمن، ہمہ اوست

ز مصحفِ رُخِ خوبان ہمین نمود رقم
کہ خط، و خال، و رخ و زلفِ پُر شکن ہمہ اوست

ز سِرِّ عشق چو واقف شوی یقین دانی
کہ قیس، و لیلیٰ، و شیرین، و کوہکن، ہمہ اوست

نظر بعیب مکن در طیورِ باغِ وجود
کہ طوطیانِ چمن، زاغ، و ہم زغن، ہمہ اوست

شنیدہ ام بصنم خانہ از زبانِ صنم
صنم پرست، و صنم، ہم زبان شکن ہمہ اوست

ز سازِ مطربِ پُر سوز این رسیدہ بگوش
کہ چوب، و تار، و صدائی تننن، تننن ہمہ اوست

شنیدِ من ہمہ صدقلیت، و دیدِ من ہمہ حق،
کہ گوشِ من ہمہ او ہست، چشمِ من ہمہ اوست

چنان ز خویش برون رفتم و درون گشتم
کہ دیدہ، دیدہ، جانم بجان و تن ہمہ اوست

اگر تو دفترِ اسلام و کفر پارہ کنی!
یقین شود بتو کین شیخ و برہمن ہمہ اوست

اگر ز قیدِ تعین برون شوی چو نیاز!
نظر کنی، کہ درین زیرِ پیرہن ہمہ اوست

نیاز نیست، کہ میگوید این کلام ابندم
"قسم بحق" کہ درین وقت در سخن ہمہ اوست

آقای محمود صناعی

آزادی

شرائط و حدود آن

اغلب کسانی که از آزادی سخن گفته اند آن را "نبودن مانع" تعریف کرده اند. بیشتر فلاسفهٔ سیاسی دوران جدید از تامس هابز تا هرلدلسکی این تعریف را پذیرفته اند. هابز فیلسوف قرن هفدهم انگلستان در کتاب "لواتیان" می نویسد۔

"آزادی نبودن مانع است و مقصود من از مانع آن چیز خارجی است که از جنبش جلوگیری کند۔ به این معنی می توان آزادی را در مورد جانداران غیر عاقل و همچنین در مورد موجودات بی جان نیز به کار برد زیرا آن چیز که چنان مقید و در بند باشد که نتواند جز در محیط خاصی حرکت کند که آن محیط خاص را شیئی خارجی به وجود آورده باشد گوییم فاقد آزادی است ..... وقتی مانع جنبش چیزی شیئی خارجی نباشد بلکه مانع در درون آن چیز باشد دیگر نمی گوییم آزادی ندارد بلکه می گوییم قدرت جنبش از او سلب شده است مثل سنگی که در جائی برقرار شده یا مردی که به علت بیماری در بستر افتاده است" به دو مثالی که هابز ذکر کرده است می توان گروهها و اجتماعاتی را نیز افزود که قدرت جنبش از آنها سلب شده است و داعیهٔ آزادی در آنها وجود ندارد و حال آنان نیز مثل حال سنگی است که در گوشه ای برقرار شده یا بیماری که از پا افتاده است۔

جان لاک حکیم دیگر انگلستان در قرن هفدهم که عقاید او در طرز حکومتهای ملی پس از او تاثیر فراوان کرده است در "رسالهٔ دوم در حکومت کشوری[۱]" می گوید:۔

"آزادی انسان در طبیعت آن است که قدرتی بالاتر بر روی زمین بر او فرمانروا نباشد و او تابع اراده و قانون کسان دیگر نباشد و تنها قانون طبیعت بر او حکومت کند۔ آزادی انسان در اجتماع آن است که زیر فرمان هیچ نیروی حاکم و قانونگزاری نباشد مگر آنچه با توافق و رضایت او برقرار شده است و نیز زیر سلطهٔ هیچ اراده و تابع هیچ قانونی نباشد مگر آنچه این نیروی قانونگزار به موجب وکالتی که از او یافته است بیان کرده باشد ....."[۲]

"این آزادی از قدرت مطلق خودسر چنان برای بقای آدمی ضروریست و چنان با آن همبستگی دارد که آدمی نمی تواند آن را از دست بدهد بدون اینکه از حق حفظ حیات خود بگذرد...."[۳]

دربارهٔ اهمیت آزادی، لاک در همان کتاب می نویسد:۔

"هیچ دلیلی ندارم که فرض کنم آن کس که آزادی مرا از من می گیرد وقتی مرا در اختیار خود درآورد هر چیز دیگری که دارم از من نرباید۔ از این رو مشروع است که من با چنین کس همان رفتار را در پیش گیرم که با کسی که خود را با من در وضع جنگ قرار داده است ....."[۴]

هرلدلسکی دانشمند بزرگ زمان ما در کتاب "آزادی

۱ـ Second Treatise of Civil Government

۲ـ قطعه ۲۲　　۳ـ قطعه ۲۳　　۴ـ قطعه ۱۸

در دولت امروز[1] می نویسد.

«منظور من از آزادی نبودن مانع برای آن اوضاع و شرائط اجتماعیست که وجود آنها در تمدن امروز لازمهٔ خوش بختی فرد است.»

مطابق تعریف لسکی وجود هر مانعی موجب سلب آزادی نیست چنانکه مثلاً وجود قواعد معقول و مقبولی که حرکت اتومبیلها را از دست راست خیابان اجباری می کند مخل آزادی نیست زیرا وجود هرج و مرج در رانندگی از آن "اوضاع و شرائط اجتماعی" نیست که لازمهٔ خوش بختی فرد باشد. بلکه برعکس هرج و مرج مخل خوش بختی فرد است و وجود نظم و قاعده از این لحاظ به خوش بختی همه کمک می کند. اما مثلاً اگر در جامعه مقرراتی وجود داشته باشد که مانع شود مرد و زنی که یکدیگر را دوست دارند به علت اختلاف رنگ پوست یا اختلاف عقیدهٔ دینی باهم زناشوئی کنند گوئیم در آن اجتماع بر آن "اوضاع و شرائطی که وجود آن لازمهٔ خوش بختی فرد است" قید و بند وجود دارد و آن جامعه آزادی نیست. همچنین است حال معلمی که نتواند آنچه معتقد است در دانشگاه تدریس کند به علت آن که اعتقاد او مورد قبول فرمانروایان اجتماع یا پیشوایان دینی نیست مثل معلم علم حیات شناسی که در جامعهٔ کاتولیک نتواند نظریه داروین را تدریس کند. نبودن مانع برای بیان عقاید لازمهٔ خوش بختی معلمی است که از شرافت شغل خود آگاه است و اگر از جانب دین یا دولت مانعی در راه او باشد آزادی او سلب شده و به خوش بختی او لطمه خورده است

مشاهدات و تجربه های روانشناسان نشان داده است که آدمی فطرةً طالب آزادی است و هر آنچه آزادی او را محدود کند موجب درد و رنج اوست. واتسن[2] امریکائی پیشوای مکتب "رفتاریان" با تجربه های دقیق خود نشان داده است یکی از چیزهای معدودی که موجب درد و رنج و وحشت کودک می شود آنست که از جنبش آزاد دست و پای او جلوگیری کنند.

می توان گفت آزادی نبودن مانع در راه نمو و تکامل و تجلی شخصیت آدمیست. بدین صورت آزادی که هر چند منفیست شرط اساسی تحقق همه چیزهائیست که نزد ما ارزش دارند. نمو قوای آدمی و تکامل و تجلی شخصیت او همانست که از لحاظ دیگر حیات می خوانیم. پس در حقیقت آزادی همان زنده بودن است از لحاظ اخلاقی آزادی شرط اساسی تحقق سعادت در فرد و اجتماع است. حتی راجع به جانداران دیگر می توان گفت سعادت آنها در آنست که آزادی داشته باشند تا به کمال خود برسند و چیزی مانع نمو و تکامل و "تجلی طبیعی شخصیت خود" محروم مانده و به "کمال درختی" خود نرسیده زیرا آزادی نداشته است.

آزادی شرط ضروری سعادت فرد و اجتماع است اما نباید تصور کرد در آزادترین اوضاع همهٔ افراد یکسان نمو می کنند. مسلم است در آزادترین اوضاع همهٔ افراد فردوسی و بتهوون و رامبرانت نمی شوند زیرا همه استعداد یکسان ندارند ولی همه به کمالی که استعداد آن را دارند می رسند و جای خوش وقتی است که نمو همهٔ افراد در یک جهت نیست و در یک جهت هم همه استعداد یکسان ندارند چه از تنوع استعدادها تنوع کارها و تخصص وظائف پدید می آید و رنگارنگی تمدن نتیجه می شود. آزادی مقدس است چون افراد متنوع هستند و همه را در یک قالب نمی توان ریخت و ریختن همه در یک قالب نابود کردن شخصیت آنهاست ولی همچنان درست است که بگوئیم باید آزادی باشد تا افراد فرصت

[1] Liberty in the Modern State.

[2] G. B. Watson

دوخته باشند متمتع شوند و استعدادهای خود را بروز دهند و زندگی برای
همه لطف و لذتش پیدا کند. از این رو آزادی شرط اساسی
پیشرفت تمدن و فرهنگ است. اگر همهٔ افراد را به زور در یک
قالب بریزیم و آزادی نمو در جهات مختلف را از آنها بگیریم
نتیجه پژمرده شدن فردیت و تباه شدن استقلال شخصیت و قالبی
شدن فکر و سخن و انحطاط فرهنگ است. گناه اساسی دستگاه
تربیتی جدید ما این است که چنین بوده است و انحطاط اجتماعی که شاهد
آنیم نتیجهٔ مستقیم نقایص دستگاه تربیتی ما است.

بعضی پنداشته اند آزادی و قانون با هم ناسازگارند چه
قانون چیزی جز قید و بند بر آزادی نیست. در میان متفکران
قدیم رواقیان این مشکل را چنین حل کرده اند. قانون واقعی
فرمان طبیعت است و بیان خواهشهای واقعی ما و بنا بر
این نه تنها قانون قید و بند خارجی بر آزادی ما نیست بلکه حافظ
و ضامن آن است. گفتهٔ رواقیان را می توان در روزگار
ما چنین تعبیر کرد. اگر افراد در ساختن قانون و اجرای آن
دخالت مؤثر داشته باشند و قانون بیان ارادهٔ اکثریت
مردمان باشد نه تنها مخل آزادی آنها نیست بلکه حافظ و ضامن
آنست. در هرج و مرج هیچ کس آزاد نیست و نظمی که به
ارادهٔ اشخاص ایجاد شده باشد مخل آزادی آنان نیست بلکه
تأمین کنندهٔ آزادیست. آنجا که قانون نیست هر کس دستخوش
هوی و هوس دیگران است و هیچ کس آزاد نیست. با بودن
قانون همه در حدود قانون آزادند. بنابراین لازمهٔ آزادی
وجود قانونست که مبتنی بر ارادهٔ مردمان باشد یعنی لازمهٔ
آزادی حکومت ملی است و می دانیم رکن اصلی حکومت
ملی دخالت واقعی و مؤثر مردم در وضع و اجرای قانون است
می توان گفت قانون [illegible] مشروط است که آزادی
دیگران بر آزادی [illegible] دیگر تنها محدود و بنا مشروط می
بر آزادی ما وجود دارد و آزادی ما مشروط به افراد دیگر است :

ممکن است کسی به شنیدن اذان از رادیو علاقهٔ فراوان
داشته باشد و البته آزاد است که اذان را با رادیو بلند
کند. اما همسایهٔ او ممکن است بخواهد در همان وقت به موزیک
[illegible] گوش بدهد بنا بر این او حق ندارد صدای رادیو را چنان
بلند کند که به آزادی وی در تعقیب آنچه به او خوشی می دهد
لطمه زند و مزاحم او شود.

مهم ترین موانع آزادی افراد دو گروه بوده اند. یکی کسانی
که به زور شمشیر مردمان را در بند کرده اند. طاعت این دسته
را تخت مردمان از ترس جان گردن نهاده اند تا آنکه عادت
نیروی پرسش و مقاومت را از آنها سلب کرده است. دستهٔ
دوم کسانی هستند که از وحشت مردمان از مجهول و آنچه پس از
این جهان خواهد آمد استفاده کرده اند و کردار مردمان را به میل
خود گردانیده اند. ستمکاری این دسته شاید از ستم اهل شمشیر
برای تمدن آدمی کمتر ناگوار نبوده است زیرا قدرت صاحب
شمشیر گذرنده است و آنگاه تیز که برقرار است سطحیست و در
اعماق وجود کسان رخنه نمی کند. اما ستم آنان که روح آدمی را
در بند کرده اند پایدار است و اثر آن عمیق و وسیع است
اگر گفتهٔ "بندتو کروچه" حکیم ایتالیائی زمان ما درست باشد
سیر تاریخ به سوی آزادیست باید گفت از وسائلی که افراد برای
تأمین آزادی خود یافته اند هنوز بیش از معدودی از اجتماعات
بهره مند نیستند. از مهم ترین این وسائل یکی حکومت ملی دموکراسی
است. با ایجاد حکومت ملی معدودی از ملل موفق شده اند
جان و مال و آزادی خود را از اینکه پیوسته در معرض ارادهٔ
خودسر متغیر و نامعلوم فرد یا افراد فرمانروا باشد ایمن دارند.

اما دولی که به این حد از تکامل رسیده و توانسته اند اساس
زندگی خود را بر رضا و رغبت مردمان و دستور عقل بگذارند هنوز

ماند و هنوز توده های عظیم مردم همچنان گرفتار ستمکاران سیاسی خود باقی مانده اند. چون گفتیم حال اکثر دول چنین است ذکر مثال لزومی ندارد.

دانشمندانی که حکومت ملی را تکمیل کرده اند وجود قانون اساسی را که در آن حقوق اساسی افراد تصریح و تضمین شده باشد ضروری دانسته اند. قوای مملکت را از هم منقسم خوا[illegible] هیچکس قدرت برین را در دست نداشته باشد و راه ستمگری بسته شود. اما وجود قانون اساسی و انفصال قوا راه را بر ستمگری نتوانست [illegible] چنانکه جمهوری آلمان تا آمدن هیتلر در ۱۹۳۳ بر اصولی عالی دمکراسی بنا شده بود و از طرف دیگر کشوری مثل انگلستان که قانون اساسی مدون ندارد و انفصال قوا هم چنانکه "منتسکیو" به خطا پنداشته بود در آن کشور وجود نه دارد از لحاظ آزادی افراد در صف اول ملل متمدن جای دارد.

آنچه حافظ واقعی آزادی و حکومت ملی است نخست آنست که مردمان بدانند آزادی چیست دوم آن که از جان و دل خواهان آن باشند و سوم آنکه همت و شجاعت داشته باشند تا به دفاع از آزادی و حفظ آن برخیزند. مدافع واقعی آزادی پاسبانی دائم و شجاعت مردمان است اگر این دو صفت در قومی نباشد عالیترین قانونهای اساسی نوشته بی ارزشی بیش نیست مثل اسکناس است که اعتبار آن سلب شده باشد.

از شرائط دیگر تحقق آزادی آنست که مردمان حاضر باشند بی آشوب و جدال با بردباری و انصاف بدون توسل به حربه های مادی از قبیل اسید و چاقو یا حربه های معنوی از قبیل دشنام و بهتان و افترا دور هم جمع شوند و سخنان یک دیگر را بشنوند و نیک و بد را از هم تمیز دهند و آنچه اکثریت بدان توافق کنند به صورت قانون مقدس و مقبول بپذیرند.

مقدمهٔ ایجاد چنین وضع تربیت ملیست. منظورم از تربیت ملی صرفاً آموختن خواندن و نوشتن نیست زیرا با قدرت خواندن آنچه در این کشور روزنامه ها و هفته نامه ها در دسترس ما می گزارند معلوم نیست حال افراد بهتر از آن شود که در حال بی سوادی بود و به اغلب احتمال بدتر خواهد شد. از تربیت ملی منظورم تربیت افراد برای همزیستی برای شناختن و قدر دانستن آزادی برای پی بردن به حقوق خود و برای آموختن احترام به حقوق همسایه، برای تنفر از ظلم و چاپلوسی و عشق به انصاف و عدالت است. این نوع تربیت اجتماعی و سیاسی که پایهٔ حکومت دمکراسی است و بدون آن حکومت ملی مبدل به حکومت اراذل و اوباش می گردد. ذره ای از این نوع تربیت را تاکنون دستگاه رسمی تربیت ملی ما به ما نداده است و اکنون زمان آن رسیده که پیشوایان تربیت ما به خویش آیند و به این وظیفهٔ مهم که اگر انجام نگیرد ملت ما هیچگاه قادر به اداره کردن خود نخواهد بود، بپردازند.

از مسائل مهم مربوط به آزادی یکی رابطهٔ آزادی و مساوات است. به نظر می رسد که آزادی و مساوات لازم و ملزوم یک دیگرند و آزادی بدون مساوات امکان پذیر نیست. به قول "جاستیس هومز" قاضی عالیمقام امریکایی "جای آزادی در بستن قرارداد هست که آنجا در قدرت معامله مساوات باشد" منظور آنست که مثلاً کارگری که برای نان شب محتاج است همان آزادی را در عقد قرارداد یا فسخ آن ندارد که کارفرمای او که با لفظی می تواند او را از هستی ساقط کند. از [illegible] که در مقابل دستگاه عدالت ایستاده اند اغلب حق بدان جانب می رسد که از خود بهتر دفاع کند. دفاع بهتر تناسب با پولی دارد که دادخواه می تواند برای [illegible] کردن وکیل [illegible] کند پس در حقیقت با آنکه اسماً همه در مقابل قانون مساویند

غیر و حقی مساوی نیستند یا به قول جرج اورول[3] نویسندهٔ شوخ «همه مساویند اما بعضی مساوی ترند».

از انواع آزادی افراد آزادی اجتماعات است. اجتماع مردم برای هر منظوری خواه به صورت انجمن علمی باشد یا به صورت اتحادیهٔ کارگری یا به صورت حزب سیاسی باید آزاد باشد زیرا بدون آزادی اجتماعات تحقق حکومت ملی ممکن نیست. در ممالک پیشرو مغرب زمین شاید مهم ترین حافظ دموکراسی اتحادیه های کارگری است. و شاید مهم ترین حربه ای که برای حفظ و دفاع از آزادی در دست آنان هست حق اعتصاب است که به وسیلهٔ آن هیأت متشکل افراد می توانند در سیاست روز دولت اعمال نفوذ مؤثر و فوری کنند.

یکی از مهمترین آزادیها آزادی اندیشه و بیان است. البته آزادی مسکن و مصونیت جان مردان از ستم و سایر آزادیها نیز اهمیت بسیار دارد اما هیچیک مانند آزادی اندیشه و بیان نیستند که در نسلها آینده نیز تأثیر داشته باشند. آنجا که این آزادی موجود نباشد می توان گفت بشر هنوز در دوران تاریک تاریخ زندگی می کند. موضوع اندیشه و بیان ما هر چه که باشد مادام که به دیگران آسیب آنی و محسوس نرساند باید دلیلی برای منع آن موجود نباشد.

نباید از یاد برد که هیچیک از ما مصون از خطا نیست و بنابر این هر چند عقیده ای با آنچه ما معتقدیم مخالف باشد حق نداریم به زور آن را خاموش کنیم چه همیشه این احتمال هست که از عقیدهٔ ما به حقیقت نزدیک تر باشد یا لااقل سهم قابل توجهی از حقیقت داشته باشد. مگر تعلیمات سقراط و عیسی و محمد و کپرنیک و گالیله در دوران خود به مخالفت مردان را برنینگیخت؟ اگر عقیدهٔ مردم زمان حق می داشت نوآورندگان را خاموش کند می بایست ما امروز از تعلیمات آن بزرگان محروم مانده باشیم و در نتیجه تمدن معنوی بشر قدمی پیش نرفته باشد. از کجا که عقیده مخالفی که ما امروز به خاموش کردن آن برمی خیزیم عقیده ای نباشد که آیندگان با همان احترام بدان بنگرند که ما امروز به تعلیمات عیسی و سقراط می نگریم؟ مجازات کردن دیگران به جرم عقیده ای که [illegible] دارند نه تنها جنایت نسبت بدانهاست جنایت نسبت [illegible] بشر است و جنایت به فرزندان آیندهٔ آدمیان است زیرا ممکن است عقیده ای که با تعصب خاموشش می کنیم عقیدهٔ گالیله یا داروین و دیگری باشد و عقیده ای باشد که بشر را از تاریکی جهل نجات دهد و راه نوی در تمدن او باز کند. آنانکه سقراط را جام زهر نوشاندند و عیسی را بر دار کردند صمیمانه معتقد بودند که کافر و دشمن اجتماعی را تباه می کنند. ما امروز گناه بزرگ آنان را جهالت و نخوت می دانیم که خود را مصون از خطا می پنداشتند و حقیقت مطلق آن را می دانستند که خود بدان معتقد بودند.

از متفرعات آزادی بیان، آزادی نوشته ها و مطبوعات است. اهمیت مطبوعات آزاد در ملل دموکراسی به حدیست که می توان آن را یکی از قوای کشوری و در ردیف قوهٔ قانونگزاری و اجرائی و قضائی به شمار آورد. همچنان که استقلال قوهٔ قضائی از ارکان حکومت ملیست استقلال مطبوعات نیز چنین است. اگر مطبوعات آزاد نباشند و مزدور دولت باشند دولت می تواند هر سیاستی را که بخواهد بر مردم تحمیل کند و اذهان عموم را نسبت به وقایع مهم ملی و بین المللی تاریک نگهدارد یا به قسمی که خود می خواهد اذهان عموم را با دروغ انباشته کند. آنکس که ذهن مردمان را در تصرف خود در آورد جان و مال و آزادی آنها را در اختیار خود در آورده است. در رابطهٔ بین اخبار درست و آزادی گفتنی

بسیار هست. شاید کسی که بهتر از همه در این باره گفتگو کرده است والتر لیپمن نویسندهٔ معروف امریکائی باشد[۱]

ستمگری چنانکه با آن آشنا بوده ایم اغلب ستمگری اقلیت بر اکثریت بوده است اما ستمگری اکثریت بر اقلیت نیز همچنان ناروا و وحشت انگیز است. فراموش نباید کرد [illegible]ی که روح بشر را از زندان خرافات رهائی بخشیده و تاریکی جهل را شکافته اند همیشه در آغاز در اقلیت بوده اند. اگر اکثریت حق داشته باشد هر نغمهٔ ناسازی را خاموش کند تمدن آدمی رو به خاموشی خواهد رفت. اگر اکثریت حق داشته باشد راه و رسم و عادات و آداب خود را بر اقلیت تحمیل کند و اجازهٔ انحراف و بدعت و ابتکار به هیچکس ندهد تمدن بشر از کهنگی و یکنواختی خواهد مرد. معنی حقیقی آزادی امکان تجلی شخصیت افراد است و جلوه های رنگارنگ تمدن جز جلوه های شخصیت افرادی که آن تمدن را ساخته اند چیز دیگر نیست. بنابراین قید و بند از هر نوع که باشد مخل نمو و تکامل شخصیت افراد است.

هیچکس حق ندارد خود را قیم و سرپرست افراد بالغ و عاقل دیگر بداند. با هیچ دلیل و بهانه ای ستمگری یکی را بر دیگری یا بر دیگران توجیه نمی توان کرد. آنکه خود را بهتر و برتر از دیگران می داند معلوم نیست از بسیاری جهات به کمک و رهبری و راهنمائی دیگران محتاج نباشد. دربارهٔ بهترین نوع حکومت چیزهای بسیار گفته اند. چه خوب بود اگر خداوند خود از آسمان فرود می آمد و به ادارهٔ مردمان می پرداخت ولی چون چنین چیزی غیر ممکن است هیچ فردی حق ندارد خود را نایب خدا در روی زمین بشمارد. چون چنین است از آزادی و حکومت ملی چاره نیست و اساس حکومت ملی چنانکه گفتم و تکرار می کنم وجود حالت واقعی و موثر مردم در سرنوشت سیاسی و اجتماعی خویشتن است.

التماس همیشگی ما باید آن باشد که آزادی ما از دستبرد ستمگران محفوظ بماند و دیگران نیز از ستمکاری ما ایمن باشند. اولی را با خواستن تنها نه دست نتوان آورد ولی این که دیگران از دست دیو ستمگری که در نهاد ماست ایمن بمانند دعائیست که اگر با خلوص نیت همراه باشد و از دل برخیزد ممکنست مستجاب گردد و اگر دعای همه اجابت پذیرد آزادی همه ایمن خواهد ماند.

محمود صناعی (سخن)

غزل

ابوالقاسم لاهوتی

عاشقم، عاشق بروینت، گر نمیدانی، بدان
سوختم در آرزوینت، گر نمیدانی، بدان
با همه زنجیر و بند و حیله و مکر رقیب
خواهم آمد من بکوینت، گر نمیدانی، بدان
مشنو از بدگو سخن، من سست پیمان نیستم
هستم اندر جستجوینت، گر نمیدانی، بدان
اینکه دل جای دگر غیر از سر کوینت نرفت
بسته آن از تار مویت، گر نمیدانی، بدان
گر رقیب از غم بمیرد، یا حسد کورش کند
بوسه خواهد زد بروینت، گر نمیدانی، بدان
هیچ میدانی که این لاهوتی آواره کیست
بندهٔ روی نکوینت، گر نمی[illegible]

---

[۱] Liberty and the News کتاب از walter Lippman

افشائے راز

(راز الہ مظفرنگری)

دیدم بہ گلشن عشوہ طرازی ، محشر خرامی، دامن درازی
در رنگ مستی میخانہ سازی ، وز سحر گفتن عیسےٰ نوازی
زُلفش چون سُنبل آہو شکاری ، چشمش بہ مستی نرگس طرازی
ہستی فروزی مستی فروشی، ، از روی رنگین از چشم نازی
آہو بدامش از صحنِ کعبہ، ، پیدا از زُلفش طغیانِ نازی
لُطفش برای ناکام اُلفت، ، قسمت طرازی تدبیر سازی
پہلوی غم را تسکین مطلق، ، وز لُطف پیہم بندہ نوازی
برہم کن آخر از حسن برہم ، صوم و صلوٰۃ بانگ و نمازی
از دست زہرہ، بربط گرفتی ، وقتیکہ بودی نغمہ طرازی!
کونین رقصید از نغمۂ او! ، خود را فگندم بر پائی نازی،
رُوحم بہ نغمہ، نغمہ بروحم ، وہ وہ چہ سوزی وہ وہ چہ سازی

کلک الم را باید شکستن
افشا نباید در شعر "رازی"

اسکلت (۱)

رابندرانات تاگور

ترجمه عبدالله توکل

در اطاقی واقع در جوار خوابگاه، دورهٔ کودکی ما اسکلتی آویزان بود. شب ها، استخوانهای آن براثر باد خفیفی که می آمد بهم می خورد و ترق و ترق براه می افتاد و روزها، خوشمان می آمد که استخوانهای آن را بهم بزنیم، آن روزها زمانی بود که یکی از دانشجویان دانشکدهٔ طب کمپل مطالبی از استخوانشناسی بما تعلیم می داد زیرا سرپرست ما قصد داشت علوم جهانی را در مغز ما رسوخ دهد، آیا تا چه حد در این زمینه توفیق یافت ؟ نیازی نیست این مطلب را به آشنایان خود و به آنانکه ما را می شناسند بگوئیم والبته بهتر این است که از بیان این مطلب به آنانکه ما را نمی شناسند خودداری کنیم.

اکنون سالها از آن زمان گذشته و در عرض این مدت اسکلت از اطاق ناپدید شده است، همچنانکه استخوانشناسی از حافظهٔ ما رفته و کمترین اثری از خود بجائی نگذاشته است.

اخیراً مهمانان بیشماری به خانهٔ ما آمده بودند و من ناگزیر شدم که شب را در آن اطاق سابق به روز آورم. در این اقامتگاه که دیگر به نظر من آشنا نبود خواب به چشمانم راه نمی یافت، هر دم از این پهلو بآن پهلو می غلطیدم و زنگ ساعت کلیسا گذشت ساعتهای شب را یکی پس از دیگری اعلام می کرد. نور چراغ اطاق دقیقه ای چند لرزید و پس از آن خاموش گشت، و چون خانوادهٔ من اخیراً دو سه تن از اعضای خود را از کف داده بود طبعاً تاریکی اطاق فکر مرا متوجه مرگ ساخت. باخود می گفتم: در صحنهٔ بزرگ طبیعت، آیا نور چراغی که در ظلمت جاودانی از میان می رود، چراغ عمر زود گذر ما را که در هر ساعتی از روز یا شب خاموش می گردد بیاد نمی آورد ؟

براثر تداعی معانی تصویر اسکلت در خاطرهٔ من زنده شد، درحالیکه می کوشیدم بدنی را که پوشش این اسکلت بوده است در نظر خود مجسم سازم، ناگهان چنین بنظرم آمد که موجودی در اطراف تختخوابم پرسه می زند و کورمال کورمال در کنار دیوارها را می رود و نفس بریده بریدهٔ او را احساس می کردم. چنین بنظرم می آمد که در جستجوی چیز ناپیدائی باین سو و آن سو می رود و هر دم بر سرعت قدم خود می افزاید. مسلماً گول خورده بودم: موجودی که بنظرم در اطاق راه می رفت مخلوق مغز پرهیجان و بیخواب من بود و من ضربان رگهای خود را به منزلهٔ صدای پای او پنداشته بودم و با اینهمه وحشتی که چون وحشت مرگ سرد و یخزده بود بر سراسر وجودم دست یافت و برای آنکه این اوهام را از خود دور سازم بصدای بلند فریاد زدم. "کیست ؟" چنین بنظرم آمد که مهمان ناخوانده در پای تخت خواب من توقف کرد و صدای چنین جواب داد -

"منم . . . . برای دیدن اسکلت خود آمده ام !"

بی شبهه ترس و بیم در مقابل چیزی که مخلوق سادهٔ خیال من بود، حماقت و سفاهت بود. بجای آنکه بکار دیگری دست بزنم خود را بیشتر از پیش به بالش فشردم و با لحن بی اعتنائی فریاد زدم:

"عجب کار مسخره ای! در این وقت شب پیش گرفته ای ! مگر این اسکلت به چه کار تو می خورد ؟"

گوئی جواب این سوال از پشه بند برمی خاست:

"چه سوالی ! استخوانهای این اسکلت قلب مرا در میان گرفته است این استخوانها شاهد لطف و ملاحت ایام جوانی من بوده . . . . وقتی که بیست و شش سال بیشتر نداشتم ! چگونه می توانم از آرزوی دیدار اسکلت خود چشم بپوشم ؟

جواب دادم:

آرزوی کاملاً مشروعی است پس به تجسس و تحقیق خود ادامه بدهید من هم کوشش می کنم که خوابم ببرد.

دوباره صدا برخاست:

بنا خیال می کنم شما تنها هستید. میل دارم لحظه ای بنشینم و با شما صحبت کنم. سی و پنج سال پیش از این در [illegible]

در عرض این سی و چند سال جز ناله و زاری کاری نداشته ام. بسیار خوشنود خواهم بود که بار دیگر مثل ایام گذشته با مردی صحبت کنم ؛

احساس کردم موجودی در کنار پرده های تخت خوابم نشست، ناگزیر از در تسلیم بر آمدم و در منتهای ظرافت و محبت گفتم ؛

بسیار ممنون خواهم بود ! بیا با هم بکوشیم و موضوع مسرت آوری برای گفتگوی خود پیدا کنیم.

من موضوعی خوش مزه تر و شیرین تر از سرگذشت خود نمی بینم اجازه می دهید که سرگذشتم را حکایت کنیم ؟

زنگ ساعت کلیسا دو ساعت پس از نیمه شب را اعلام کرد.

در آن زمان که جوان بودم و در دیار زندگان اقامت داشتم موجودی مرا مثل مرگ دست خوش وحشت می ساخت. و آن شوهر من بود حال ماهی بیچاره ای را داشتم که گرفتار قلاب ماهی گیری شده باشد گفتی بیگانه ای مرا با تیز ترین قلابها گرفته بود و قصد داشت مرا از سعادت و آسایش که در ایام کودکی در کانون زندگی خود داشتم محروم سازد.

شوهرم دو ماه پس از ازدواجمان درگذشت، در حالیکه پدر و مادر و دوستانم بر سرنوشت من می گریستند. در آن زمان بود که پدر شوهرم پس از دقت در صورت من به مادر شوهرم گفت: "مگر نمی بینید که این دختر چشم بد دارد ؟" بسیار خوب، بحرفهای من گوش می دهید ؟ امیدوارم که سرگذشت من بنظرتان جالب باشد ؟

جواب دادم ؛

بسیار بسیار جالب است. ابتدای سرگذشت خالی از تفنن نیست ؛

پس اگر چنین است بقیه داستان را می گویم. در منتهای مسرت بخانه پدری باز گشتم. اگر چه اطرافیانم کوشش می کردند که زیبائی من در پرده بماند خود می دانستم که زیبائی بی نظیر و درخشانی دارم، عقیدهٔ شما چیست ؟

زیر لب زمزمه کردم ؛

بسیار محتمل است. اما فراموش نکنید که هرگز شما را ندیده ام.

هرگز مرا ندیده اید ؟ و اسکلت مرا چه می کنید ؟ ها ! ها !!

اهمیت ندارد شوخی می کردم. چطور شما را وادار به قبول این حقیقت سازم که این دو حفرهٔ بی گوشت درخشان ترین و خمارترین چشمان عالم را در بر داشت ؟ و لبخندی که این لبان گلگون را روشن می ساخت سر سوزنی به خندهٔ تشنج آمیز اسکلت من شباهت نداشت ؟ یادآوری لطف و ملاحت اندام خودم در بحبوحهٔ جوانی که چون گلی روی این استخوانها شگفته بود، اکنون مرا به خنده می آورد و با اینهمه از تصور آن رنج می برم، سرشناسترین اطباء روزگار جوانی من هرگز گمان نمی بردند که استخوانهای چنان بدن زیبائی بتعلیم استخوان شناسی اختصاص یابد!

آیا می دانید که یکی از پزشکان جوان مرا به گل زرینی تشبیه می کرد ؟ و منظورش این بود که بنظر وی وجود بقیه افراد بشر جهت اکثر در فیزیولوژی قابل استفاده می توانست باشد در صورتیکه مرا گل زیبائی می شمرد، آیا این مطلب در تصور کسی می گنجد که گل زیبا نیز اسکلتی داشته باشد ؟

در موقع راه رفتن احساس می کردم که امواج موزونی از کوچکترین حرکات من بیرون می جهد. درست مانند الماسی که لمعان و تلألو آن چشم را خیره می سازد. ساعتهای درازی از وقت خود را صرف تماشای دستهایم می کردم، دستهائی که ممکن بود چالاک ترین مردان را در منتهای لطف - بزنجیر بکشند.

اما این اسکلت پیر و فرسوده مثل شاهد دروغ گوئی حقیقت را از نظر شما پنهان ساخته است و من این اقتدار را ندارم که شهادت بیشرمانه او را تکذیب و رد کنم. و از اینرو شما را بیشتر از دیگران دشمن می دارم. احساس می کنم که میل دارم با یادآوری تصویر گلگون و زندهٔ زیبائی خود تا ابد خواب از چشمان شما بربایم و درسی را که شما درباره استخوانشناسی خوانده اید از مغزتان بیرون ریزم.

فریاد زدم ؛

هرگاه بدن زیبای شما وجود می داشت می توانستم به آن قسم بخورم که کمترین اثری از استخوانشناسی در مغز من بجای نمانده است و روح من اکنون فریفتهٔ تصویر درخشانی است که در این شب تاریک چون گوهری می درخشد. دیگر بیشتر از این نمی توانم چیزی بگویم صدا ایش دوباره برخاست.

همسر و یاری نداشتم، بیگانه برادر من تصمیم گرفته بود که ازدواج نکند، من در کنیسه تنها بودم. عادت کرده بودم که در باغ، در سایه درختان دراز بکشم. گمان می بردم که تمام عالم مرا می پرستد ستارگان آسمان که هرگز به خواب نمی روند. از فروغ زیبائی من سرمستند

تصور می کردم که نسیم از برخورد به صورت من آه می کشد و چمن در زیر پای من از حال می رود. همه جوانان دنیا بنظرم چون گیاهی می آمدند که به پای من افتاده اند اما نمی دانم چرا دلم غمگین و محزون بود.

وقتی که «شکر» دوست برادر من از دانشکدهٔ طب بیرون آمد طبیب خانوادهٔ ما شد. من او را چندین بار از پشت پرده ای که در آنجا پنهان می شدم دیده بودم. بنظرم مرد عجیبی بود که در بند شناختن دنیای خارج نبود. گمان می برد که دنیا مثل بیابانی است و بتدریج چندان از دنیا دوری گزید که به گوشه ای تاریک پناه برد. از این جهت «شکر» یگانه جوانی بود که من فرصت ملاقات وی را بدست آوردم. در بارگاه عشق من که از خیال پرستندگان و عاشقان پر بود من در گردش های شبانه ام آن را در نظر خود مجسم می ساختم هر جوانی که به پای من می افتاد، بصورت «شکر» در می آمد گوش می دهید؟ عقیدهٔ تان درباره سرگذشت من چیست ؟

کمی صبر کنید. ابتدا و آخر سرگذشت مرا بشنوید، روزی که باران می آمد، تب داشتم، دکتر بعیادت من آمد. این نخستین برخورد ما بود روبسوی پنجره در رختخواب غنوده بودم و پرتو خورشید غروب سفیدی رنگ رخسارم را تعدیل می کرد وقتی که دکتر به روی من نگریست من خود را بجای او گذاشتم در عالم خیال به روی خود نگریستم در نور خورشید شامگاهی صورت خود را مثل گل پژمرده ای روی بالش سفید و نرم افسرده و رنگ پریده دیدم. طره های گیسویم دیوانه وار بر پیشانیم افتاده بود و چشمهایم که از حجب و حیا به زیر بود سایه گویایی بر تمام صورتم می انداخت.

دکتر با کمرویی و صدای آهسته از برادرم پرسید.

آیا می توانم نبضش را بگیرم ؟

مچ گرد دست خود را از زیر لحاف بیرون آوردم و در حینی که به تماشای آن می پرداختم، به خود گفتم «چرا این مچ به بازوبند لاجورد عروسی آراسته نیست ؟» هرگز دکتری ندیده بودم که با این ناپختگی نبض کسی را گرفته باشد، انگشتان دکتر از برخورد با بدن من می لرزید او شدت تب مرا اندازه می گرفت و من ضربان قلب وی را می شمردم نمی فهمیدم چه می گویم ؟

گفتم :

بآسانی می فهمم. ضربان قلب مان افکار مان را نشان می دهد.

پس از ناخوشیهای گوناگون و آنهمه شفایافتن ها دیدم که شمارهٔ پرستندگان بارگاه خیالی عشقم رو به کاهش می رود و نبودی از آنهمه عاشق و دلداده ای که داشتم جز یکی نماند، و عاقبت دنیای کوچک من منحصر بیک دکتر و یک بیمار شد.

بمناسبت پذیرائیهائی که داشتم عادت کرده بودم که «ساری» زرد رنگی بپوشم تاجی سفید از گل یاسمن برگیسوی خود بزنم سپس آئینه ای در دست به زیر درختان رفته و در جائی که همیشه دراز می کشیدم بنشینم.

مسلماً فکر می کنید که تماشای زیبائی خودمان زننده و خسته کننده می شود ؟ اما چنین نبود، زیرا که من به چشم خود در خود نمی نگریستم من در عین حال یک نفر و دو نفر بودم. خود را مثل اینکه بجای دکتر بودم معاینه می کردم. از تماشای خود مسحور می گشتم و عشق در دلم طغیان می کرد. اما با وجود دقت و توجهی که به خود مبذول می داشتم آه های قلبم را فرا می گرفت و چون نسیم شامگاه ناله سر می داد.

با اینهمه از آن زمان دیگر خود را تنها نپنداشتم. در اثنای گردشهای خود به بازی انگشتان پایم روی چمنها می نگریستم و از خود می پرسیدم که اگر دکتر حاضر می بود، از دیدن این بازی چه فکر می کرد ؟ خورشید نیمروز را در نظر خود مجسم می ساختم در صورتیکه جز صدای دور دست کرکسی هیچ چیز سکوت را برهم نمی زد. از پشت دیوارهای باغ صدای فروشندهٔ دوره گردی بر می خاست :

«حلقه های فروشی ! انگشتریهائی بلوری !»

پارچه ای چون برف سفید به روی چمن می انداختم سرم را به بازوی خود تکیه داده روی آن دراز می کشیدم. و با بیقیدی حساب شده ای

بازوی دیگرم را به منتهای لطف و ظرافت روی پارچهٔ نرم دراز می‌کردم
و گمان می‌بردم که عاشق دلخسته‌ای ناظر وضع دلربای دستش است
و تصور می‌کردم که وی دست مرا در دستهای خود گرفته است و بر کف
انگشت گون دستم بوسه می‌دهد و آهسته دور می‌شود. آیا میل دارید که
سرگذشت خود را در اینجا نیمه تمام بگذارم؟ عقیده تان در این باره چیست؟
با حالی اندیشناک جواب دادم.
اگر پایان سرگذشت شما همین باشد چیز قابل قبولی است البته
تا طوری که تصویر کرده اید ناتمام خواهد بود اما من بقیهٔ شب را به آسانی
صرف تکمیل آن خواهم کرد.
اما در آن صورت بسیار خشن و ناساز خواهد بود و چطور می‌توان
خنده‌ای به آن در آمیخت؟ چگونه باید اسکلت را به خندهٔ تشنج آمیز
خود وا داشت؟
پس اجازه بدهید بقیهٔ سرگذشت خود را بگویم. همینکه دکتر عدهٔ
کمی ارباب رجوع دست و پا کرد اطاقی در طبقهٔ پایین خانهٔ ما گرفت و
آن را به صورت مطب خود در آورد. در آن زمان من دربارهٔ تأثیر
دوا و زهرها پرسشهایی از او می‌کردم تا بدانم که چه مقداری از هر دوا
ممکن است انسان را بکشد. موضوع موافق طبع وی بود و با فصاحت
تمام دربارهٔ آن حرف می‌زد. در نتیجهٔ این حرفها و این گفتگوها من با فکر
مرگ آشنا شدم و با این ترتیب مرگ و عشق یگانه مسائل دنیای باطن من شد
سرگذشت من اکنون به پایان می‌رسد ما به قسمت آخر آن رسیده ایم.
زیر لب گفتم:
شب هم به آخر می‌رسد.
پس از مدتی پی بردم که دکتر دستخوش اضطراب عجیبی است
چنین به نظر می‌آمد که از چیزی خجالت می‌کشد و آن را از من پنهان می‌دارد
روزی که لباس شیکی پوشیده بود. به نزد ما آمد و از برادرم خواست
که اتومبیل خود را برای آن شب در اختیارش بگذارد. گرفتار کنجکاوی
شدیدی بودم و در صدد بر آمدم که موضوع را از برادرم بپرسم پس

از آنکه از این و از آن در حرف زدم عاقبت از وی پرسیدم:
راستی، برادر، دکتر امشب با اتومبیل شما به کجا می‌رود؟
برادرم مختصرم جواب داد:
به سوی مرگ!
اصرار کردم:
ترا بخدا قسم می‌دهم بگو ببینم واقعاً کجا می‌خواهد برود!
برادرم با لحن مرموزی جواب داد:
می‌خواهد زن بگیرد:
قهقهه‌ای سر دادم و فریاد زدم:
واقعاً؟
بزودی شنیدم که نامزد دکتر دختر خانوادهٔ ثروتمندی است
و ثروت گزافی برای دکتر خواهد آورد. ولی چرا نقشهٔ خود را کتمان کرده
و بدین وسیله بمن اهانت کرده است! مگر من هرگز از وی خواهش
کرده بودم، یا حتی از وی خواسته بودم که ازدواج نکند و دل مرا بشکند
مردها ذره‌ای قابل اعتماد نیستند. من در عمر خود جز با یک مرد آشنا
نشده بودم و در یک لحظه به این حقیقت پی برده بودم.
وقتی دکتر از کار خود بازگشت و آمادهٔ حرکت شد قهقهه زنان
باز گفتم:
بسیار خوب، دکتر، پس امشب عروسی می‌کنید؟
از مشاهدهٔ خندهٔ من، گذشته از اینکه دست و پای خود را گم کرد
بشدت آزرده گشت.
گفتم:
پس چرا ارکستری نمی‌بینم:
آهی کشید و گفت:
مگر ازدواج حادثهٔ خوشی است؟
نتوانستم از خنده خودداری کنم. گفتم:
نه، نه محال است، مگر ازدواج بی چراغ و بی موسیقی هم ممکن

چندان مزاحم برادر خود شدم که عاقبت دستور داد بساط
عروسی پرخاطره و نشاطی به راه افتد. با خنده و خوشی درباره عروسی
حوادثی که در پیش بود و درباره رفتار خود در قبال تازه واردین حرفها
زدم، و از دکتر پرسیدم:

— آیا باز هم نبض خواهید گرفت؟" ها! ها! ... ها! اگرچه
نمی توان از هیجان روحی مرد باخبر داشت می توانم بگویم که حرفهای من
قلب دکتر را چون تیری می شکافت:

قرار بود که عروسی پاسی از شب رفته صورت گیرد. پیش از عزیمت
دکتر و برادرم برحسب عادت گیلاسی شراب در تراس خوردند. ماه طلوع
کرده بود.

لبخندزنان گفتم.

آیا عروسی تان را فراموش نکرده اید؟ وقت رفتن است:

اینجا باید توضیح مختصری بدهم. در این ضمن، من به مطب دکتر
شتافته و گردی از آنجا برداشته بودم تا پنهانی در گیلاس دکتر بریزم.

دکتر گیلاس خود را به یک جرعه سرکشید سپس با صدای پرهیجان
و با نگاهی که تا اعماق قلب من رسوخ کرد، گفت:

می روم.

موسیقی شروع شد. به اطاق خود بازگشتم. لباس عروسی زربفت
خود را پوشیدم، جواهر و زیورهای خود را از صندوقچه درآوردم و خود را
آراستم و آن علامت سرخ را که بر سر عروس می گذارند بر سر خود گذاشتم
رختخواب خود را زیر درختان باغ آماده ساختم.

شب زیبایی بود، باد ملایم جنوب خستگی دنیا را از میان می برد
بوی یاسمن باغ را پر از نشاط و مسرت می ساخت:

صدای ارکستر رفته رفته فرو می نشست، نور ماه به وضع نامحسوسی
رنگ پریده تر می گشت و دنیا و تصویر کانون خانوادگی که در سراسر عمر در دلها
جای دارد مانند توهمی از نظرم ناپدید می شد. آنوقت چشمان خود را
بستم و لبخندی زدم.

تصور می کردم آنانکه بزودی به خانه ما خواهند آمد نقشی را که چون قطره
ای شراب بر لبان من مانده است خواهند دید و من آهسته آهسته
با همان لبخند درخشان به حجله جاودانی خود پای خواهم نهاد.

افسوس! افسوس بر حجله عروسی من! افسوس بر آن پیراهن زربفته
وقتی که به صدای ترق و تروق استخوانها که گوئی از وجودم بر می خاست
بیدار گشتم خود را در مقابل سه بچه دیدم که سر اسکلت من درس استخوان
شناسی یاد می گرفتند. در سینه ای که مرکز شادیها و غمهای من بود
گلبرگهای جوانیم یکی پس از دیگری در آن شکفته بود، معلم استخوانها را
یکایک با انگشت خود نشان می داد. آیا کمترین اثری از آن
واپسین لبخند من بنظر نمی رسید؟

بسیار خوب: سرگذشت من بنظرتان چطور بود؟

جواب دادم:

بسیار دلپسند بود.

در این هنگام صدای قارقار نخستین کلاغ برخاست.

پرسیدم.

اینجا هستید؟

هیچکس جوابی نداد.

روشنائی صبح به اطاق من راه یافت. (سخن)

ای بیخبران شکل مجسم هیچ است!
وین طارم نه سپهر ارقم هیچ است
خوش باش که در نشیمن کون و فساد
وابسته یک دمیم و آنهم هیچ است

کلامِ گویا

سترہویں صدی میں گویا غزنی میں پیدا ہوئے یہ گورو
گوبند سنگھ جی کے دربار کے صوفی شاعر تھے ۵۲ عالم
اس وقت گورو دربار میں ادب کے ارتقا میں کوشاں تھے
گویا بھی اسی لڑی میں منسلک تھے، گویا کے مجموعہ کا نام گورو
گوبند سنگھ جی نے خود "زندگی نامہ" رکھا تھا۔ اسی مجموعہ کا ترجمہ
انگریزی میں اسن نیاز مند نے کر لیا ہے جسے انگلستان میں طبع
کرایا جا رہا ہے۔

بابا پی۔ ایل۔ بیدی

دین و دُنیا در کمندِ این پری رخسارِ ما
ہر دو عالم قیمتِ یک تارِ موی یارِ ما

ما نمی آریم تابِ غمزۂ مستانہ او
یک نگاہِ جانفزائیش بس بود در کارِ ما

گاہ صوفی گاہ زاہد گہ قلندر میشود
رنگ ہای مختلف دارد بتِ عیارِ ما

قدرِ لعلِ او بجز عاشق نداند ہیچ کس
قیمتِ یاقوت داند چشمِ گوہر بارِ ما

ہر نفس گویا بیادِ نرگسِ مخمورِ او
بادہ ہای شوق می نوشد دلِ ہشیارِ ما

بقلم محصل سروش

کتیبه ایکه یکهزار سال قبل بزبان عربی و سنسکرت نوشته شده

آیا مسلمانان در سنه ۲۴۳ ه وزیرستان را فتح کرده بودند

آثار باقیه و نوشتهای دوسه قرن اول اسلامی، در آسیای وسطی نهایت قلیل است و هم ازین رو تاریخ همین دو قرن خیلی پوشیده و مجهول و غیر مفصل است، اگر روایات مورخین و سیاحین عربی در دست نبودی، یقیناً حصه بزرگ معلومات تاریخی این دو قرن بر ما پوشیده ماندی، زیرا آثار، و آبدات دورهٔ اول ورود عرب و طلوع نیر اسلام درین سرزمین خیلی نایاب اند، و کتیبه های این دو قرن نیز خیلی کمتر اند۔

اگر به میوزیم کابل و پشاور و لاهور نگاهی اندازید، می بینید که هزاران اثر صنعتی و تهذیبی دورهٔ قبل از اسلام، از گندهارا و اراضی پشاور تا کابل و بامیان کشف گردیده و تاریخ تهذیب گریکو بودیک که ثقافت مشترک این سرزمین بود۔ در نهایت روشنی است، مصنوعات و مجسمه ها و کتیبه ها بخطوط خروشتی، برهمی، سارد او ناگری، و یونانی و مغولی خیلی زیاد بدست آمده که مدنیت دورهٔ قبل از اسلام را خیلی روشن می سازند۔ ولی کتیبه ای که از اوائل ورود عرب درسرزمین خراسان و سواحل سند و کوهسار قبایل افغانی خبر دهد، بزبان عربی یا پهلوی یا پارسی یا پشتو تاکنون بدست نیامده و یک کتیبهٔ ای که بزبان عربی اندرین سرزمین پیدا شده، مربوط است به قرن سوم هجری که در خراسان صفاریان سیستان حکم میراندند، و بر سند تا ملتان هم خاندان هباری عربی نژاد حکمران بودند که بقول ابن خلدون در حدود (۲۴۰ ه) بر سند تا منصوره که پایهٔ تخت آن دیار بود قابض شدند، وطوریکه ابن حوقل گوید: در بانیه (اما بقرار حدود العالم بابلی) که بفاصله چند میلی جنوب منصوره واقع بود سکونت می کردند، و بنام خلیفه بغداد خطبه می خواندند؛ عمر بن عبدالعزیز هباری و عبدالله پسر او و عمر بن عبدالله را از روایات فتوح البلدان و حدود العالم و عجائب الهند بزرگ بن شهریار و ابن خلدون، و ابن اثیر مورخین زبان عربی می شناسیم، و تاریخ این عهد خیلی تاریک و مبهم است۔

کتیبه ایکه ازین عهد بما رسیده تاکنون منحصر بفرد و خیلی هم مغتنم است، زیرا از اوایل ورود عرب و مسلمانان، دیگر کتیبه تاکنون کشف نشده و همین چند سطر یکه بر یک سنگ نوشته اند، خیلی بر معلومات مورخین می افزاید، و از مطالعهٔ آن نتائج خوبی را در تاریخ اوایل دورهٔ عرب بدست آورده می توانیم

این کتیبه عبارت از ۹ سطر و (۴۲) کلمهٔ عربی است بخطی که جو کتو اسرائیل ولفنسون آن را در تاریخ لغات سامی رسم الخط عربی قدیم می داند و گوید که از رسم الخط نبطی متاخر بهم آمده است و مردم آنرا کوفی گویند و قدیم ترین کتیبه این نوع خط در حران جبل دروز بر سنگی بالای دروازهٔ کلیسائی بزبان عربی و یونانی کشف گردیده و متعلق است بسال (۵۶۸) بعد المیلاد، که هم خط این کتیبه در برخی از خصایص، با خط فرامین حضور نبوی که محفوظه

وثائق سیاسیه دکتور حمید الله طبع قاهره نشر شده مشابهت دارد.

تمام پایه آرخیولوجستها و ملستان شناسان گویند، تا کنون اقدم کتیبه تاریخ دار عربی دورهٔ اسلامی در مصر به سنگی کشف شده، که قبر یکی از حجازیان بنام عبدالله بن جبر بود، و در سنه (۳۱ هـ) نوشته شده، در میوزیم مصر موجود است و کتیبهٔ اقدم دیگر در قبهٔ صخرهٔ بیت المقدس به سال (۷۲ هـ) نوشته شده، که به عقیده اسرائیل ولفنسون در تاریخ زبانهای سامی، این دو کتیبه در رسم الخط با کتیبه حران نزدیکی دارد، و من هم برخی از مشکلات کتیبه مورد بحث خود را از روی کتیبه (۳۱ هـ) با مشابهت تام حروف حل کردم، اگرچه بین کتیبه ما و کتیبهٔ مصر فاصلهٔ زمانی دو قرن موجود است، و فاصلهٔ مکانی نیز خیلی بعید است، ولی خط کتیبه ما صورت مهذب شدهٔ همان خط اوایل دورهٔ اسلامی است

در پائین خط عربی کتیبهٔ ما، ۵ سطر به رسم الخط (SARADA) و ناگری (NAGRI) است، و سطح سنگ ۱۲×۲۴ است که ۳×۹ آن عربی و ۹×۶ آن سنسکرت است و چندین سال قبل مستر پیر (PEAR) آنرا در وادی توچی وزیرستان شمالی یافته بود.

مضمون کتیبهٔ تاریخ بنای یک مأمنی است که: در ماه جمادی الاول سال (۲۴۳ هـ) مطابق (۸۵۷ م) بنا شده، و الفاظ آن بار اول در مجلهٔ (EPIGRAPHICA-INDIA) بابت ۱۹۲۶ء بصورت بسیار ناقص خوانده شده، ولی بعدا جناب استاد محمد شفیع لاهوری در مجلهٔ اورینتل کالج بابت اگست ۱۹۴۷ء آنرا قدری کامل تر خوانده و نشر نمود. اما در هر دو قرائت نواقصی باقی مانده که من آنرا طوریکه من خوانده ام ذیلاً بیان می‌کنم: استاد محمد شفیع چنین خوانده بود: هذا امر عقد بناء... بن عمار تقبل الله منه صالح عمله و غفر له سوء عمله و قد کتب یوم الجمعه ثلث عشره ..... خلون من جمادی الاول سنه ثلثة و اربعین و مائتین، صلی الله علی محمد و آل محمد الطا...

من تمام کتیبه را از روی موازنه و مقایسه با خطوط قدیمه و اشکال حروف در رسم الخط عربی قدیم و نسبلی بعد از ملاحظه نمونه های خطوط عربی، در نقش زبد و نقش حران و کتیبهٔ مصر از روی تاریخ در لغات سامی، و فرامین نبوی در کتاب وثایق سیاسیه اسلامی صفحه ۵۶، و کذلک از روی نمونه های خطوط قدیمه دورهٔ سامانی و غزنوی در کتب خانه مولانا فضل صمدانی پشاور و دیگر کتب قدیمهٔ قرن دوم و سوم و چهارم هجری که در کتب خانه های یورپ و آسیا موجودند چنین خوانده ام:

سطر (۱) هذا مأمن غمره ذا (۲) الهیلاج قمی (؟) بن عمار (۳) تقبل الله منه صالح عمله (۴) و غفر له سوء عمله قد (؟) (۵) کتب یوم الجمعه لثلثه (۶) عشرة خلون من جمادی (۷) الاولی سنه ثلثه اربعین (۸) و مائتین صلی الله علی محمد (۹) و آل محمد الطاهر (ین ؟)

در خواندن کلمات فوق فقط کلمات (مأمن) (غمره) و (ذو الهیلاج قمی) و (لثلثه) مبهم و مورد اختلاف است، در خواندن دیگر کلمات اختلافی نیست، کلمهٔ مأمن که سابقاً امر خوانده شده، در اصل واضح است، و نقطهٔ نون هم موجود است فقط اشتباه در ینجاست که (مأمن) را اکنون به میم و همزه نویسیم و در اصل بدو الف (ما امن) است که در رسم الخط قدیم گاهی چنین نوشته اند. اما (غمره) خیلی روشن است (عقد بناءه) نه معنی دارد، و نه شکل کلمه چنین است. اما اسم بانی این مأمن را سابقه نخوانده اند فقط نام پدرش (عمار) واضح بود، من نام بانی را ذالهیلاج یا دانا یا دانا لیلاج تخمین می‌کنم (ولی تا شاهد خارجی دیگر در همین بنا نشود المبنا به صحت کی از این سه حکم کرد) و کلمهٔ بعد از آن که ابه نسبتی است (قمی یا فمی) ... تخمین

کہ قمی منسوب باشد به شهر (قم) ایران، و قمی به شهر قمه که بقول مؤلف نامعلوم حدود العالم شهر کوچکی بود، از ناحیت هند، و مؤلف مذکور آن را در ردیف قندهار و بابی سابق الذکر، یاد کرده است۔

اما اسم ذالهیلاج در اعلام تاریخی گاهی بنظر می آید و هیلاج اصطلاحی است نجومی که البیرونی در کتاب التفهیم لاوایل صناعة التنجیم آنرا شرح می دهد و الخوارزمی در مفاتیح العلوم آنرا فارسی دانسته، که معنی آن زوج و کدخدا و رب البیت باشد، و اهل نجوم آنرا دلیل کیت عمر مولود دانند۔

ولی درینجا اعتراضی وارد می شود بر کلمهٔ (ذا) که اصل آن (ذو) است، و باصطلاح گرامر عربی یکی از اسماء خمسه است، که درحالت رفع باید ذوالهیلاج باشد، نه طوریکه در کتیبه ذالهیلاج آمده۔ این اعتراض از نقطهٔ نظر گرامر عربی درست است ولی از نظر باستان شناسی و خط شناسی قیمتی ندارد، زیرا طوریکه دکتور حمید الله در کتاب وثایق سیاسیه شرح می دهد، این کیتاگوری اسما از قبیل ابوالحارث و ابی طالب و ابوالعنبر وغیره است که در قرون اولیهٔ اسلامی در اکثر کتیبه ها بدون رعایت احوال ثلاثهٔ اعراب نوشته می شدند، چنانچه در جنوب جبل سلع مدینهٔ منوره کتیبهٔ حضرت علی رض موجود است که در آنجا نوشته: "انا علی ابن ابوطالب" بجای صورت صحیح گرامری آن انا علی بن ابی طالب، و شاید در کتیبه زیربحث ما هم ذوالهیلاج درحالت رفع بمنصوب ذالهیلاج نوشته شده باشد که قیاس است بر کتیبه های اوایل دورهٔ اسلامی در زبان عربی۔

همچنان در اصل کتیبهٔ بعد از (ذا) لام بصورت مشکوک از (هیلاج) جدا نوشته شده که بقرار اصول خط باید یکجا می بود ولی در کتیبه ای کهنه گاهی (ل) را از مابعد خود جدا نیز می نوشتند چنانچه در کتیبه سنه ۱۳۱ مصر کلمات (لعبدالله) را جدا (ل عبدالله)

نوشته اند (رجوع شود به صفحه ۲۰۳ تاریخ لغات سامی) اما اگر را نالیلاج یا دانالیلاج خوانده شود، رانا لقبی بود به معنی سردار و شهزاده که از عصور قبل الاسلام تا ۶ قرن بعد از اسلام درین نشره موجود بود و از طبقات ناصری ثابت می آید و هم سیفی هروی در تاریخ هرات رانا کنجر را نام برد، که در عصر آل کورت یکی از سرداران افغانی بود۔ ولی دانا کلمهٔ معروف فارسی است، که شاید برائے تعریف مقام دانش بانی بکار رفته باشد اما لیلاج نام یکنفر پهلوان داستانی دورهٔ باستان است که درین افغانان قندهار تاکنون مانند رستم، مظهر دانش و زور و قوت افسانوی شمرده شود، جهانگیر هاشمی هروی متوفی ۹۴۶ھ گوید:

هرکه درین دام مسخر شود۔ گر لیلاج بود رخ شود (مظهر الآثار ص ۳۰)

اما در پنج سطر سنسکرت که قرار نوشته موزیم پشاور (SARADA) وناگریست، چنین نوشته اند "اوم (سلام) در روز دوم ماه تاریکا (نصف شب) در ماه کرتیکا سال ۲۴۳ سستر ایوا" اکنون بعد از شرح اصل کتیبه و کلمات و رسم الخط آن میرویم تا به نتایج تاریخی آن اشاره کنیم:

۱۔ اگرچه حملهای قشون عرب بر سند از طرف جنوب شروع شده، و در خلافت حضرت عثمان عربها از راه سیستان و مکران وسند تاختند، ولی بعدا در سنه ۴۴ھ بقول البلاذری مهلب بن ابی صفره از راه کابل و خیبر بر پشاور تاخته و جنوبا تا قم (گندا وی کنونی) و قیقان (قلات) جنگها نمودند، اما کابل و پشاور و اراضی قبایل افغانی همواره در دست مسلمانان نماندند، و بارها درین اراضی ارتداد و بغاوت بعمل آمد۔ برزابل و کابل و پشاور، خاندان کابل شاهان سلطنت کردند، و بقول گردیزی و عوفی تا سنه (۲۵۸ھ) یعقوب صفاری کابل را گرفت، و پایه تخت کابل شاهان از آنجا گردیز و بعداً به ویهند (هند کنار دریای سند ۳۰ میل شمال

انتقال کرد، و طوریکه سابقاً یاد آور شدیم بهمدرین اوقات، خاندان هباری بر ملتان حکومت می کردند، پس عصریکه دران کتیبهٔ مورد بحث ما نوشته شده، یعنی (۲۴۳ ه) عصری بود که بقایای مدنیت قدیم درین سرزمین موجود بود ولی با نفوذ زبان و کلچر عربی هم آن قدر غالب شده بود، که کتیبهٔ مذکور را بدو رسم الخط و در زبان سنسکرت و عربی نوشتند.

واین اوقات را ما دورهٔ اختلاط مدنیتین آریائی و عرب می دانیم، که همین کلتور کنونی ما از همین اوقات به نشو و نما پرداخته و مبادی آن نهاده شده است.

۲ - از رسم الخط ساردا (SARADA) دناگری و اینکه کتیبهٔ مورد بحث ما بای لینگول (BILINGUAL) است، بخوبی برمی آید: که مراسم قدیم درهمین عصر بکلی از بین نه رفته و هنوز آداب و رسم الخط و حساب سال و ماه با اصول زبان سنسکریت مروج بود.

۳ - بانی مامن و نویسندهٔ کتیبه شخصی بنظر می آید، که مخلوق همین خلط و امتزاج مدنیتین آریائی و عرب است، اصلاً عربی مشرب است ولی پیدا وار این محیط، اگر زعم من راجع به کلمهٔ فمی منسوب به فمه درست باشد باید گفت: که محل التقای دو ثقافت و دو کلچر، همین سرزمین بین غزنه و لهاور بود.

۴ - از ادعیهٔ اسلامی و صلوة و سلام بر حضرت محمد و آل وی ظاهر است، که آداب اسلامی و رسوم این دین مقدس، در حدود (۲۴۳ ه) پوره درین سرزمین نضج گرفته و مروج شده بود.

۵ - چنین بنظر می آید: که راههای جبال بین دریای سند و غزنه، برای مسافرین و رهگذاران مورد خطر بود، و در راه برای حفظ امنیت و آرام قوافل گذرندگان، در هر جا چنین (مامن) ها را می ساختند و کلمهٔ (المامن) وضعیت اداری و امنیت و نظر راه گذرمان را بخوبی می رساند، چه جای امن این معنی می دهد که در تمام آن راههای طویل و جبال خوفناک، مراکز امنیت همین جایها محفوظ بودند.

۶ - می دانیم که راههای دره های جنوبی سپین غر (کوه سپید) تا راههای گومل همواره از طرف غزنی رهگذر قوافل تاجران و کوچیان بوده است . . . که از وادی توچی و وزیرستان بسواحل دریای سند می گذشتند، و چنین مامن ها و پناه گاهها را هم درهمین راهها می ساختند، تا رهگذران در امان باشند و جائیکه کتیبهٔ مورد بحث ما دران پیدا شده، نیز وادی توچی است.

۷ - در دو قرن اخیر رفت و آمد مردم از راه جبال وزیرستان مشکل بود، ولی ازین کتیبه که مامنی را دران جبال ساخته اند، چنین پدید می گردد که: در آن عصر با رفت و آمد امکان داشت به و چنانچه بعدا در عصر غزنویان و غوریان نیز همین راهها مورد استفاده مردم و عبور و مرور شاهان و بازرگانان بود که از تاریخ بیهقی و گردیزی و یمینی و طبقات ناصری وغیره توان دریافت، از همه نتایجیکه در استدلال تاریخی ازین کتیبه گرفتیم مهم تر اینست: که گویا مردم وزیرستان و دره توچی درین عصر مسلمان شده بودند، زیرا اگر مسلمان نبودندی، بنای یک شخص مسلمان و عربی مشرب درین سرزمین نیز امکان نیافتی. چون در متون تواریخ، اسلام افغانان را به سبکتگین و سلطان محمود نسبت می دهند، چنانچه العتبی و مولف نامعلوم حدود العالم در سال (۳۷۲ ه) و دیگر مورخان باین مقصد اشارها دارند، از روی این کتیبه باید گفت: که اهالی اینجا باید قبلاً بنشر و نفوذ اسلام رسیده، و با عربها نیز مخلوط شده باشند، زیرا در حدود (۲۴۳ ه) بنای شخص مسلمانی با کتیبهٔ عربی، در قلب جبال قبایل افغانی، یعنی وادی توچی صورت گرفته است. و این چیز در حالت کفر و جاهلیت مردم آنجا مشکل بنظر می آید. و هم معقول نیست، که این سنگ را بوزن یک تا دو تون از جای دیگر آورده و در وادی توچی انداخته باشند.

(بقیه بر صفحه ۳۸)

داستان

تشخیص مرض

نگاهی (سرخی)

شوکت تهانوی

دو سه نفر دکتور را در معالجه کردند، یکنفر حکیم نیز اورا دید، ولی هیچ یک مرض خانم را فهمیده نتوانست، مشورت با طبیب هم نتیجه ای نداد. خودم نمی توانستم باور نمایم که خانم صحیح وسالم بوده وهیچگونه بیماری ندارد، بلکه از راه بهانه جوئی ادعای مریضی را می کند وبظاهر خود را پژمرده ساخته است. زیرا اگر ناخوشی خانم نمایشکارانه یا از راه تصنع بودی، ویا از روی تفریح چنین کردی، آن جاذبیت وشگفته روئی که او پیشتر داشت، روز بروز از وجودش مفقود ومبدل به تجرد وپندی وبیزاری نمی شد. طبع نازکش اکثر زود رنجی مآل می شود. خودم در تردد م که آیا این تحول بی موقع در طبع خانم اضطراریست یا اختیاری؟

گاهی بچه ها مایی موجب میزنند وگاهی بیک امر جزئی آماده به جنگ می شود. اگر برای تفریح وهوا خوری دعوتش کنم قهرش می آید، وحرکات مجنونانه از وسر میزند. دید ووادید دوستان خود را نیز بکلی ترک گفته است قبل ازین وابستگی او با دوستانش بحدی بود که خودم از آن بجان رسیده بودم همواره چنین می گفتم که "یا اله العالمین! یا مرا ازین جهان بردار، یا دوستهایش را از روی زمین گم کن، که دایما به جانش چسپیده اند ویک لحظه اورا نمی گذارند" وفقط برای اجابت این دعا به نماز راندن، هم شروع کرده بودم. حالا کیفیت مزاجی من دارد [illegible] است وبجای گفتن دعای بد، آرزو های نیک در حق ایشان دارم وبلا [illegible] قلب دعا می کنم که یا "مقلب القلوب! دل خانم را به دوستانش بگردان تا طبع نازکش با من حسب سابق سازگار گردد!" البته که همین دعا های من تاثیری بخشیده باشد، که دو سه نفر زن خوشبختانه بتازگی جهت ملاقاتش وارد شده اند!!

یاری خانم با دوستانش در یک اطاق صحبت می کرد وخودم در یک اطاق دیگر مصروف مطالعه بودم از هم هوی آنها وصدا های اختلاط ایشان امروز حس کردم که خانه من سر از نو انوار زندگی درخشیده، روح نو در آن دمیده است.

آنها باب شکوه وشکایت را باز کردند، ویک سلسله سخنان نامربوط بین آنها رد وبدل شد! اگر یکیش قصه عروسی بچه خود را می کرد، دیگرش شکایت بی مروتی همسایه خود را بیان کرده بود! آواز های صیاهوی شان بگوش می رسید که خانم بآواز طربناک لفظ "اسنو" را بزبان خود آورده پرسان کرد "در کجا یافت می شود؟ من در تمام مغازه ها گشتم اما اثری از او ندیدم"

خانم جمیلی: در بازار به هر مغازه پیدا نمی شود. من از آن مغازه دار خریده بودم که بعض اشیا را بغرض احتکار پنهان است. لاکن خواهرم! خیلی گران خریده ام.

خانم [illegible]: بلی ورسیش! اگر گران هم پیدا شود غنیمت است [illegible]

نمائید. باور کو، که خیلی آنرا دوست دارم. این قطّی بود در رامی
ملی؟ چند آنکه پالیدم دستیاب نشد.

زنی دیگر: باز کجا یافتید؟

خانم: (یک آه عمیق کشیده) از کجا می یافتم؟ این
قطّی خالیست که نشانت دادم. در جستجوی آن
هستم. اگر به قیمت دو چند و سه چند هم بدست بیاید
میگیرم.

خانم جمیل: در بگیرد این اسباب آرائشی خارجه، این
"لب سرین" را به بین، تمام بازار را گشتم اما در
در هیچ مغازه نیافتم یک مغازه دار، خدا می داند
از کجا پیدائش کرد، به هزار منت و زاری به قیمت
سه چند بمن داد. از ترس این که دوباره عقب
آن سرگردان نشوم نیم درجن آنرا خریده ام

خانم: (با آواز افسرده) خودم هم خواهرم در همان کشتی
سوار هستم؛ برای یک شی جزوی چندین
روز در بازار میگردم. آخر پس کدام کدام چیز سر
خود را بشکنانم! اگر رنگ ناخن را به بینید وجود
ندارد، اگر کریم را بپالید از روی زمین گم شده
است، لب سرین هم بکلی ناپدید گشته، از هر
طرف نومیدی و مایوسی ما را فرا گرفته است!
اکنون که باین سامان آرایش عادت گرفته ایم
چگونه میتوانیم دفعتاً از آن دست برداریم و بجای
آن کریم دیگری را استعمال کنیم؟

خانم جمیل: قاه! قاه! (بخنده درآمده) بخدا راست
می گوئی دیروز خانم دکتور را دیدم، معلوم
می شد گویا روی خود را با چونه گلکاری کرده
بود، و بر لبهای خود روغن دروازه را مالیده

بود.

خانم: بلی خواهرم! چرا ما خود را بدست خود بشکل ساخته و مسخره
مردم شویم؟ شوی خود را گفته ام، دیگر مرا با خود هیچ جای
نبرد، زیرا باین لبان سیاه و موهای آشفته و دهجات
آهک زده، بیرون رفتن عیب است. از این کرده
بهتر است که چادر بپوشیم.

خانم جمیل: چادری؟ براستی که چادری بپوشی، راست می
گوئی. سامان آرائش که دستیاب نشود اگر چادری نپوشیم
دگر چکنیم "دیگر از نیکو نه زندگانی بیزار!

خانم: والله. درین چند روز جائی بهر آمده ام بشما بگویم
که این "آب لوندر" مانند خاک ارزان بود اینهم گم شده

خانم جمیل: بیادم می آید که آب لوندر را پیش نجمه دیده بودم

نجمه: بلی داشتم و دیر شد که سه شیشه آنرا خریده بودم چون
دیدم که سامان آرائشی خارجه نایاب شده میرود، آنهم
از مصرف بی محابای آن دست کشیدم و خیلی با احتیاط
مصرف می کنم. اگر می فرمائید بشما نیز پیدا میکنم

خانم: خدایکی بدهست: از هر جای و به هر آرزیش که پیدا شود
برایم بگیر. اگر می خواهی به شوی خود امر می کنم که "تیز
رفتار" را بکشد و یک نوبت طرف بازار برآئیم. (اینرا
گفته آواز داد) شما کجا ئید؟ "آیا می شنوید؟"

خودم: بلی! ای جیم. گوشهایم باختلاط شما است. سلام
مرا به خانم جمیل و بخواهرم نجمه نیز بگوئید"

خانم جمیل: چرا آغا! خودت روی گیر شدی که اینجا نمی آئی؟

خودم: نی خواهرم! خدا ناخواسته چرا روی گیر شوم! نمی خواستم
که در اختلاط شما بی موجب در آیم. بدل گفتم که هنگام
چای با یکدیگر سلام علیکی می کنیم. (طرف اطاق مهمانان
رفتم بمجردیکه باطاق مهمانان داخل شدم دیدم که روی

خانم بازشگفته است وآثار صحت وخوشحالی از رویش پیداست چنانش پر نور و بهائش پر سرور است ـ)

خانم :ـ موتر بکشید که بگردش بازار برآئیم ـ

خودم :ـ این فرمایش شما مرفردپیش ازپیش در پروگرام من شامل بود زیرا می خواستم شما را جهت معاینه دکتور به برم ، اما اکنون حاجت آنرا نمی بینم زیرا مرض شما بخوبی دریافتم و بحقیقت ناخوشی شما پی بردم ـ

خانم جمیل :ـ مرض ؟ چه مرض داشت ، نفهمیدم که مقصد شما چیست ؟

خودم :ـ بلی ! بلی امروز به کُنه هر دو مرض رسیده ام . هم به ناخوشی خانم وهم به مرض بازار . بلکه این نکته را نیز دریافته ام که مرض خانم با مرض بازار چه ربطی دارد . اگر راست از من بپرسید شما مریض بازارید ، و بازار نیز به مرض شما گرفتار ، خودم چه بگویم که باندیشه ناخوشی خانم چه حماقتها و سفاهتها از دستم سر نزده ، چه نازهای دکتورها و طبیب ها را که نکشیده ام !

خانم جمیل :ـ (غمزه کنان) خیر است کشیده اید ! حالا موتر را بکشید که برویم ـ

خودم :ـ هر چه که میفرمائید حاضرم ، اما باری سخن مرا نیز گوش دهید ! شما مغازه داران را به سیاه بازاری آماده می سازید و نه فقط سود خوری را میاموزانید ، بلکه این فعل شنیع آنها را تحریص و تشویق می کنید . اگر رفتار شما برهمین منوال باشد آن جمله تدابیریکه حکومت در خصوصی اصلاح وتعمیر مملکت پیش بینی کرده باشد . آن جمله تدابیریکه حکومت در خصوصی اصلاح وتعمیر مملکت پیش بینی کرده بربادی رود ـ تا وقتیکه خودتان از مصارف غیر لازمه خود دست نمی کشید ، این مغازه داران هرگز از سیاه بازاری و سود خوری واحتکار دست نمی بردارند ـ

در اوائل سخنان توصیه آمیز من بر گوشهای شان گران افتاد ، وازین وعظ ونصیحت من قدری دلگیر شدند اما چون سلسله صحبت خود را ادامه داده جمله نشیب وفراز حقائق را بایشان فاش نمودم ونماندم که چگونه ایشان پولی را که به عرق ریزی با وزحمت کشی بدست آورده ام به بادمی دهند همه ایشان به سخنان من متفق الرای شده تعهد کردند که دیگر به این آرزوهای خام دلی اساس نه خواهند پرداخت ـ خیلی خوشنود گردیدم که حرفهای من بدل شان نفوذ کرد . چون دیدم که خانم نیز متاثر گشته بود نطق خود را با نجام رسانیده گفتم ؛ خوب . باشید فرمایش شما را نیز بجا بیاورم ، میروم که موتر را بیاورم "

خانم :ـ نی ! حالا رفتن بازار لزومی ندارد ـ

خودم :ـ چرا نفهم ، ضرور میرویم . باید که مقداری شیرینی از بازار خریده بیاوریم ، زیرا شما صحتیاب شده اید و فردا حمام صحت خواهید نمود) (سروش)

مرزا آزاد کشمیری

تا نه بینیم غم جدائی را	می کنم ترک آشنائی را
جامه زیبائی نمی خرند هیچ	چکنم دلق پارسائی را
روز مردم سیه ز چشم تو شد	میکنی چند سرمه سائی را
سخت جانم مرا بکش باری	گر کنی تیغ آزمائی را
بنما روی خود که تا نکند	گل بپیش تو خود نمائی را
قد بالای یار می آرد	بر زمین آفت سمائی را

آستان کرم علی خان است
لایق آزاد ، جبه سائی را

جگر مرادآبادی

از سید عظمت علی

علی سکندر نام، جگر تخلص، مولدش مرادآباد روہیلکھند که در کنار رود گنگ آباد است حال متوطن گونده۔

شاعری نغز گو و شیرین کلام است که آثار ادبی وی در اکناف و اقصای ہند معروف و زبان زد مردم است صاحب دو دیوان "شعلۂ طور" و "آتش گل" است که مکرر طبع و منتشر شده است

شعر جگر از کمال شهرت عمومی احتیاجی بمعرفی ندارد، از احوال و زندگی وی اطلاعات کافی در دست نیست معروف است که در سی سالگی قید علایق را گسیخته قدم در راه آزادگی گذاشت و شباب را غرق شراب ساخت، خود میگوید:

مست است جگر از می، مست می ناب اولیٰ
او خانه خرابی ہست، او خانه خراب اولیٰ
من طالب آزارم، آرام نمی خواہم
بر جان من خسته صد گونه عذاب اولیٰ
از خرقه و عمّامه، من، ہیچ نمی دانم
گه گه، مگر این سامان در رہن شراب اولیٰ
بسیار بدم گفتی، وز من بشنو واعظ!
از ہر دو جہان تو یک جام شراب اولیٰ
من ساغر می در کف، مطرب تو بخوان بحرف
صد توبه و صد طاعت، غرق می ناب اولیٰ
تاکی جگر این مستی، بشنو سخن حافظ
رندی و خرابانی در عہد شباب اولیٰ

و در پنجاه سالگی از می دست کشید شعر وی پُر از احساسات و عواطف گوناگون است. می گوید:

ہمه ہوش و عشقم، ہمه سوز جانم
حذر ای جوانان، که پیر جوانم
نه اسمم نه جسمم، نه اینم نه آنم
چه راز عیانم! چه سرّ نہانم

جہان از من و، من ز جان محبت
بجان محبت! که جان جہانم
خوشا نسبت عشق، لافانی تو
فنا گشتم و زندۂ جاودانم

جگر در گلستان شعر بلبل ہزار داستان معنوی است، در رؤیای خود را چنان جامه نغزی بپوشاند که خواننده از لذت و ذوق مسحور می گردد

جگر بکمال خوشخلقی و بلند نظری زیست میکند۔ وی اغلب بزبان اردو که زادگاه زبان فارسیست شعر می سراید گاه گاہی بزبان فارسی نیز که بآن علاقه فراوان دارد بکمال شعرهای خوب و نغز بیسازد:

عجب ہنگامه زیر بام کردند — تماشا خاص و سودا عام کردند
تنک ظرفی خمار کرد پیدا — می دوشینه را بدنام کردند
لب ببستند و بہر سوی زبانم دادند — پا شکستند و بہر سوی نشانم دادند
تاب از دل بربودند و فغانم دادند — تیر از دست ببردند و کمانم دادند
دل سرگشته و چشم نگرانم دادند — آنچه دادند پی شورش جانم دادند

ای که ز روی عاشقان پرده برخ کشیده ای
جامۂ صبر و عقل و ہوش از ہمه جا دریده ای

بیخبرم ز خویشتن، ورنه تو صد ہزار بار
گاه ز جان گذشته ای، گاه به دل رسیده ای

از اشعار فارسی وی پیداست که سخت تا بتر حافظ شیرازی قرار گرفته است

ہر روز فیض گیرم جلسۂ قدس حافظ
بر من جگر گواه است این جوش آب معانی
یک جام تند ساقی! تا فاش فاش گویم
ہیچ خبر ندارد، ز اسرار زندگانی

با وصف برودت پیری جگر گفتار شوخی را از دست نداده است

وی مرہی است بی نہایت خوش صحبت کہ نکات رنگینش تازگی بخش دلہای محزون وافکار دلنشینش از نزاکت معانی مشحون، چنانکہ در شعرکہ طوری سراید:

این غم دنیا و دین تا بکجا روز و شب
خیز اکہ باد بہار، بامی و مینا رسید

شاعر ما از واقعہ سال ہزار و نہصد و چہل و ہفت میلادی کہ در ہند رخ داد بسیار متاثر شد کہ در اشعار جدید "آتش گل" میگوید:

ہندوستان میں خیر سے ان کی کمی نہیں
لب پر ہیں جو خلوص کا دفتر لئے ہوئے
دیتے ہیں بات بات پہ انسانیت کا درس
دل میں ہزار دشنہ و نشتر لئے ہوئے
چہرے جنونِ حُبِ وطن سے دھوئیں دھوئیں
سینے خیانتوں کا سمندر لئے ہوئے
ظاہر میں اک مجسمۂ امن و آشتی
باطن میں لاکھ فتنۂ محشر لئے ہوئے
کہتے ہیں "بھائی بھائی ہیں اہلِ وطن تمام"
پھرتے ہیں آستینوں میں خنجر لئے ہوئے

جگر در حلقۂ بیعت حاج مولوی قاضی عبدالغنی منگلوری قرار دارد و ارادتی کہ نسبت بآن حضرت دارد از ین ابیات پیداست:

قاضیا یک نظر بسوئے جگر
آنکہ یک خادم است در حلقہ بگوش
پابندِ شریعتِ نبیؐ ہوں
خاکِ درِ دولتِ غنیؒ ہوں

قبل از فوت قاضی موصوف جگر از او سؤال کرد "پس از سرکار کرا ہادی خود انتخاب کنم" پاسخ داد "دست اصغر بگیر" از ین رو جگر بدست سخنور بزرگ اصغر گوندوی بیعت کرد و از کمال فیض وی در منظومات خود استفادہ کرد چنانکہ میگوید:

کیونکر بہار شعر سے نپٹے نہ اے جگر
رنگِ کلام حضرتِ اصغر نظر میں ہے
نگاہ حضرتِ اصغر کی اک دعیت خاص
قرار بن کے جگر کے دلِ حزیں میں رہی
بدن سے جان بھی ہو جائیگی رخصت جگر لیکن
نہ جائیگا خیال حضرتِ اصغر مرے دل سے

از دو دیوان وی کہ بالغ بر پنج ہزار بیت است در اینجا بعضی ابیات برجستۂ شاعر را برای خوانندگان عزیز انتخاب می کنیم:

ہر طرف غل ہے "وہ آیا جگرِ بادہ پرست"
اثرِ نشۂ صہبا سے "سراپا بدمست"
شعرِ حافظ بزباں، جام بکف، شیشہ بدست
بےخبر از ہمہ عالم، چہ بلند است چہ پست

شورِ مستانہ کہاں اور سخنِ وعظ کہاں
آج یہ رند کہاں، انجمنِ وعظ کہاں

اُف وہ روئے تابناک و چشمِ تر میرے لئے
ہائے وہ زلفِ پریشاں تا کمر میرے لئے
حیف وہ لغزیدہ لغزیدہ قدم میری طرف
ہائے وہ دزدیدہ دزدیدہ نظر میرے لئے
وہ رخِ رنگیں پہ انوارِ محبت زرد زرد
"وہ لبِ نازک پہ طوفانِ شرر میرے لئے"
سر سے پا تک آہ وہ اک پیکرِ حسن حزیں
"چار جانب دیدۂ حسرت نگر میرے لئے"
سرد سرد آہوں میں تاثیرِ محبت گرم گرم
خشک خشک آنکھوں میں جوشِ اشکِ تر میرے لئے
سامنے آتے ہی آتے وہ تنفس تیز تیز
"سینۂ شفاف وہ زیر و زبر میرے لئے"
وہ سرک جانا یکایک روئے تاباں سے نقاب
حیرت افزا رونقِ دیوار و در میرے لئے
اُف وہ کہنا اُس کا پھر باہوں میں باہیں ڈال کر
"میں جگر کے واسطے ہوں اور جگر میرے لئے"

رنگِ حنا ہے یہ ترے جوشِ شباب میں
یا چاندنی کا پھول کھلا ہے گلاب میں

چشمِ امید میں ہے جان ابھی تھوڑی سی
ابھی دھندلا سا اُجالا نظر آتا ہے مجھے

تصور میں یہ کس کا جلوۂ مستانہ آتا ہے
کہ یہ آنسو لیے ہمراہ اک پیمانہ آتا ہے

لے کے خط اُن کا۔ کیا ضبط بہت کچھ لیکن
تھرتھراتے ہوئے ہاتھوں نے بھرم کھول دیا

جلوہ جو اُن کے رُخ کا مری چشمِ تر میں ہے
شادابیِ بہار کا عالم نظر میں ہے

وفا پر دل کو صدقے، جان کو نذرِ جفا کر دے
محبت میں یہ لازم ہے کہ جو کچھ ہو فنا کر دے

موت کیا ایک لفظِ بے معنی
جس کو مارا حیات نے مارا

پردۂ شوق سے اک برق تڑپ کر نکلی
یاد کرنے کی طرح سے انھیں جب یاد کیا

یہ ترا جمالِ کامل، یہ شباب کا زمانہ
دلِ دشمناں سلامت دلِ دوستاں نشانہ

زمانہ گرمِ رفتارِ ترقی ہوتا جاتا ہے
مگر اک چشمِ شاعر ہے کہ پرنم ہوتی جاتی ہے

دو بچھڑے دلوں کی وہ باہم صلح صفائی
پر کیف وہ تجدیدِ ملاقات کا عالم
شرمائی لجائی ہوئی وہ حسن کی دنیا
وہ بہکی ہوئی بھیگی ہوئی رات کا عالم
نازک سے ترنم میں اشارات کے دفتر
ہلکے سے تبسم میں کنایات کا عالم

شاعر پرمایۂ ما جگر کہ مایۂ سرافرازی و مباہات ہند است در گوشۂ اطاق خود دست بدست افلاس دادہ ایام زندگی را بلخی بسری کہ برای ما باعث بسیار تاسف است باید کہ یاد ہمکاری کرد تا بار زندگی ملالت بادی سبک گردد ؛

بہار

حضرت اصغر گونڈوی مرحوم

ہے سراپا حسن، وہ رنگیں ادا، جانِ بہار
حسن پر، حسنِ تبسم، صبحِ خندانِ بہار
ایک سی گلکاریاں ہیں ایک سی رنگیں بہار
لے کے دامانِ نظر سے، تا بہ دامانِ بہار
ذرہ ذرہ بھر رہے گا، اک جہانِ رنگ و بو
چپے چپے ہو رہا ہے عہد و پیمانِ بہار
سبزہ و گل لہلہاتے ہیں نمو کا زور ہے
موجِ رنگا رنگ ہے یا جوشِ طوفانِ بہار
یوں نہ اس دورِ خزاں کو بے حقیقت جانئے
پرورش پائی ہے اس نے زیرِ دامانِ بہار

بنا لیتا ہے موجِ خونِ دل سے اک چمن اپنا
وہ پابندِ قفس جو فطرۃً آزاد ہوتا ہے
یہاں کوتاہیِ ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری
جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا
جو غم ہوا اُسے غمِ جاناں بنا دیا
وہ شورشیں نظامِ جہاں جن کے دم سے ہے
جب مختصر کیا انھیں انساں بنا دیا

ملک غلام کبریا گگی زئی
(سردش)

اکبرشاه خان یوسفزئی مورخ وشاعر

خانواده وتولدش: مولانا اکبرشاه خان بن مولوی نادر شاه خان بن مظفرشاه خان بن ضامن شاه خان بن سید شاه خان پشتون صحیح النسب یوسفزائی است که مورث اعلای این خاندان از شمال پشاور (بونیر) درعصر نجیب الدوله، ودر نجیب آباد سکونت کرد.

درین خاندان مولانا اکبرشاه درسنه ۱۸۷۵ مسیحی در نجیب آباد بدنیا آمد، تعلیم ابتدائی را درآغوش دودمان خود گرفت، پدرش نادرشاه دران عصر از علمای جید عربی وفارسی بود، وی از خود تحصیل علم نمود، زبان فارسی وعربی واردو و کمی انگریزی آموخت، ودرمکتب عالی بحیث مدرس داخل ملازمت گردید.

مطالعات وشهرت: مولانا در تاریخ اسلام سلسله مطالعات خود را دوام داده، ودرسنه ۱۹۰۱ء اولین کتاب خود را بنام «تاریخ نجیب آباد» نگاشت وبعدازان درسنه ۱۹۰۶ء رساله ای در اردو بنام "ورزش جسمانی" نوشت. وی از زمان جوانی خود به تاریخ وورزش ذوقی داشت، وتا پایان عمر همین ذوق باوی باقی بود.

مولانا بعد از مدتی به لاهور آمد ودرمکاتب عالی این شهر بحیث پروفیسر فارسی واردو مقرر گشت، وشهرت کافی را درحلقهای علمی وادبی بدست آورد، ورسایل "زندگی سپاهیانهٔ اسلامی" و "دین وشمشیر" و "اکابر قوم" را نوشته ونشر کرد، که مردم آنرا باشوق وذوق خواندند.

همدرین اوقات مولانا، درجهان صحافت نیز قدم گذاشت، وبعنوان مدیر جراید 'پیغام صلح' و 'زمیندار' لاهور مدتی کرد، بعد ازان واپس بمولد خود نجیب آباد برگشت، ودرانجا سکونت دائمی گرفت.

مجلهٔ عبرت: مولانا در نجیب آباد مجله تاریخی معروف اردو وفارسی بنام "عبرت" تاسیس کرد که دران مضامین تاریخی وادبی واشعار فارسی ومقالات دلچسپی بارد وی نوشت وهمچنان کتاب مفصل خود را بنام "تاریخ اسلام" نشر کرد که مشاهیر علمای هند مانند علامه اقبال، مولانا ابوالکلام آزاد وسر عبدالقادر ومولانا سید سلیمان ندوی ازان کتاب تقریظ کرد ومکاتیب تحسین به وی فرستادند.

وقتیکه کتاب "آئینهٔ حقیقت نما" جلد اول را نشر کرد، خواجه حسن نظامی ادیب معروف معاصر دربارهٔ آن چنین نوشت: "اگر من متمول بودمی، مولانا اکبرشاه را با گوهر وزن کردمی، ونسخه های کتاب را به یک لک روپیه خریده، رایگان بمردم دادمی" (روزنامچه حسن نظامی)

اخلاق وسیرت: مولانا مزاج آزاده ای داشت، با سادگی میزیست، ساده می پوشید، هیچ گونه تکلف وتصنع نداشت، با مردم بخلوص وراستی پیش می آمد، کریم بود، هزاران جلد کتب تصانیف خود را بمصارف خود به مستحقین رایگان می فرستاد، درسیرت او دو نقطه خیلی نمایان است یعنی سپاهی بود ومورخ، وی همواره تذکار صفات سپاهیانهٔ اسلاف می

[...] مطالعات تاریخی خود را هم برین اساس بنا نهاده بود،
[...]ت شمشیر قلم را در مدح و شرح شمشیر اسلاف بکار برد، و
[...] داستان و سیرت شمشیر زنان مجاهد را نگارد.

وفات: مولانا بعد از مرض اسهال طولانی یازده ماه که در
[...] ۱۹۴۶ء بوی عارض شده بود، بتاریخ ۱۰ امئی ۱۹۴۸ء
بعمر ۹۳ سالگی از جهان رفت. در حالیکه در سرتاسر برعظیم هند
به لقب "مورخ اسلام" شهرت یافته و در قطار علما و دانشمندان
نامی جای گرفته بود.

تالیفات: مولانا یکی از علمای کثیر التالیف است،
که اکثر کتب وی چاپ شده و مقبول عام بود، مانند:
(۱) آئینهٔ حقیقت نما (۲) قول حق (۳) گاو و عظمت
تاریخی آن. (۴) وید او قدامت آن (۵) جنگ انگوره
(۶) نواب امیر خان والی تونک (۷) مسلمانان اندلس (۸)
خان جهان لودهی (۹) خواص خان دلی (۱۰) نظری بر پرده
(۱۱) تاریخ اسلام در سه جلد ضخیم (۱۲) زندگانی سپاهیانه
مسلمانان (۱۳) اکابر قوم.

اولاد و اخلاف: مولانا جز یک دختر اولادی نداشت
یک نفر خواهرزادهٔ او محمد ایوب خان تاکنون هم در هوتی مردان
پشاور زنده است که دختر مولانا در حبالهٔ نکاح اوست، یک
نفر خواهرزادهٔ دیگری هم بنام محمد ادریس خان در نجیب آباد
داشت که مؤلف (تاریخ مرهته) است.

اشعار فارسی

مولانا اشعار زیادی بزبان فارسی سروده که در مجلدات
مجلهٔ عبرت" زیر عنوان "قند پارسی" بنظر می آید و اکبر تخلص
اوست. شعر فارسی او روان و شیرین بوده و اقتدار قریحه
او را نشاندگی میکند، که اینک بطور نمونه چند غزل او را
از شماره‌های قدیم مجلهٔ "عبرت" اقتباس می کنیم:

(۱)

عمریست که در دیدهٔ اغیار نهانم
در شیشهٔ افلاک پری وار نهانم

پیدائی من موجب پنهانی من شد
چون آئینه در پردهٔ زنگار نهانم

ای همنفسان از طلبم دست بدارید
پیدا نشوم، هیچ که بسیار نهانم

ناخن بدل و مهر بلب میزندم عشق
انگشتریم در کف دلدار نهانم

(۲)

هزار شکر که از قید بیکسی رستم
بریدم از دو جهان و بدوست پیوستم

من و مضائقه جان به عشق شرمم باد
چنین بدان که چنان نیستم اگر هستم

حباب وار درین بحر خانه بر دوشم
دلم پر است ز همت، اگر تهی دستم

مجال خاک بسر کردنی نمی یابم
که وقت گردن مینای می بود دستم

خراب بادهٔ عشقم ز من چه می پرسی
مپرس حال دلم را که ظرف سرمستم

(۳)

گر بخونم تشنه دارد جوهر شمشیر را
گردن تسلیم آرم عذر هر تقصیر را

تا شنیدم حرف جوی شیر دانستم که عشق
میزند بسیار سر بر سنگها تدبیر را

هر زمان در سینه ام دل می تپد بی اختیار
چشم دام کیست یارب در پی نخچیر را

گر ملایم، با تو گردد روزگار ایمن مباش
چین بزیر مو نہان باشد جبین شیر را
عاشق معشوق از خیال یار دارد بزم وصل
گل ہم از تصویر باشد بلبل تصویر را
ہر کہ شد خلوت نشین گوشۂ زندان او
می شمارد سبحۂ اورا د خود زنجیر را

(۴)

من خلاصی خواہم از بند غمت ای وای من
ہر خم زلف تو زنجیر است در ہر پای من
من چہ خواہم از دعایش من چہ رنجم از جفا
ہر چہ می خواہد کند معشوق بے پروای من
تا جنونم سیر مانست در صحرای عشق
میرسد تا گوش گردون ہر شبی غوغای من
در گریبان چاکہا چون غنچہ دارد اہل دل
لذت غمہای من خوشتر ز شادیہای من

از محبت دل شود معمور چون گردد خراب
ای دل شوریدہ ویران شو چو خواہی جای من
چشم ظاہر بین کجا داند کہ این مستی چرا
چشم ساقی بود "اکبر" ساغر صہبای من

رباعی

بچشمت ہر مژہ پر کردہ تیر است
نگاہت در نیستان خفتہ شیر است
بیک دیدن گرفتار تو گشتم
سر زلفت عجائب شیر گیر است

قطعہ

گہی از دست و گاہی از دل وگاہی ز پا مانم
بسرعت می روی ای عمر می ترسم کہ وا مانم
گرامی گوہر عشقم مشو غافل ز حال من
مباد از گرمی بازار استغنا بجا مانم

ستارہ و آفتاب

ستارہ تا نرود آفتاب کی آید!
بلی، سحر بغروب ستارہ می زاید!
ہر آفتاب کہ از قرب دوست دور جست
چو ذرہ اش فلک از لوح خویش بزداید
چو آفتاب قریب و ستارہ دور از اوست
ستارہ گو برود، آفتاب برآید!
بقرب دوست کہ ہر ذرہ رشک خورشید است
ستارہ وار ہمی آفتاب شرمآید
تو آفتاب توانی شدن ستارہ مباش
قریب حضرت او شو چنانکہ می شاید

عبدالحمید ضیا (کراچی)

ظفرخان احسن بقیه صفحه ۱۰

با کی پور امیرا «خطبهٔ ساقی نامه» میگوید و می نویسد
که خطبهٔ مزبور مقدمهٔ ساقی نامه ظهوری است
و این اشتباه است زیرا در خطبهٔ مزبور اسم ظفرخان
صراحتاً ذکر شده است -

از رباعیات ظفرخان احسن است :

استاد مرا چو درس می نوشی گفت
اول سبقم حدیثِ بیهوشی گفت
تا خاطر عالمی پریشان گردد
احوال دلم زلف بسرگوشی گفت

(پایان)

کتیبه ایکه یکهزار ساله بقیه الصفحه ۲۸

از تصریح بلاذری روشن می شود که اثر اسلام و عرب از راه بلوچستان و مکران سند زود تر، تا لاهور و بنون رسید و عرب از راه کابل و غزنه دستیقاً به چند گذشته نتوانستند، زیرا بلاذری گوید که در ۴۴ھ در عهد سلطنت معاویه بن ابی سفیان فاتح عربی مهلب بن ابی صفره از راه قیقان و سند به بنه (بنون) و الاهوار (لاهور) رسید، و این دو شهر بین ملتان و کابل واقعند و شاعر از وی راجع به این واقعه چنین گفت :

الم تران الازد لیلة بیتوا ... ببنة کانوا خیر جیش المهلب

(فتوح ص ۴۳۲)

یعنی نمی بینی شبیکه ازدیان در بنه گذرانیده اند، ایشان بهترین لشکر مهلب بوده اند

با این سند بلاذری توانیم گفت :- که در حدود ۴۴ھ لشکر های عرب از طرف جنوب و در وادی سند تا بنون پیش رفته بودند، و وادی توچی هم در جنوب غرب بنون بر کنار دریای توچی ارگون جنوب شرق غزنی تا کرم گرهی جنوب بنون افتاده است و در پیهم

ظرف منزاب

از خانم فروغ فرخزاد

(تہرانی)

و

اُردو ترجمہ

عظمت علی رضوی

بلب هایم مزن قفلِ خموشی
که در دِل قصۀ ای ناگفته دارم
ز پایم باز کُن بندِ گران را
که این راهست من هم رهسپارم
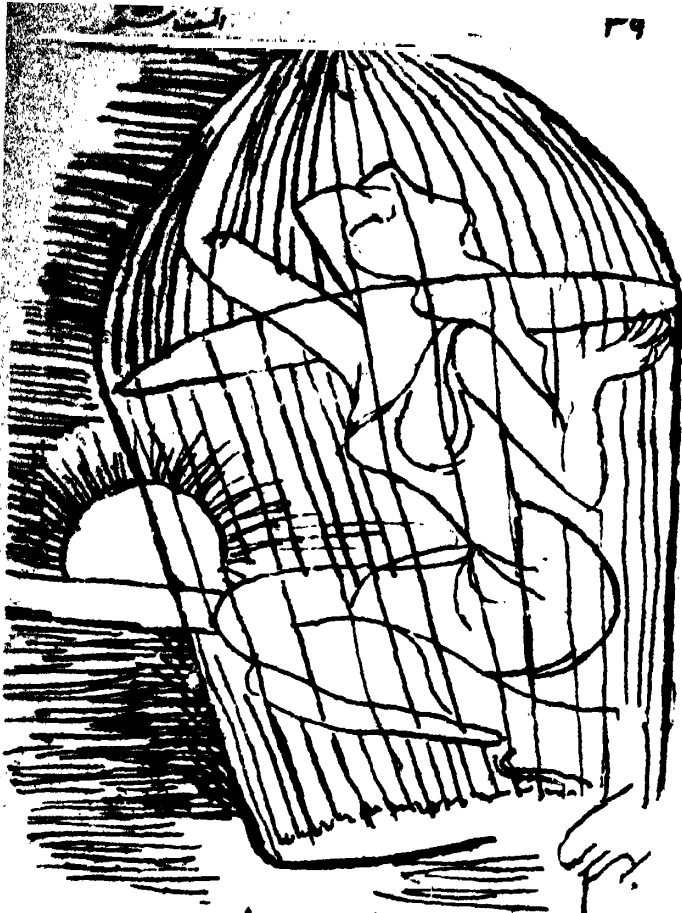
میرے لب پر نہ قفلِ خموشی لگا
قصے رکھتی ہوں ناگفتنی سیکڑوں
میرے پاؤں سے بندِ گراں کھول دے
میں بھی اس راستے کی ہوں ایک راہرو

بیا ای مرد.... ای موجودِ خود خواه
بیا بگشای درهای قفس را
اگر عمری بزندانم کشیدی
نمی خواهم دِگر این یک نفس را

آ... اِدھر۔ مردِ خود بیں... اِدھر آ ذرا
کھول کر دَرِ قفس کا مجھے کر رِہا
اِک زمانہ رہی ہیں تری قید میں
اَب نہ پل بھر رہوں گی میں اس قید میں

بیا من هستم آن مرغی که دیریست
بسر اندیشۀ پرواز دارم

میں پرندہ ہوں وہ جو بہت دیر سے
سر میں سودائے پرواز رکھتا ہو جو

سرود ناله شد در بین لبها
تبه شد از فراق حسرت روزگارم

بلبهایم مزن قفل خموشی
که من باید بگویم راز خود را
بگوش مردم عالم رسانم
طنین آتشین آواز خود را

بیا بگشای در تا پر گشایم
بسوی آسمان روشن شعر
چرا آخر نمی خواهی که باشم
گل خوشبو میان گلشن شعر؟

لبم با بوسه شیرینش از تو
تنم با بوی عطر آگینش از تو
نگاهم با شرر های نهانش
دلم با پیکر خونینش از تو

ولی ای مرد.... ای موجود خودخواه
مگو ننگ است این شعر تو ننگ است
ز بهر شاعر آشفته حالی
چه گویم... این قفس تنگ است... تنگ است

مگو شعر تو سر تا پا گنه بود
ازین ننگ و گنه پیمانه ای ده
بهشت و حور و آب کوثر از تو
مرا قعر جهنم خانه ای ده!

میرا گانا بھی اب لب پہ نالہ ہوا
ہو چکے غرق حسرت یہ شام و سحر

میرے لب پر نہ قفل خموشی لگا
تاکہ میں راز دل منہ سے کچھ کہہ سکوں
پوری دنیا کے مردوں کو پہنچا سکوں
اپنے درد دروں کی میں آواز کو

کھول دے آہنی در کہ پر تول لوں
آسمان روشن شعر پہ اڑ سکوں
کس لیے تو نہیں چاہتا ہے کہ میں
گلشن شعر کی اک گل تر بنوں

تیرے بوسوں سے شیریں ہوئے میرے لب
تیری خوشبو سے مہکا ہے میرا بدن
میری نظروں میں تیری شرر باریاں
اور اطاعت سے دل پیکر خون ہے

لیکن اے مرد.... اے مایہ خود پرست
یہ نہ کہہ تیرے اشعار سے ننگ ہے
مجھ سی آشفتہ سر شاعرہ کے لیے
کیا کہوں یہ قفس تنگ ہے.... تنگ ہے

گر گنہ تیرے اشعار یہ تو نہ کہہ
آخر اس ننگ کا کوئی پیمانہ ہے؟
حور و جنت تو سب کچھ ہیں تیرے لئے
مجھ کو قعر جہنم میں ہی رہنے دے

کتابی .... خلوتی ..... شعری .... سکوتی
مرا شادی و لطفِ زندگانیست
چہ غم گر در بہشتی رہ ندارم
کہ در قلبم بہشتی جاودانی است

شبانگاہان کہ مہ می رقصد آرام
میانِ آسمانِ گنگ و خاموش
تو در خوابی و من مستِ ہوسہا
ترا مہتاب میگیرم در آغوش

نسیم از من ہزاران بوسہ بگرفت
ہزاران بوسہ بخشیدم بخورشید
دران زندان کہ زندان بان تو بودی
شبی کامِ دلی دادم بامید

بہ دور افگن حدیثِ نام .... ای مرد
کہ ننگم لذتِ مستانہ دادہ
مرا می بخشد آن پروردگاری
کہ بہ شاعر .... دلِ دیوانہ دادہ

بیا بگشائی در تا بہ گشایم
بسوئی آسمانِ روشنِ شعر
چرا آخر نمی خواہی کہ باشم
"گلِ خوشبو .... میانِ گلشنِ شعر"

خلوت و شعر و دیوان و دل کا سکوں
ہیں خوشی کے لئے میرے کافی بھی
اس کا غم کیا کہ جنت سے میں دور ہوں
میرے دل میں ہے خود اک بہشت بریں

بھیگی راتیں ہیں اور چاند ہے رقص میں
آسماں پُرسکوت اور خاموش ہے
خوابِ شیریں میں ہیں تو۔ اور میں مست ہوں
نورِ مہتاب ہے میری آغوش میں

میرے بوسے نسیمِ سحر نے لئے
اور ہزاروں دیئے میں نے خورشید کو
رات اس جیل خانے میں سب کچھ ہوا
جس کا نگراں تو ہی تھا تو ہی پاسباں

چھوڑ اے مرد سب یہ حدیثِ کہن
ننگ نے مجھ کو بخشا ہے مستانہ پن
میرے اللہ کا ہے یہ مجھ پر کرم
کہ کے شاعر دیا دل کو دیوانہ پن

کھول دے یہ قفس تا کہ میں جا سکوں
آسماں روشنِ شعر پر چھا سکوں
کس لئے تو نہیں چاہتا ہے کہ میں
"گلشنِ شعر میں پھول بنکر کھلوں"

مرزا عبدالقادر بیدلؔ

مرزا عبدالقادر بیدل عظیم آباد (پٹنہ) میں ۱۶۴۴ء میں تولد ہوئے اور ۱۷۲۱ء میں انھوں نے دہلی میں وفات پائی۔ یعنی عہدِ شاہ جہانی میں پیدا ہو کر محمد شاہ کے عہدِ حکومت سے ۱۴ سال بعد تک زندہ رہے۔ تاجکستان اس شاعر بزرگ کے اجداد کا وطن تھا اسی لئے تاجکستان والے اسے بے حد پسند کرتے ہیں۔ یہ اپنے زمانہ کا سب سے بڑا شاعر مانا گیا ہے باوجودیکہ اس نے ایک مصرعہ بھی کسی کی تعریف میں نہیں لکھا۔ وہ بڑی آزادانہ زندگی بسر کرتا تھا، امرائے سلطنت مثلاً نظام الملک آصف جاہ بانی ریاست حیدرآباد اور میر شکراللہ خاں سے بڑے اچھے تعلقات تھے اور سب اسے احترام کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ متاخرین مغلیہ شعراء میں تصنع اور غرابت نگاری کا جو رواج شروع ہوا تھا۔

بیدلؔ اسے ایک قدم اور آگے لے گیا۔ اس کے ضخیم کلیات پر غنیؔ اور ناصر علی سرہندی کے دواوین کی طرح نگہِ انتخاب نہیں ڈالی گئی اور چونکہ وہ علمیت اور فلسفہ میں اُن سے بہت آگے تھا اس لئے بادی النظر میں اس کے کلام میں اشکال و غرابت غنیؔ اور ناصر علی سے بھی زیادہ نظر آتی ہے اور بیشتر اشعار بالکل چیستان ہو گئے ہیں۔ لیکن بیدل کو ان پر بدرجہا فوقیت حاصل ہے۔ ایک تو اس کے دیوان میں صاف اشعار ہیں دوسرے اس نے قلوب کو حقائق و معارف کی طرف متوجہ کیا ہے غنیؔ کا طرۂ امتیاز مثالیہ تھا اور ناصر علی کا مضمون آفرینی۔ بیدلؔ کے طرزِ سخن میں یہ دونوں چیزیں موجود ہیں اس نے طبیعتوں کو مجاز اور عارضی باتوں سے ہٹا کر زندگی کی عمیق حقیقتوں کی طرف پھیرنا چاہا اور اپنے اشعار کو حقائق و معارف کا آئینہ بنایا۔

بیدل میں بلا کی جدت پسندی تھی۔ نئی نئی بحروں میں غزلیں لکھتا اور زندگی کے حقائق کو اُلٹ پلٹ کر ہر طرف سے دیکھنے کی کوشش کرتا اس طرح بعض بڑے دلچسپ اور نئے نکتے پیدا کئے ہیں

نمونۂ کلام بیدلؔ

ستم است اگر ہوست کشد کہ بہ سیرِ سرو و سمن درآ
تو ز غنچہ کم نہ دمیدہ ای درِ دل گشا بچمن درآ
پیِ نافہ ہای رسیدہ بو مپسند زحمتِ جستجو
بخیالِ حلقۂ زلفِ او گرہی خورد بہ ختن درآ
نفست اگر نہ فسون دہد بہ تعلقِ ہوس جسد
ز وِ دامن تو کہ می کشد کہ دریں رباطِ کہن درآ

ہمہ عمر با تو قدح زدیم و نہ رفت رنجِ خمار ما
چہ قیامتی کہ نمی رسی ز کنارِ ما بہ کنارِ ما
چو غبارِ نالہ بہ نیستان نہ زدیم گامی ز امتحان
کہ ز خود گذشتنِ ما نہ شد بہ ہزار کوچہ دوچار ما
ہمہ را بہ عالمِ بیخودی قدحی است از میِ عافیت
سر و برگِ گردشِ ما ببین چہ خطی کشد بحیا بہ ما
دلِ ناتوان بکجا برد المِ ترددِ عاجزی
کہ چو سبحہ ہر قدم او فتد بہزار آبلہ کارِ ما
بمرادِ نسخۂ نیستی نہ رسید مشقِ تاملت
قلمی بہ خاکِ سیاہ زن بنویس خطِ غبارِ را

صفِ رنگ لالہ بہم شکن می جوشِ گل بزمین فگن
بہ بہار دامنِ ناز زن زحنای دستِ نگار ما

نہ بدامنی زحیا رسد نہ بدستگاہِ دعا رسد
چہ رسد بہ نسبتِ پا رسد کفِ دست آبلہ دار ما

چمن طبیعتِ بیدلم ادب آفتاب شگفتگی
زدہ است ساغرِ رنگ و بو بدماغ غنچہ بہار ما

چنین گشتہ - چہ کینم من دل | کہ چون آتش از سوختن زیستیم من
نہ شادم نہ محزون نہ گردون نہ خاکم | نہ ظلم نہ مضمون نہ خیستم من
نوای خرامم نفس می شمارم | اگر ساز عبرت نیم چیستم من
جہان گرچہ با سازِ ہستی نبازد | کمالم ہمین بس بود نیستم من
باین یک نفس عمرِ موہوم بیدل | فنا تہمتِ شخص با قیستم من!

باز سرگرمیِ نظارہ بسامان شدہ است
شعلۂ آتشِ دیدار گل افشان شدہ است
زین چراغی کہ طرب جوششِ انجم دارد
آفتابِ دگر از آب نمایان شدہ است
صلحِ کل نذرِ حریفان کہ درین عشرت گاہ
آتش و آب بہم دست و گریبان شدہ است
بیدل آن شعلہ کزو بزمِ چراغان گرم است
یک حقیقت بہ ہزار آئینہ تابان شدہ است

برای خاطرم غم آفریدند | طفیلِ چشمِ من نم آفریدند
چسان تا بم سر از فرمانِ تسلیم | کہ چون ابرو مرا از خم آفریدند
طلسمِ زندگی الفت بنای است | نفس را یک قلم رم آفریدند
اگر عالم برای خویش پیداست | برای من مرا ہم آفریدند

علاجِ نیست وضعِ بندگی را
اگر میگم وگر کم - آفریدند

بیدل کی منظومات میں داستانِ کامدی و مدن" بہت مقبول ہے
نظم کا موضوع ہے جذبۂ عشق و محبت جو ہر مصیبت و ناانصافی اور ظلم و تشدد
پر فتحمند ہوتا ہے، جس سے موت بھی ہار مان لیتی ہے نظم کی کہانی بڑی سیدھی
سادی ہے۔ مدن ایک ماہر فنِ موسیقی ہے دور دیس سے رقاصۂ باکمال کامدی کا
کا شہرہ سن کر "ہندوستان" آتا ہے۔ ایک شاہی جشن میں اپنے کمال کا مظاہرہ
کرتا ہے اور بادشاہ اتنا خوش ہوتا ہے کہ اپنی موتیوں کی مالا اتار کر مدن
کے گلے میں ڈال دیتا ہے۔ لیکن مدن جب کامدی کو رقص کرتے دیکھتا ہے تو ایسا
مسحور ہو جاتا ہے کہ اسی شاہی انعام کو کامدی کے قدموں میں ڈال دیتا ہے
بادشاہ کو اس توہین پر غصہ آجاتا ہے اور وہ حکم دیتا ہے کہ مدن کو قرار واقعی
سزا دیکر شہر سے نکال دیا جائے۔ سپاہی اسے کشاں کشاں لے چلتے ہیں لیکن
کامدی ان کی خوشامد درآمد کر کے، رشوت دے کے، رات بھر کی مہلت لیتی ہے
اور مدن کو اپنے گھر لے جاتی ہے۔ جدائی کا یقین اس مہلت یک شب پر بھی
ایک سیاہ بادل کی طرح چھایا رہتا ہے۔ ساری رات ایک دوسرے کو تسکین
دینے گزر جاتی ہے اور صبحدم مدن ایک ایسے درخت کی تلاش میں روانہ ہو جاتا
ہے جس کے متعلق اس نے سن رکھا تھا کہ وہاں جو مراد بھی مانگی جائے پوری ہوتی ہے
راہ میں طرح طرح کے مصائب پیش آتے ہیں، مگر دل کی لگن سب کچھ جھیل لیتی ہے
اور بعد از خرابی بسیار سہی لیکن بالآخر کامدی و مدن کی محبت کامران و کامیاب
ہوتی ہے۔ اس منظوم کلام کا منظوم اردو ترجمہ جناب تقی حیدر مرتب سوویت
دیس اردو نے نہایت کامیابی سے کیا ہے جس کے دو اقتباسات ہدیۂ ناظرین
ہیں ایک میں جشنِ شاہی کا بیان ہے اور دوسرے میں ان صعوبتوں کا ذکر ہے
جو مدن نے ہجرِ کامدی میں برداشت کیں۔

حکمِ شہ سے نیا جشن جمی | خلقت اک گرد اس کے جمع ہوئی
نغمۂ عیش چھیڑے مطرب نے | تھی خوشی عام فیضِ ساقی سے
چل گیا تھا فسونِ نوشانوش | جمع تھے رند، گردنِ فروش
وقت آیا کہ کامدی و مدن | اپنے فن سے کریں جہاں روشن
اور ہو ذیبِ طرب ترحمِ صنوبر | نغمۂ دل بہ انتخاب سرود
مرکزِ شوق تھے دو پیکرِ ناز | ساری محفل تھی گوش بر آواز

اہلِ بزم اور وہ تو رہنِ ہوش
آنکھ اور جلوۂ بہار آغوش

اٹھ لیں ساغرِ شعور بھرا
جس سے مطرب کو حکمِ شوق ملا

اٹھا وہ مطربِ طرب آہنگ
مثلِ آوازِ پردۂ نیرنگ

قائم و منجمد سراپا تا سر
نوکِ پرکار جیسے مرکز پر

ہاتھ بغلوں میں تھا دبائے ہوئے
تھا وہ استادہ یوں کہ جیسے

تھا مدن شاہِ قدرداں کے حضور
اک منارِ کمال و ہالۂ نور

تھے نہ ہونٹوں پہ بول اور نہ بھاؤ
سانس میں تھا نہ کچھ اتار چڑھاؤ

پردۂ سازِ بے خروشی تھا
شمعِ ہنگامۂ خموشی تھا

سب کے سب اہلِ بزم تھے مبہوت
جانے کیا رنگ لائے اس کا سکوت

سوچتا کون؟ تھا کسے یہ ہوش
چاہتا کیا ہے یہ فسونِ خموش

حد سے گذری جو وضعِ خاموشی
کاوشِ شوق اور تیز ہوئی

نہ رہی تابِ ضبط محفل کو
اک خلش، اک گرہ سی تھی دل کو

صبر جانکاہ و وحشت افزوں تھا
جذبۂ اشتیاق مجنوں تھا

کہ اچانک مدن نے آہ بھری
جو کہ غماز رازِ الفت تھی

پھر لبِ سحرکار اس کے کھلے
نغمۂ جاں نواز یوں نکلے

اس کی آواز میں وہ سوز و گداز
جس سے شرمائیں لاکھ پردۂ ساز

وہ تموّج وہ درد وہ جھنکار
جس پہ آوازۂ چنگ و عود نثار

ایک آواز و جلوۂ صد رنگ
زیر و بم سے تھا ارغنوں بھی دنگ

ایک ساحر ہزار ہا مسحور
اک مغنی و سیلِ نغمہ و نور

اس کے مبہم سے اک تبسم سے
سو جلاجل کے ڈھنگ دف کو ملے

اس کی رگ رگ میں تھا رچا وہ سرور
غار کھاتی تھی ہر رگِ طنبور

بزم کی بزم غرقِ طوفاں تھی
کان سنتے تھے چشم حیراں تھی

نغمۂ جاں گداز کی گرمی
سب کے سینوں میں آگ سی تھی لگی

شعلۂ شوق کا وہ جوش و خروش
سننے والے تھے سب کے سب مدہوش

سب کے سب بیٹھے تھے ہمہ تن گوش
مثلِ دیوار ساکت و خاموش

سب کے چہروں سے تھی عیاں تحسیں
بیخودی بن گئی تھی داد آگیں

ناگہاں اہلِ بزم نے دیکھا
بادشاہ اپنے تخت سے اٹھا

اس کی گردن میں اک حمائل تھی
گوہرِ شاہوار کی تھی لڑی

جس کا ہر دانہ دُرِ یکتا تھا
ایک ایک موتی فخرِ دریا تھا

اس حمائل کو لے کے شاہ بڑھا
اور مدن کے گلے میں ڈال دیا

تھا مدن کے لئے یہ عینِ اکرام
کہ دیا شہ نے منتخب انعام

ساری محفل تو محوِ حیرت تھی
کامدی کو عجب مسرت تھی

نگہ قدرداں جو پھرتی تھی
وہ مدن کی بلائیں لیتی تھی

جب بھی ہو گا کمال آئینہ دار
وجد میں آئے گا فنِ ہم کار

کامدی نے مدن کا فن دیکھا
شوق نے اس کے بھی ہجوم کیا

اک ادا سے اٹھی وہ گل پیکر
صنعتِ اک نہالِ فتنہ ثمر

رشکِ شمشاد، قامت آرائی
فخرِ صد جام، فتنہ پیمائی

جلوۂ حسن تھا شعور گداز
رقص تھا یا کہ برقِ شعلۂ ناز

تیغِ عریاں تھی وہ کہ برقِ تپاں
مرغِ بسمل تھے سارے پیر و جواں

چشمِ مست اور اشارۂ ابرو
رنگ تھے اور وحشتِ آہو

غنچۂ لب کھلا، بہار آئی
دل کی ایک ایک مراد بر آئی

دستِ رنگیں سے جب اشارہ کیا
دامنِ شوق پارہ پارہ کیا

پائے نازک مثالِ آبِ رواں
گردشِ رقص، گردشِ دوراں

گردشیں رفتہ رفتہ تیز ہوئیں
شوخیاں فن کی، شعلہ بیز ہوئیں

اتنی جولانی آئی گردش میں
نہ رہا فرق دامن و پا میں

فرقِ آرام و رم معمّا تھا
پاؤں دامن تھے اور دامنِ پا

شمعِ روشن کی طرح تھی رخشاں
بزمِ عیش و طرب میں نور افشاں

تھا ہر اک کے لئے نیا انداز
تھے سبھی اہلِ بزم کشتۂ ناز

بانکپن سے اٹھا دیئے جو ہاتھ
جھک گئیں گردنیں نیاز کے ساتھ

کی جو شوخی سے اس نے وا آغوش
ہوا لبریز ناز، بر، برد و دوش

ساری محفل تھی آئینہ خانہ
ہر طرف بس اسی کا تھا جلوہ

پاس بھی تھی، اور دور بھی تھی
سب کے پہلو میں تھی، چھلاوہ تھی

ہوش ایسے میں کس کو آتا راس
نہ رہے تھے بجا کسی کے حواس

سب تھے مسحور، سحر کاری سے
بے خبر تھے جنوں نگاری سے

مدن اس درجہ محو بے خود تھا | پڑ گیا عقل و ہوش پر پردا
بادشاہ غیور کا انعام | لے کے اٹھا بصد ہزار اکرام
پاؤں میں کامدی کے ڈال دیا | رہ حمائل کا قیمتی تحفہ
سرفرازی ہیں جو بلا ہے مجھے | تیری پازیب ہو تو فخر کرے
اپنی کم مائگی سے ہے مجھے عار | ورنہ کردیتا جاں بھی تجھ پہ نثار
شہ کو یہ بات ناگوار ہوئی | شبنم لطف جوں شرار ہوئی
بادشاہ کی جوں ہی چڑھی تیوری | بزم عیش و طرب میں آگ لگی
اپنی توہین پر جو غصہ تھا | سب سے پہلے یہ اس نے حکم دیا
نازیبا نے نگاؤ پہلے اسے | اور پھر شہر سے نکالو اسے
یہ ہے بزم شہان ملک وقار | بے ادب کو یہاں ملا کیوں بار
دو ٹکے کا گویا، یہ جرأت | شاہ سے ہمسری کی ہے ہمت
پاس تشریف شہ کو بھول گیا | دار پر سر ہو اس کا یہ ہو سزا
خودسری کی سزا ابھی دیجائے | دیر اس میں ذرا نہ کی جائے
اس کو اس ملک سے دفعان کرو | اس کا سایہ بھی مملکت میں نہ ہو
"اور یہ نابکار گر ٹھہرے | کچھ ذرا بھی جو قیل و قال کرے
"کوتوال اپنی تیغ سے لے کام | اس کا سر اس سے آگے ہو دو گام
"گر کسی نے بھی کچھ سفارش کی | خیریت پھر نہ جاننا اس کی
"مانگی مہلت کسی نے گر اس کی | مہلت زندگی تمام ہوئی
تھی زباں کس کے منہ میں جو کہے | اپنے سرشاہ کا عتاب جلے
دیکھتے دیکھتے بساط الٹی | سب نے چپکے سے راہ لی اپنی
فوجیوں کا گروہ آپہنچا | پاس انساں جنہیں نہ خوف خدا
اس نے بیتیں آئے ظلم و سختی سے | کھینچ کر لائے انجمن سے اسے
محفل عیش و بزم عشرت سے | ہائے کیا یادگار لے کے چلے
شمع خاموش کی طرح پائی | ذلت و تیرگی و رسوائی
آئے تھے شان سے تو یوں نکلے | کیوں نہ پہلے ہی کاش مرجاتے

بلا شبہ اجاڑ دشت ستم | جو بنا کار دار رنج و غم

دلبر شوخ سے ہوا مہجور | رہ گیا وصل کا نہ کچھ مقدور
جنگلوں جنگلوں پھرا مارا | پھر بھی شوق تماشا کم نہ ہوا
ساتھ پڑتا جب صعوبت سے | دیکھتا پیچھے مڑ کے حسرت سے
کانٹے چبھتے تو حوصلہ بڑھتا | پاؤں بر دوش آبلہ رکھتا
ہو کے بیدم کبھی جو گر پڑتا | خود کو آگے گھسیٹتا رہتا
مدتوں خار و خس کا ساتھ رہا | آخرش اس درخت تک پہنچا
دیکھا نخل مراد کا سایہ | ہو کے بے سدھ وہیں پہ بیٹھ گیا
بیخودی اس قدر بڑھی اس کی | نہ رہا ربط باتوں میں باقی
جب بھی اس نے کبھی زباں کھولی | سامنے کامدی نظر آئی
کوئی پتا بھی گر کھڑک جاتا | ہو کے بے اختیار کہہ اٹھتا
"اے صنم! اس قدر بھی کیا شوخی | کوئی حد بھی ہے آزمائش کی
کوئی ہرنی جو پاس سے گزری | دل مجروح پر بری گزری
کہتا "کیوں مجھ سے دور بھاگتا ہے | کون ہے اس جگہ جو ڈرتی ہو"
کبھی اپنے سے ہم سخن ہوتا | چونک کر اپنے آپ سے کہتا
"اے مدن! اس جگہ سے مت جانا | کامدی نقش ہے یہیں دیکھ اس جا
اک جنوں کی تھی کیفیت طاری | اپنے آپے کی کچھ خبر ہی نہ تھی
بے خودی میں کبھی یہ چلاتا | "کامدی! کیوں مجھے بھلا ہی دیا
"کیا ضرورت کہ تو بلائے مجھے | جان من! میں تو پاس ہوں تیرے
کبھی کہتا کہ "لطف ورد نہ کر | عشق نازاں اس قدر نہ کر دلبر
"دل مجروح پر کرم ہوگا | ڈال دے سایہ اپنے آنچل کا
"تن مردہ میں جان پڑ جائے | آرزو صحیح جوان ہو جائے
"یا تو پھر کر کوئی ترانہ سنا | سخت دل کو کر دے خاکستر
"اب کہاں تاب انتظار بھلا | باد و شیراز غبار بھلا
کبھی کہتا "یہ کیا کیا ظالم | ایک فتنہ بپا کیا ظالم
ہے کچھ ویرانی و خانہ خراب | کیا مروت میں ہو گا [illegible]
کبھی کہتا کہ آ تو پاس آ جا | [illegible]

[illegible]

کہتا، مجھ سے دُور رہو — تم ہو بال، آگ سے پرے بیٹھو
کہتا، قریب آ جاؤ — بے خودی حد سے ہو سوا آؤ
رست آ مائی غبار سحر — نہیں محل کشش دم دیگر
بھی کہتا کہ میرا جی نہ جلا — میرے پہلو سے تو ابھی اٹھ جا
لطف، گل ندامت ہے — یہ محبت ہے یا قیامت ہے
بھی "ہاں" اور کبھی "نہیں" کہتا — کچھ بھی کہتا تو "کامدی" کہتا
جس حال میں بھی وہ رہتا — "کامدی" "کامدی" کہا کرتا
شوقِ بیتاب، ترجمان رہتا — نامِ معشوقہ بر زباں رہتا
شعلہ شوق کی تب و تابی — سارے جنگل میں ایک آگ لگی
سب وحوش و طیورِ صحرا کے — ہو کے حیرت زدہ سنا کرتے

اس کے نالے سے آشنا جو ہوئے — کیا قلم "کامدی" نوا جو ہوتے
صد زباں اور اک سبق ٹھہرا — "منطق الطیر"[1] اک ورق ٹھہرا
"کامدی" کہنے کے نئے سو ڈھنگ — ایک مہوش کے جلوہ صد رنگ
اِک زمانہ اسی طرح گذرا — سال بھر تک یہی طریق رہا
بے خور و خواب جو ہوئی تھی بسر — تاب و طاقت کا کچھ رہا نہ اثر
ہوگئی آہ، یک شمار نفس — صبح خمیازہ، یا غبارِ نفس
اس قدر بڑھ گیا تھا ضعفِ قویٰ — ہاتھ ہلتا نہ پاؤں ہلتا تھا
اتنی مشکل سے سانس آتی تھی — ہر نفس اِک عذاب ہوتی تھی،

زندگی کا نہ تھا اگرچہ نشاں
زندۂ عشق تھا تو موت کہاں

[1] منطق الطیر خواجہ فریدالدین عطار کی تصنیف ہے جس میں انھوں نے پرندوں کو کردار بنا کر نصیحت آموز کہانیاں لکھی ہیں۔

باپو کا پیغام

وطن کو خلد بناتے ہوئے گذر جاؤ — پیامِ امن سناتے ہوئے گذر جاؤ
سُنا گیا جو اہنسا کی بانسری والا — مگر وہ ترانے وہ گاتے ہوئے گذر جاؤ
کچھ اس طرح سے کرو پریم بھاؤ کی باتیں — دِلوں میں رنگ جماتے ہوئے گذر جاؤ
تمام دُنیا کی قوموں کے جنگبازوں کو — سکوں کی راہ دکھاتے ہوئے گذر جاؤ
جو لال قلعے پہ لہرا دیا ہے نہرو نے — ترنگا جھنڈا اُڑاتے ہوئے گذر جاؤ
کئے جو قومی حکومت نے نیک منصوبے — سپھل اُنھیں کو بناتے ہوئے گذر جاؤ

امیر زیست کی راہوں سے موت کی حد تک
وطن کا مان بڑھاتے ہوئے گذر جاؤ

امیرالدین امیر دہلوی

غزل

حضرت شاد عارفی رامپوری
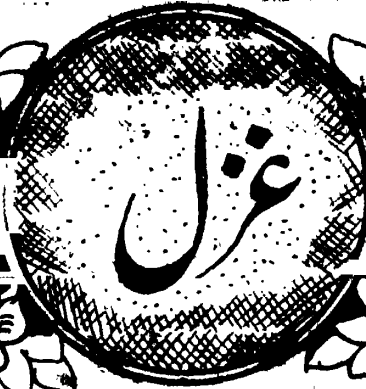
مری نظر سے جھلکتی ہے چشمِ مستانہ
"گرا گرا کے عطا ہو رہا ہے پیمانہ!"

جنابِ شیخ کی حجت خلافِ میخانہ
جو سعیٔ خام میں الجھا رہے وہ دیوانہ

وہاں پہونچ کہ جہاں بندگی کی شرط نہ ہو
وہاں ٹھہر کہ نہ کعبہ رہے نہ بتخانہ

شفق ہیں گلشنِ شاداب میں شبابو نہیں
کہاں کہاں ہے مقامِ شراب میخانہ

وہ انجمن جسے فرزانگی نصیب نہیں
وہ انجمن جو سمجھتی ہے مجھکو دیوانہ!

"نسیمِ صبحِ چمن" "ناگوار گزرے گی"
اگر نشاطِ مناظر سے دل ہے بیگانہ

یہ مانتا ہوں کہ ساقی نہیں خسیس مگر
مجھے یہ "کہہ نہیں بنتا" ادھر بھی پیمانہ

نثارِ شمع ہوئے جا رہے ہیں پروانے
"یہ زندگی ہے تو اب پھینکتا ہوں پیمانہ"

مرے کلام کو اے شاد وہ نہ سمجھیں گے
"جنھیں شراب پلاتے رہو تو فرزانہ"

چمن
از علامہ انور صابری
نشاطِ بیز و طرب خیز و عیش بارِ چمن
"خوشا نصیب میسر ہوئی بہارِ چمن"
نگاہِ شوق کا سرمایۂ تجمل ہے
کلی کلی کی ادا جانِ خلد زارِ چمن۔
اسے بھی دل میں جگہ دو باخرامِ خیال
گلوں کی گود میں پلتا رہا ہے خارِ چمن
خزاں کے دور کا آئے نہ تذکرہ لب پہ۔
"اگر ہے مدِ نظر عظمت و وقارِ چمن"
شگفتہ رنگ ہیں غنچے نشاط ریز ہوا
نہ کیوں عزیز ہو یہ دورِ کامگارِ چمن
چمن کا عشق نہ نکلے کبھی دماغوں سے
رہے جو دامنِ احساس پر غبارِ چمن
جو انتظارِ بہاراں میں کٹ گئی انور
وہ زندگی ہے دخیلِ مزاجِ کارِ چمن

شیراز ہند

از قلم جناب آقای دکتر علی اصغر حکمت
سابق وزیر محترم امور خارجہ۔ دولت شاہنشاہی ایران

فارسی سے ترجمہ :۔ سفیر انجم

۱۹۵۳ء میں ہندوستان آنے کے بعد میں نے اکثر و بیشتر سنا کہ اس برصغیر میں ایک شہر ایسا بھی ہے جسے "شیراز ہند" کہتے ہیں۔ چونکہ میں خود شیرازی ہوں اس لئے میرے دل میں قدرتی طور پر یہ جذبہ پیدا ہوا کہ اسے دیکھوں۔ معلوم کرنے سے پتہ چلا کہ یہ شہر اُتر پردیش کے جنوب مشرق میں بنارس سے تقریباً تینتیس میل دور واقع ہے اور اسے جون پور کہتے ہیں۔ اس لئے ہزاروں تمنائیں دل میں لیکر اور تاریخی واقعات کی حقیقت معلوم کرنے کی غرض سے میں نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ سامان سفر تیار کیا۔

وہاں میں نے بہت سے مدرسے، مسجدیں اور یادگار عمارتیں دیکھیں اور اس طرح کافی مواد جمع کر لیا تاکہ ایشیا کے ان دو ادب پرور مقامات یعنی شیراز اور جون پور کا مقابلہ کروں۔

مجھے خوشی ہے کہ ان چند سطور کو " . . . . پڑھنے والوں کے لئے پیش کر رہا ہوں۔

موجودہ جون پور

ہندوستان کے قدیم نقشہ میں دریائے گومتی کے کنارے اس جگہ جہاں اب جونپور بسا ہوا ہے ایک قصبہ آباد تھا جس کا اب نام و نشان تک موجود نہیں۔ اس کا پُرانا نام صرف ایک بھولی ہوئی کہانی ہو کر رہ گیا ہے۔ موجودہ جونپور یا جوانپور اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ ہندوستانی برہمن اس قدیم قصبہ کا حسب نسب ایک عالم و فاضل رشی جمادگنی سے ملاتے ہیں جو قدیم زمانے میں وہاں رہتا تھا۔ اس کے پیدا ہونے کی جگہ کا نام جمادگن پور رکھا گیا۔ کثرت استعمال اور زبان کی اُلٹ پھیر سے اس کو آسان اور چھوٹا بنا کر جونپور کی شکل دے دی۔

اس شہر میں لال دروازہ مسجد کے ایک ستون پر سنسکرت میں ایک کتبہ درج ہے جس میں ایک لفظ یامو نیایم پور الکھا ہوا ہے بعض مورخین کا خیال ہے کہ اس شہر کا پُرانا نام یہی ہے۔ بہرحال مسلمان مورخین کی متفقہ طور پر یہ رائے ہے کہ جونپور کا موجودہ نام فیروز شاہ تغلق کے زمانے میں پڑا اور حقیقت میں وہی اس کا بانی بھی تھا کہا جاتا ہے کہ اس کے چچا زاد بھائی محمد تغلق کو پیار میں جونا کہتے تھے اس کے بعد جب فیروز شاہ تخت پر بیٹھا تو اپنے ایک سفر کے دوران میں اس نے اس جگہ قیام کیا اور وہاں اپنے بھائی کی روح کو خواب میں دیکھا جو اس سے التجا کر رہی تھی کہ وہ ایک شہر کی بنیاد ڈالے اور اسے اپنے کے نام نامی سے معنون کرے۔ اپنے خواب کو حقیقت کا جامہ پہنانے کے لئے فیروز شاہ نے ایک شہر تعمیر کرایا اور اس کا نام جوناپور رکھا۔

ہندوؤں میں ایک پرانی کہانی مشہور ہے کہ جب اجودھیا میں رام چندر جی کا راج تھا تو انھوں نے ایک دیو سے لڑائی لڑی اور اسے موت کے گھاٹ اُتار دیا پھر انھوں نے دریائے گومتی کے بائیں کنارے پر ایک مندر کا سنگ بنیاد رکھا رفتہ رفتہ اس کے چاروں طرف آبادی بڑھنی شروع ہو گئی اور جلد ہی وہ ایک آباد شہر ہو گیا۔ جب فیروز شاہ تغلق نے اس قدیم شہر کو فتح کیا . . . . بھاری بھاری پتھروں اور ستونوں سے اپنے اس نو آباد شہر کے لئے ایک قلعہ تعمیر کرایا۔ یہ بات ضرور ہے کہ فیروز شاہ کے زمانے سے مسلمان بادشاہوں نے اس شہر میں عالی شان محل اور قابل قدر مساجد تعمیر کرانے میں انھی گرد و نواح کے . . . پتھروں سے فائدہ اُٹھایا۔

آج کل بھی غیر اسلامی تہذیب کے زمانے کے تراشے ہوئے

پتھر اور کتبے ان مساجد کے پتھروں میں اکثر ملتے ہیں فی الحقیقت اس شہر کی کل تاریخ کا دارو مدار ہی ان پتھروں پر ہے جو یہاں کی مساجد کی دیواروں میں آویزاں ہیں کیونکہ ان دیواروں میں چھپے ہوئے پتھروں میں سے اکثر و بیشتر کسی نہ کسی یاد کو تازہ کرتے اور کوئی نہ کوئی پیغام ہم تک پہنچاتے ہیں۔

خاندان شرقیہ

۱۳۵۹ء (۷۶۰ھ) میں فیروز شاہ نے بنگال پر حملہ کرنے کا قصد کیا اور ایک فوج جمع کر کے وہاں کے لئے روانہ ہوا۔ برسات کے موسم میں اس نے ایک ایسے مقام پر پہنچ کر ڈیرہ ڈالا جہاں ہندوستان کی سڑک کلاں گومتی ندی کو پار کرتی ہے وہاں اس نے خواب میں اس شہر کے تعمیر کرنے کی بشارت پائی اور اس کا نام جونپور رکھا۔

آٹھویں صدی ہجری کے ختم کے قریب تغلق سلطنت کا زوال شروع ہوا۔ اس خاندان کے ایک امیر جس کا نام ملک سرور تھا اور جسے دربار میں کافی مقبولیت حاصل تھی بہت طاقت جمع کر کے "خواجہ جہان" کا خطاب حاصل کر لیا اور تغلق سلطنت کے مشرقی حصہ پر قبضہ جما بیٹھا بعد میں اس نے اپنے آپ کو "ملک الشرق" کے نام سے مشہور کیا۔ پورے طور پر خود مختار ہونے کے لئے اس نے اپنا پایۂ تخت بھی دہلی کے بجائے جونپور بنایا اور ۱۳۹۴ء (۷۹۶ھ) جونپور میں سکونت اختیار کر لی۔ اس کی وفات کے بعد اس کا متبنّٰی لڑکا مبارک شاہ ۱۳۹۹ء (۸۰۱ھ) میں اس کے تخت کا وارث بنا۔ یہ ملتان کے سیّد خاندان سے جو دہلی پر حکمرانی کرتے تھے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے بعد شمالی ہندوستان کے دوسرے مسلمان حکمران وہاں "ملک المشرق" کے نام سے حکومت کرتے رہے اس طرح یہ خاندان "شرقی" کہلایا۔ اس کی حکومت کی حدیں بہت وسیع تھیں اور موجودہ بہار اور اتر پردیش کا صوبہ بھی اس میں شامل تھا۔

شرقی خاندان کے حکمران جونپور پر آزادانہ نویں صدی ہجری تک حکومت کرتے رہے۔ ۱۴۷۸ء (۸۸۳ھ) میں سلطان سکندر لودی نے سلطان حسین شرقی کو شکست دیکر اس خاندان کا خاتمہ کر دیا۔

ابراہیم شاہ مشرقی

شمس الدین مبارک شاہ کے بعد اس کا چھوٹا بھائی ابراہیم ۱۴۰۲ء (۸۰۵ھ) میں تخت پر بیٹھا۔ وہ ہندوستان کے ان نامور بادشاہوں میں سے ہے جنھوں نے اسلامی تہذیب کا پرچم اونچا کر کے اور اسلامی علوم و ادبیات کو نیا جامہ پہنا کر تاریخ میں اپنے لئے ایک نمایاں مقام حاصل کیا اس کے زمانہ میں جونپور کی آبادی بڑھتی گئی اور اس کو "شیراز ہند" کہنے لگے۔[1]

اس کا دور حکومت ۱۴۰۲ء (۸۰۵ھ) سے شروع ہو کر ۱۴۴۰ء (۸۴۴ھ) میں ختم ہوا اپنے دور حکومت کے شروع اور قریب قریب اختتام پر اس نے دہلی کے تغلق بادشاہوں اور بنگال اور مالوہ کے حکمرانوں سے بہت سی لڑائیاں لڑیں۔ لیکن اس کے دور کے درمیانی حصہ کے تقریباً پندرہ سال (۱۴۱۸ء یعنی ۸۲۱ھ سے ۱۴۳۳ء یعنی ۸۳۶ھ تک) سارے شمالی ہندوستان میں نہایت پر امن طریقہ سے گذرے۔ اسی . . . . . دور میں اس علم دوست بادشاہ نے اپنی توجہ ملک کی خوشحالی اور بہبودی علم و ادب کے انتشار۔ عالموں کی پرورش۔ مدرسوں اور مسجدوں کی تعمیر کی طرف مبذول کی۔ اس کا دارالسلطنت علم و ادب کا گہوارہ بن گیا اس نے اس شہر میں ایک ایسی سنگ بنیاد رکھی جس کی وجہ سے آج بھی پانچسو سال گذر جانے کے باوجود یہ شہر شمالی ہند میں اسلامی تہذیب و تمدن کا مرکز بنا ہوا ہے۔

ابراہیم شاہ کے بعد بھی اس کے جانشینوں مثلاً محمود شرقی (۱۴۴۰ء سے ۱۴۹۰ء تک) اس کی ملکہ راج بی بی اور حسین شرقی نے جو جونپور پر ۱۵۰۰ء یعنی ۹۰۶ھ تک حکومت کرتے رہے باوجود اپنا بیشتر وقت جنگوں اور قتل و غارت گری میں گذارا تاہم اپنے آباؤ اجداد کی اس روایت کو ہاتھ سے نہ جانے دیا اور علم و ادب کی پرورش اور ترغیب کرتے رہے اور مسجدیں اور مدرسے بنوائے۔

ماضی کے افسانے دہراتے رہتے ہیں

اکثر و بیشتر تاریخ میں ایسی مثالیں ملتی ہیں جو اس بات کی [illegible] ہیں کہ جب نا اہل حکمراں تہذیب یافتہ طبقہ پر حکومت کرتے ہیں تو [illegible]

[1] [illegible] ہندوستان کے [illegible] کا [illegible] اس کے [illegible] نے صرف اسی کی پیروی کی۔

شدہ حصے کے عالم و ہنرمند ۔۔۔۔ ہجرت کرکے دوسرے حصوں میں چلے جاتے ہیں اور اپنے ادبی شاہ پاروں ہنر اور تہذیب سے اس قوم کو مالا مال کر دیتے ہیں اس طرح سے یہ جھلملاتی ہوئی روشن شمعیں ایک ملک سے دوسرے ملک تک اور ایک حصّہ سے دوسرے حصہ تک اپنی روشنی پھیلاتی اور اپنے لافانی نور سے دنیا کو منور کرتی ہیں سی طرح ہندوستان میں بھی چودہویں صدی عیسوی میں (نویں صدی ہجری) جبکہ تیمور نے سلطان محمد تغلق کے پایۂ تخت دہلی پر حملہ کیا اور وہاں کے عالموں ہنرمندوں اور صوفیوں کو تہ تیغ کرنا شروع کیا تو وہ فلسفی اور عالم جو دہلی میں غوری اور خلجی بادشاہوں کے زمانے سے جمع ہو رہے تھے اس نیم مسمار اور نیم آتش گرفتہ شہر کو نہایت ہی بے سر و سامانی کی حالت میں خیرباد کہہ گئے۔ یہ ہی وہ دَور تھا جب کہ آسمان ادب کا جگمگاتا ستارہ ابراہیم شرقی جونپور کے تخت پر جگمگا رہا تھا اور اپنے بے پایاں نور سے علم و ہنر کی سمتوں کو روشنی بخش رہا تھا۔ اس لئے یہ شہر مہاجرین کے لئے مہمان خانہ بن گیا اور ہزاروں کی تعداد میں ماہرین فن یہاں جمع ہو گئے۔

جونپور کی مَساجد

ایران کے بادشاہوں میں سے کسی نے بھی کبھی یہ خیال نہ کیا ہوگا کہ ہندوستان کی دور دراز سرزمین پر شیراز کی مساجد کی طرح نویں صدی ہجری میں مسلمان بادشاہوں نے یہاں بھی مسجدیں بنوائی ہوں گی۔ صناعی اور زیبائش کے اعتبار سے جن کا مقابلہ ایران کے مراکز ادبی کی مساجد سے بہ آسانی کیا جا سکتا ہے حقیقت میں صرف اعلیٰ مساجد کا وجود ہی کافی ہے جس کی وجہ سے جونپور کو "شیراز ہند" کا لقب دیا گیا۔ کیونکہ ان مساجد سے نہ صرف ایک عبادت گاہ کا کام لیا جاتا تھا بلکہ یہ علم و فن کا گہوارہ بھی تھیں۔ صناعی کے اعتبار سے بھی یہ خاص توجہ کی حامل ہیں۔

ان مساجد میں سب سے قدیم "اتالا مسجد" ہے ۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔ روایات سے پتہ چلتا ہے کہ جب فیروز شاہ تغلق نے جونپور شہر کی بنیاد رکھی تو ۔۔۔۔۔۔

ایک مسجد بنوانا شروع کی (۱۳۷۶ء مطابق [illegible]) لیکن وہ اپنے دوران حیات میں تکمیل نہ دے سکا۔ لیکن ابراہیم شرقی نے فیروز شاہ کی اس خواہش کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا (۱۴۰۸ء مطابق ۸۱۱ھ)۔ جب اس مسجد کا سنگ بنیاد رکھا گیا تو اس کے لگ بھگ شیراز میں جامع عتیق کا سنگ بنیاد رکھا گیا تھا ([illegible])۔ اتالا مسجد پتھر اور چونے کی بنی ہوئی ہے اور اس میں عربی و فارسی کے نو کتبے درج ہیں۔ عربی کتبے قرآن کریم کی آیات سے مزین ہیں اور فارسی کتبوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس مسجد کا سنگ بنیاد کب رکھا گیا تھا۔

خالص مخلص اور جھنجھری مساجد

ابراہیم شاہ شرقی کے دور حکومت میں دو امیروں نے ۱۴۳۰ء میں ان دونوں مسجدوں کو تعمیر کرایا تھا۔ صناعی کے اعتبار سے یہ اتالا مسجد سے ملتی جلتی ہیں اور یہ بھی قدیم ۔۔۔۔۔۔۔ کھنڈرات پر تعمیر کرائی گئی ہیں۔ جھنجھری مسجد کا بانی سید خواجہ سعد عثمانی شیرازی تھا۔ یہ دہلی کے ان شیخوں میں سے تھا جو وہاں سے ہجرت کرکے جونپور آ گئے تھے۔ بڑے افسوس کا مقام ہے کہ یہ دونوں مسجدیں بڑی بُری حالت میں ہیں اور ان کی مرمت یا تحفظ کی طرف کوئی توجہ نہیں کی جاتی رہی۔

لال دروازہ مسجد

چونکہ اس مسجد کا دروازہ سُرخ پتھر کا بنا ہوا ہے اس لیے اس کو لال دروازہ مسجد کہتے ہیں۔ اس مسجد کی بانی ملکہ بی بی راجے تھی جو سلطان محمد شرقی کی درباری رقاصہ تھی (۱۴۵۰-۱۴۴۴ء)۔ صناعی کے لحاظ سے یہ بھی اتالا مسجد کی طرح ہے لیکن اس میں وہ شان و شوکت نہیں پائی جاتی، اس مسجد کی تعمیر اس لئے کرائی گئی تھی کہ حرم کی بیگمات اس میں عبادت کر سکیں۔

جامع مسجد

اس مسجد کا بانی سلطان حسین شرقی تھا ([illegible]-۱۴۵۲ء) یہ شاہجہاں کی مساجد کے ان نمونوں کی [illegible]

صناعی کے اعتبار سے تغلق خاندان کے زمانہ سے مغلوں کے دور تک ۱۴۹۱ء ... عالموں نے بہت روکا لیکن ... سکندر لودی نے مسجد کے سیدھے بازو کو شہید کر دیا۔ بہر حال جونپور نے ان عالیشان مساجد کی وجہ سے جو ساٹھ سال کے ایک مختصر سے عرصہ میں تعمیر کرائی گئی تھیں اسلامی فن صناعی میں ایک نمایاں درجہ اور لاثانی شہرت حاصل کرلی ہے۔ اور اس طرح صناعی کے ایک مخصوص انداز کی تخلیق ہوئی جسے "جونپوری" کہتے ہیں اور یہ انداز تعمیر ایک شہر سے دوسرے شہر جاتا رہا اور ہندوستان کے مختلف اسلامی مراکز میں پھیل گیا۔

جونپور کا قلعہ

یہ قلعہ گومتی ندی کے کنارے پُل کے قریب بنا ہوا ہے۔ اس میں ایک نہایت ہی خوبصورت مسجد بھی ہے۔ جو صرف وہاں کے فرماں رواؤں کی عبادت کے لئے تیار کرائی گئی تھی۔ اس کے دو دروازے ہیں جن میں سے ایک قدیم ہے۔ اور دوسرا منعم خاں نے تعمیر کرایا تھا۔ ابراہیم نے جسے "نائب باربک" کہتے تھے اور جو فیروز شاہ کا بھائی تھا اس کی بنیاد رکھی تھی (۷۷۸ھ یا ۱۳۷۶ء)

. . . .

. . . . قلعہ کے اندر ایک مینار ۵۰ فٹ بلند ہے اس کے اوپر سے لہلہاتے ہوئے کھیتوں سرسبز میدانوں اور بہتے ہوئے دریاؤں کا منظر نہایت خوشگوار معلوم ہوتا ہے۔ تماشا کرنے والے ایک وقت کے لئے بھول جاتے ہیں کہ ان شاہی عمارتوں کے جنوب اور قلعہ کے جنوب و مغرب میں وہ کھنڈر بھی ہیں جو کسی زمانہ میں اپنی مثال آپ تھے۔ ان ہی کھنڈر میں سے ایک جگہ کا نام جہیل ستون ہے جسے ابراہیم شاہ نے بنوایا تھا۔ بہلول لودی کے حملہ کے زمانہ میں اس قلعہ کے دروازے مسمار ہوگئے تھے لیکن ان کو دوبارہ ایک نہایت ہی خوبصورت انداز میں اکبر کے دور حکومت میں خان خاناں منعم خاں نے ۹۷۶ھ میں بنوایا۔ اس میں ایک صحن بھی ہے خوبصورت دروازہ اینٹوں سے بنا تھا اور اس پر خوبصورت ٹائل لگے ہوئے تھے۔ اس دروازہ پر فارسی نثر میں ایک کتبہ درج ہے جس پر تاریخ ۔۔ ربیع الاول ۱۰۱۱ھ پڑی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بعد میں بنایا گیا تھا۔

دو پُل

شیراز اور جونپور دونوں جگہ دو دو پُل ہیں۔ پہلا شہر کے شمال میں اور دوسرا شہر کے وسط میں۔ حمل و نقل کے اعتبار سے دونوں پُل بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ شہر کو دوسرے ان راستوں سے ملاتے ہیں جو دوسرے اہم شہروں کو جاتے ہیں حالانکہ شیراز کے پل صناعی یا تاریخی اعتبار سے کوئی وقعت نہیں رکھتے لیکن جونپور کے پل دونوں ہی طرح سے ایک خاص اثر کے ماتحت تعمیر کئے گئے ہیں۔

جونپور کا وہ پل جو گومتی ندی پر ہے ایک خاص واقعہ کے ماتحت بنا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مغل اعظم اکبر بادشاہ کس قدر منصف مزاج تھا اور اپنی رعایا کو خوش رکھنے کے لئے کیا کیا کرتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ شرقی سلطانوں کے زمانہ میں دریا کو پار کرنے کے لئے صرف ایک عارضی پل تھا جسے چھوٹی چھوٹی کشتیوں کو ملا کر بنایا گیا تھا۔ تقریباً ۱۵۶۷ء میں اکبر جونپور گیا اور شام کے وقت کشتی میں سوار ہوکر دریا کی سیر کر رہا تھا کہ اس نے ایک غریب عورت کو دیکھا جو دریا کے کنارہ بیٹھی رو رہی تھی۔ جب اس سے رونے کی وجہ معلوم کی گئی تو اس نے بتایا کہ اس کا گھر دریا کی دوسری جانب ہے اور اس کے پاس وہ ذرائع نہیں جن سے وہ دریا پار کرسکے۔ اکبر یہ بات سن کر بہت متاثر ہوا اور اسے شاہی کشتی میں بٹھا کر دریا کے پار اُتار دیا۔ اس واقعہ کے اگلے روز اس شہر کے حاکم منعم خاں کو اکبر نے حکم دیا کہ اس جگہ جہاں اس بڈھی عورت نے آنسو بہائے تھے ایک پل تعمیر کرائے۔ منعم خاں نے حکم کی تعمیل کی اور پل کا نام پل اکبری رکھا اور آج بھی یہ پُل اس نام سے پکارا جاتا ہے۔

مہدیت کے دو دعویدار

شیراز اور جونپور نے تاریخ کے تقریباً ۲۵ سال کے وقفہ میں دو ایسے سید پیدا کئے جنھوں نے مہدیت کا دعویٰ کیا حالانکہ ان لوگوں نے جو کہ جونپور کو شیراز ہند کہتے ہیں اس نکتہ کی طرف غور نہیں کیا لیکن پھر بھی ... کے زیر نظر ان دونوں شخصیتوں کا وجود دلچسپ ہے۔ ... ایک صدی ہجری کے تقریباً وسط میں ایک شخص سید محمد

جونپوری نے مہدویت کا دعویٰ کیا۔ مورخین کا خیال ہے کہ یہ شخص سید خان جونپوری کا لڑکا تھا جو ۸۴۷ھ میں پیدا ہوا تھا۔ اس نے شیخ دانیال سے جو کہ اس زمانہ کا نامور فلسفی اور ماہر تعلیم تھا علم حاصل کیا۔ اپنی خداداد ذہانت کی وجہ سے اس نے سات سال کی عمر میں قرآن شریف حفظ کر لیا۔ اور بارہ سال کی عمر میں ابتدائی تعلیم ختم کر کے اسد العلماً کا خطاب حاصل کر لیا۔ شروع شروع میں تو وہ صوفیوں کے چشتیہ طبقہ سے ملحق ہو گیا اور سید محمد گیسو دراز کی رہبری میں ہندوستان کے دوسرے حصوں کا سفر کیا۔ سلطان محمد کو جو دانا پور کا نواب تھا اس پر کافی عقیدہ تھا۔ سید محمد جونپوری نے ایک جنگل میں گوشہ نشینی اختیار کر کے مالوا، گجرات اور سندھ میں تبلیغ شروع کر دی ۹۰۱ھ میں وہ حج بیت اللہ کے لئے مکہ معظمہ گیا اور واپس آنے پر گجرات) احمد آباد میں سکونت اختیار کی شیخوں اور مولویوں نے اس کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا اور اسے اپنے شہروں سے نکال دیا۔ پھر وہ سندھ ناگ[illegible] اور نصیر پور وغیرہ کی طرف گیا اور اپنے کچھ ہم خیال پیدا کر لئے۔ پھر وہ اپنے ۳۰۰ ساتھیوں کو لیکر خراسان ہوتا ہوا قندھار پہنچا اور وہاں سے فرح (سیستان) پہنچا اور وہاں ایک سال تک قیام بھی کیا۔ اسی دوران میں ۹۱۰ھ میں وہ اس دنیای فانی سے کوچ کر گیا۔ ہندوستان اور پاکستان میں اس کے پیرو اب بھی پائے جاتے ہیں۔

مراکز ادب و دانش

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے نویں صدی ہجری (پندرھویں صدی عیسوی) میں جونپور ادب و دانش کا گہوارہ رہ چکا ہے اور اسی لئے اسے شیراز ہند کہتے ہیں۔ ابراہیم شرقی کے زمانہ میں بہت سے علما اور شیخ یہاں آئے اور اپنی خداداد لیاقت سے ادب و مذہب کی شمعوں کو روشن رکھا۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلا نام قاضی شہاب الدین محمد کا لیا جاتا ہے۔ یہ دولت آباد کا (جو اورنگ آباد کے نزدیک ہے) رہنے والا تھا۔ یہ تیمور کے حملوں سے تنگ آ کر ۸۰۱ھ میں دہلی سے بھاگ کر جونپور آ گیا تھا۔ سلطان ابراہیم شرقی نے اس کو پناہ دی۔ اس نے ادبیات اور مذہبیات پر بہت سی کتابیں [illegible] ملک العلما [illegible] کے نام سے مشہور ہے۔ [illegible] کر [illegible] میں دفن کیا گیا۔

تاریخ فرشتہ سے پتہ چلتا ہے کہ ابراہیم شاہ کو علم دوست اشخاص اور علماء و فضلا سے کس قدر انس تھا۔ [illegible] ایک واقعہ مشہور ہے کہ ایک دفعہ قاضی شہاب الدین محمد بہت سخت بیمار پڑا۔ بادشاہ مریض کو دیکھنے کے لئے گیا اور اس کی حالت سے متاثر ہو کر اور اس کی تندرستی کی دعا کرتے ہوئے اس نے ایک پیالہ میں متبرک پانی بھر کر اسلامی اصولوں کے مطابق اس کے چہرہ اور جسم کے چاروں طرف گھما کر یہ کہتے ہوئے پی لیا "اے خدا تو اس کا روگ مجھے لگا دے لیکن اسے اچھا کر دے"۔ اس عقیدہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ بادشاہ کو عالموں سے کس قدر محبت تھی۔

ایک اور عالم شیخ الاسلام شیخ بہاء الدین شاہ مدار اس زمانہ میں جونپور بھاگ کر گئے اور پھر وہیں ۸۴۲ھ میں اپنی زندگی کی آخری سانسیں لیں۔ یہ حقیقت ہے کہ قاضی شہاب الدین کے زمانے سے جونپور میں اتنے علماء جمع ہوئے اور پیدا ہوئے کہ اگر ہر ایک کا حال لکھا جائے تو ایک کتاب بن جائے گی۔

بہرصورت یہ نہایت ہی نامناسب ہوگا کہ اس ذکر میں ایک بہت بڑے سادھو شاعر کبیر کا نام شامل نہ کیا جائے جو سولہویں صدی عیسوی میں پیدا ہوا اور ہندوستان میں طبع موزوں کی بلندگی کے لئے بہت کچھ مواد پیدا کیا۔ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد کی ایک بہت مضبوط کڑی تھا۔ کہا جاتا ہے کہ "سچائی" کی تلاش میں جو مسافرت کبیر نے کی اس کے دوران میں وہ جونپور بھی پہنچا اور وہاں کے شیخ تقی الدین مانکپوری سے جو تاریخ میں پیر تقی کے نام سے مشہور ہیں وابستگی اختیار کر کے ان کے قرب و فیض سے بہت کچھ فائدہ اٹھایا۔ اس کی اردو اور ہندی نظمیں اور غزلیں اسلامی تصوف اور "ویدانت" کی بہترین مثالیں پیش کرتی ہیں۔ جو ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے لئے دلکش ہیں۔

قطعہ

اے ساقی بادۂ محبت [illegible]
[illegible] دلستان [illegible]
[illegible]
[illegible]

نگار خانہ

جوش ملیسانی

اُٹھ دیکھ ذرا طلوعِ خورشید　　منظر یہ بہت ہے قابلِ دید

گُل بانگِ عنادلِ خوش الحاں　　خوشبوئے نسیم عنبر افشاں

شبنم کی گہر فشاں بہاریں　　بوٹوں کی ہری بھری قطاریں

سبزے کی زمُرّد آفرینی　　ہر گُل کی ادائے دل نشینی

گلشن ہے حسن کا خزانہ

قدرت کا عجب نگارخانہ

ناتمام

غزل
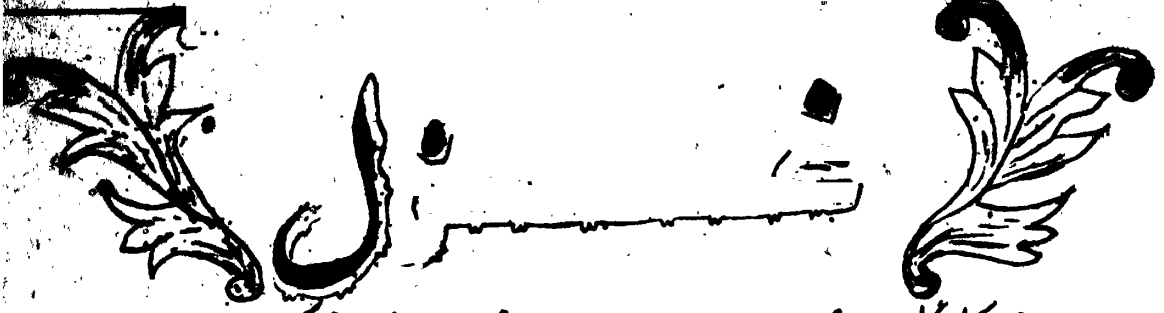
نہ صرف انکا مسئلہ نہ میری واردات ہے
شب فراق مشترک حدیث واقعات ہے

فراز دل پہ جلوہ گر یہ تخیلات ہے
میری شبِ فراق ہے کہ چودھویں کی رات ہے

ہے زندگی کے ساتھ غم تو کچھ نہیں حیات غم
حیات اک حباب ہے حباب کم ثبات ہے

نفس نفس کی جستجو سے تم ہو جانِ آرزو
شروعِ دورِ آرزو تو ایک نظر کی بات ہے

ترے ستم کو جان کر خلوص کہہ رہا ہوں میں
یہ بات بربنائے چند حسن واقعات ہے

کسی نے تم سے بیوفا کو خوب باوفا کہا
بہت حسین تبصرہ بڑی لطیف بات ہے

گزر رہی ہے رات تیرے گیسوؤں کے سائے میں
دماغ عشق بستۂ خمار التفات ہے

تری نظر کی جنبشیں ہیں میرے دل کی دھڑکنیں
کہ سلسلہ بسلسلہ نظام کائنات ہے

سکوں کی زندگی بھی ہے خیالؔ ایک حادثہ
نہ اس لئے کہ زندگی برائے حادثات ہے

خیالؔ رامپوری

عرضِ عجز و نیاز "رہنے دے" — زاہد "اپنی نماز- رہنے دے"

دیکھ اے چشمِ ناز "رہنے دے" — "مجھے وقفِ نیاز- رہنے دے!"

بت پر "آہوں کا کیا اثر ہوگا- — "میرے قلبِ گداز رہنے دے"

تو اٹھے گی تو حشر اٹھے گا- — نگہِ فتنہ ساز" رہنے دے"

بے پئے ہوں برائیاں مے کی، — زاہدِ کینہ ساز" رہنے دے"

وقتِ آخر نہ کر علاجِ غم! — اے میرے چارہ ساز" رہنے دے"

پی بھی جا آنکھ بیچ کر "واعظ" — ناجواز و جواز" رہنے دے"

چال میں اپنی اور قیامت میں — کچھ نہ کچھ امتیاز رہنے دے

اپنی محفل میں جامؔ کی جانب
دیدۂ نیم باز- "رہنے دے"

ہمہ تن آفتاب بن جاؤ
خلدِ حسن و شباب بن جاؤ
میں سراپا شراب نوش ہوں
تم مجسم شراب بن جاؤ

شدتِ غم میں آنکھ سے آنسو
خود بخود اس طرح ٹپکتے ہیں
جیسے پی کر کسی شرابی کے
ہر قدم پر قدم بہکتے ہیں

غم و آلام کی ہواؤں میں
یوں جوانی کی شمع جلتی ہے
جس طرح فرشِ سبزۂ گل پر
چاندنی نور بن کے ڈھلتی ہے

شاخِ گل پر بیٹھ کر بھونرا کوئی
مستیوں میں جھوم کر یوں گنگنائے
جس طرح سے میکدے میں مطربہ
دھیمے دھیمے ساز پر اک گیت گائے

سایۂ زلفِ ناز میں اے دوست
یوں جبیں پر تری پسینہ ہے
جس طرح سے کسی انگوٹھی پر
بیش قیمت کوئی نگینہ ہے

اعلامیہ

باطلاع مشترکین محترم کہ مدت اشتراک شان بپایان رسیدہ وحالاً وجہ اشتراک برای سال بعد بہ دفتر مجلہ ارسال نداشتہ اند میرسانند کہ پنج روپیہ زرسالیانہ بدفتر بفرستند، درصورت عدم وصول وجہ اشتراک، شمارہ آیندہ با پست قیمت طلب (و.پ.پ) فرستادہ خواہد شد کہ بہ پنج روپیہ ۱۲/5 دوازدہ آنہ خواہد شد۔

از اخلاق کریمانۂ آن محترم امید داریم کہ پست قیمت طلب را خواہند پذیرفت۔

جن حضرات خریداران کا چندہ ختم ہو گیا ہے یا ان کا چندہ سال رواں کے لئے دفتر کو موصول نہیں ہوا ہے۔ اطلاع دیجاتی ہے کہ آں محترم خصوصی توجہ فرما کر مبلغ پانچروپیہ چندہ سالانہ دفتر کو ارسال فرمادیں عدم وصول زرچندہ کی صورت میں آیندہ شمارہ ذریعہ وی۔پی۔ خدمت میں ارسال ہوگا جس کی قیمت ۱۲/5 ہوگی۔

جناب گرامی کے اخلاق کریمانہ سے امید ہے کہ وی۔پی وصول فرما کر ممنون فرمائیں گے۔

مدیر مجلہ آہنگ 310 چاوڑی بازار دہلی ۶

برای پاکستان:۔ آقای حیدر جمیل رضوی (برای آہنگ)

13/57 ویڈربرن روڈ۔ بمبئی ہاؤس۔ کراچی ۵

سید عظمت علی رضوی پرنٹر پبلشر نے الآزاد پریس سے چھپا کر دفتر آہنگ ۳۱۰ چاوڑی بازار دہلی سے شائع کیا۔

در آمیختن فرہنگ ما

الف

آهنگ دهلی

نگران: ڈاکٹر سید امیر حسن عابدی ایم۔ اے۔ پی ایچ۔ ڈی

مدیر مسئول: سبط علی سبط حکمت علی رضوی

جلد ۲ نمبر ۳ | بابت ماہ ستمبر ۱۹۵۹ء

قیمت فی کاپی: ۸ / سالانہ: پانچ روپیہ

۲۴ ستمبر ۵۹ء ویلادی — برادر محترم زید مجدہ الکرم! — سلام مسنون!

"آہنگ" کا استقلال نمبر نظر نواز ہوا۔ اس عنایت کیلئے بیحد مشکور ہوں۔ اب کی بار تو آپ نے بلند پایہ تحقیقات کا ایک ایسا خزانہ جمع کر دیا ہے کہ کئی بار پڑھ کر بھی طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ اللہ آپ کو جزای خیر دے۔ "آہنگ" کا یہ تدریجی ارتقاء اس کی تابناک مستقبل کا غماز ہے۔ فارسی افسانوں اور کہانیوں کا اردو ترجمہ شائع کر کے آپ نے ایک اہم قدم اٹھایا ہے اس سے ہند کے اردو داں طبقے کو فارسی ادب میں ہونے والے صنعتی اور فنی تجربوں سے استفادہ حاصل کرنے کا موقع میسر ہوگا۔ اور ساتھ ہی ایرانی عوام کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد ملیگی۔ میری رائے ہے کہ اردو کی منتخب کہانیوں کا فارسی ترجمہ بھی "آہنگ" میں شائع ہوا کرے تو بیحد مفید ثابت ہوگا۔ مولانا فطرت کاشمیری کی ایک تازہ غزل جو انھوں نے خاص "آہنگ" کیلئے لکھی ہے ارسال خدمت ہے۔ اسے "آہنگ" کے آیندہ شمارے میں شائع کیجیے۔ امید ہے آپ مع الخیر ہونگے۔ احکام لائقہ سے یاد فرمائیے گا۔

نیاز کیش فرحت گیلانی سکریٹری بزم ارباب ذوق کشمیر
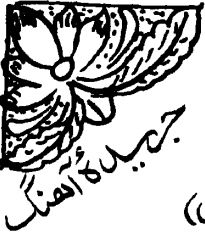
خاص برائے آہنگ

پرواز تخیل

(از رشحات قلم: مولانا میر فطرت کاشمیری)

مشت خاکی، از کف خاکم، سواد ماهتاب
قطرهٔ آبم، حباب بحر جانم، آفتاب

مرغ صحرایم بزیر عرش دارم آشیان
طائر قدسم بقاف قرب دارم دانهٔ آب

بر سر سدره دارد گمکتای وحدتم
کنزتم غرقاب گرداب است چون موج سراب

در مبادین محبت جرهٔ بازم، صف شکن
طوطیم شکر خورد و شکر سخن شکر جواب

بی عناصر میتوانم کرد تبدیل مزاج
مرغ آتشخوارهٔ ام آتش ز خاکم گشته آب

مست دیرم چون نمی نوشم شراب خانه ساز
کفر من ایمان بود، بیداریم، آرام خواب

در خمستان تخیل فکر من می می خورد
موج گردابم یم افکار من سیل شراب

عشقبازم، بت پرستم، باده نوشم، نغمه زن
غافلان معذور دارندم خرابم در خراب

طاعت و زهد ریائی را چه نازی زاهدا!
ره روی راه جنونم در طریقت بر صواب

من نمیگویم که بودم سالها طاعت فروش
آنچنان مستم نمیدانم گنه را از ثواب

دختر خبازهٔ بارا ستی شد، زلف کج
حلقهٔ عقد دلم ز آشفتگی در پیچ و تاب

از تبسمهای پنهانی هلاکم کرد و رفت
برد هم صبر و قرار و نقد عقل شیخ و شاب

خاک پای ناقهٔ لیلی ببوسم ره دهید؟
دست اگر نرسد که می بوسم بستی آن کاب

عاشقم، صوفی نژادم، شاعر حکمت بیان
تا نه پنداری که هستم بی هنر رند خراب

رازن مودم شعر خود بر لوح آئینه رقم
چشم دارم از نواسنج سخن حیرت جواب

نازها دارد غبار تربتم فطرت بحشر
خاکسارم در جهان از حب آل بوتراب

سخنهای گفتنی

موجب کمال افتخار و خوشوقتی است که بمناسبت روز تولد یک شخصیت بزرگ هند مهاتما گاندی شمارهٔ مخصوص آهنگ منتشر میشود۔

"پدر ملت هند مهاتما گاندی" در رأس استقلال طلبان هند قرار داشت و از راهنمائی های خردمندانه او بود که مردم رنجکشیدهٔ این سرزمین از اسارت بیگانگان نجات یافتند۔ خط مشی سیاست خارجه هند امروز مرهون همان مرد روشن فکر است و پیرو خاص وی پاندیت جواهر لال نهرو بر اثر حسن نیت، پاکی و امن دوستی خود بر قلوب هموطنان خود مسلط شده است۔ امیدواریم نخست وزیر محبوب ما بیش از پیش خود را با مساعی استقرار روابط دوستانه با ملل دیگر مشغول خواهند ساخت۔ نیز از ایشان انتظار داریم در ترویج و سرپرستی زبان و ادب اردو که محصول پر افتخار فرهنگ ایران و هند می باشد از بذل هیچگونه اعانت خودداری نخواهند کرد۔

از روز اجرای آهنگ تا انتشار شمارهٔ مخصوص استقلال آنچه دانشمندان ایران و هند از کوششهای ما طوری استقبال نموده اند که الفاظ از اظهار تشکر قاصر است۔ ما از همکاران دانشمند خود استدعا داریم همچنان مساعی خود را در سیراب کردن هزاران تشنگان ادب ادامه دهند، عصر جدید نیازمند هم آهنگی و محبت میان ملل جهان است و در راه انجام دادن این خدمت بزرگ آهنگ منتظر قلم توانای شما می گردد۔

از دانشمند گرانمایهٔ ایران جناب آقای دکتر علی اصغر [illegible] سفیر کبیر سابق در هند صمیمانه تشکر می کنیم که از [illegible] احساسات و تأثرات مخلصانه و تحقیقات [illegible] مفتخر میسازند۔

آج ہم ہندوستان کی عظیم شخصیت [illegible] کی یادگار کے طور پر اپنا خصوصی نمبر پیش کر رہے ہیں۔

مہاتما گاندھی ہندوستان کی اُن اعلیٰ [illegible] ہیں جنھوں نے شمع آزادی روشن کرنے کی جدوجہد [illegible] رہنمائی فرمائی تھی۔ درحقیقت ہندوستان کی [illegible] گاندھی جی کی ہی روشن دماغی کا عکس ہے جس کو [illegible] شاگردِ خاص پنڈت جواہر لال نہرو اپنے خصوصی [illegible] تحت کامیابی سے آگے بڑھا رہے ہیں اور اپنی [illegible] انتھک جدوجہد سے ہندوستانی عوام کے دلوں پر [illegible] ہمیں پوری اُمید ہے کہ وہ ربط و ضبط کے رشتوں [illegible] کرنے پر مزید غور فرمائیں گے۔ نیز ہندوستان [illegible] ہند و ایران کلچر سے پیدا شدہ ادب اردو کی [illegible] فرمانے میں کسی قسم کی ہچکچاہٹ محسوس نہ فرمائیں گے۔

آہنگ کے اجراء سے استقلال نمبر تک [illegible] دانشمندانِ محترم نے جس طرح ہماری مساعی کا [illegible] ہمارے پاس الفاظ نہیں کہ انکا شکریہ ادا [illegible] اپنے دانشورانِ محترم سے استدعا کرتے ہیں کہ [illegible] ہزاروں تشنگانِ ادب کو اپنے چشمۂ علم [illegible] کرنے کی جستجو فرماتے رہیں۔ موجودہ دور [illegible] اور خلوص کا تقاضا کر رہا ہے اور اس اہم خدمت [illegible] آپ کے پُرکار قلم پر نظر دوڑا رہا ہے۔

دانشورِ بزرگ ایران اُستاد محترم [illegible] سابق سفیر کبیر ایران در هند [illegible] ہندوستان کے [illegible]

(دکتر راجندرا پرشاد (رئیس جمهوری هند))

خدمت مهاتما گاندی به سیاست هند فوق العاده عظیم بوده است او توده‌های مردم هند را از نظر سیاسی شکلی پرورش داد که بخود شان اعتماد یافتند و آنها را بشکلی سازمان داد که هرگز پیش از آن چنین سازمانی نداشتند. معهذا این‌ها بزرگترین خدمت او نبوده است. بنظر من بزرگترین خدمت او به سیاست هند و شاید به تمام جامعهٔ زنجیر و ستمکش جهان آن بود که روشی تازه و منحصر بفرد برای مبارزه با بدی و زشتی و ظلم و تعدی بوجود آورد و بکار برد.

او بما آموخت که چگونه میتوانیم بدون سلاح با امپراطوری عظیم بریتانیا مبارزه کنیم و پیروز شویم. او برای ما و برای تمام جهان یک اصل اخلاقی را جانشین جنگ ساخت.

پیش از او سیاست یعنی سفسطه و نادرستی بود که در صورت پست خود شامل انواع دسته بندیها و تحریکات و دروغها میگشت و در عالیترین صورت هم از بکار بردن جملات زائد و دیپلماسی و عمل کردن سیاست‌های مخفی تجاوز نمیکرد.

گاندی سیاست را از این نظر پست و ناپسند به اوج عالی ایدآلیسم بالا آورد و به مقامی رساند که نتایج هرچند هم عالی و نجیبانه باشند در هیچ صورتی نمیتوانند توسل بوسایلی را که پاک و شایسته و منزه نباشد توجیه کنند. او حتی در سیاست هم حقیقت را بر کرسی افتخار نشاند هرچند هم که نتایج موقتاً زیان آور بنظر آید.

مهاتما گاندی بما آموخت که اگر ما همواره در فکر مرگ و ناامیدی باشیم و از آن بترسیم آنها در انتظار مان خواهند بود و بسراغ مان خواهند آمد اما اگر روح زندگی و آزادی در درون ما پرورش یابد زندگی و آزادی از آن ما خواهد بود. هیچ قدرتی در روی زمین وجود نخواهد داشت که بتواند بر ما مسلط شود اما وقتی که روح ما قیام کند، وقتی که بستگی بچیزهای نامناسب و بیگانه و موقعیت‌های ناشایست را رها کنیم، وقتی که اعتماد بخویش و تکیه برخویش در ما بوجود آید.

هند اکنون تدریجاً این اعتماد بخویش را بدست آورده است و بهمین نسبت مقاومت ناپذیر شده است و بخواست خدا از راه حقیقت و عدم خشونت که براهنمائی مهاتما گاندی برای خود برگزیده است منحرف نخواهد شد.

این بزرگترین خدمتیست که مهاتما گاندی به سیاست هند انجام داده است و بزرگترین سهمیست که هند برای رستگاری جهان تقدیم میدارد.

دکتر رادها کریشنان معاون ریاست جمهوری هند

بزرگ ترین واقعات سرگذشت انسان حوادث و کامیابی های مادی نیست انسان چه بسیار امپراطوریها بوجود آورده و درهم شکسته است. آنچه در تاریخ حیات آدمی اهمیت فوق العاده دارد رشد و تکامل روحیست که در طی قرون و در راه جستجوی حقیقت و نیکی بدست آورده است.

کسانی که در این ماجرای بزرگ و پر ارزش تکامل روح سهمی دارند در تاریخ فرهنگ بشری مقامی استوار و تزلزل ناپذیر احراز میکنند زمانه قهرمانان بزرگ را نیز بی اعتبار می سازد و به آسانی دیگران بدست فراموشی میسپارد اما مقدسان و مربیان روحی همواره پایدار میمانند.

عظمت گاندی نیز بیش از آنکه به مبارزات قهرمانیش بستگی داشته باشد بخاطر زندگی پاک و مقدسش میباشد. در دورانی که بنظر میرسد نیروهای مخرب و ویران کننده اوج میگیرند او بر روی قدرت آفریننده روح و خصال زندگی بخش آن تکیه میکرد و می ایستاد.

(مقدمۀ یک سخنرانی در دانشگاه اکسفورد)

نمونۂ خط گاندی

I want world
sympathy in
this battle of
Right against
Might

Dandi M.K.Gandhi
5.4.'30

پدر ملت هند

مختصری از زندگی مهاتما گاندی

تولد : «موهنداس کرمچند گاندی» در دوم اکتبر سال ۱۸۶۹ در «پوربندر» یکی از شهرهای کوچک سواحل غربی هند متولد شد که این شهر خود یکی از صدها حکومت امیرنشین کوچک و بزرگ و نیمه مستقلی بود که در آن زمان در هند وجود داشت.

گاندی در یک خانواده از طبقهٔ متوسط بدنیا آمد پدر بزرگش بمقام «دیوان» یا صدر اعظمی دولت کوچک پوربندر نایل شده بود و پس از پسرش «کرمچند» که پدر موهنداس بود نیز همین مقام را بدست آورد.

«پوتلیبائی» مادر موهنداس علائق مذهبی شدیدی داشت وزنی نجیب و فداکار بود و در ذهن فرزندش اثر عمیقی میگذاشت.

در موقعی که گاندی هنوز بدبیرستان میرفت یعنی در سن ۱۳ سالگی با دختری بنام «کستوربا» که همسن خود او بود ازدواج کرد و این زن تا پایان عمرش شریک زندگیش بود.

تحصیلات : پدر گاندی در سال ۱۸۸۵ در موقعی که او هنوز دانشجوی شانزده ساله بود درگذشت، یکی از دوستان خانواده پیشنهاد کرد که اگر گاندی جوان بخواهد مقام پدرش را در حکومت محلی پوربندر بدست آورد بهتر است که بتحصیل حقوق بپردازد و میتواند در مدت سه سال این کار را در انگلستان به انجام رساند. گاندی جوان از این فکر استقبال کرد ولی مادرش بعلل مذهبی با مسافرت او بخارجه مخالفت میکرد.

عاقبت گاندی در برابر مادرش سوگند یاد کرد که در خارجه خود را با «شراب» و «زن» و «خوردن گوشت» آلوده نسازد و با این ترتیب موافقت مادر را بدست آورد و این سوگند خود را هم با کمال دقت محترم داشت:

گاندی در سه سپتامبر ۱۸۸۸ در سن نوزده سالگی با کشتی بقصد انگلستان حرکت کرد.

پس از سه سال در ۱۰ ژوئیه ۱۸۹۱ امتحانات حقوق خود را در انگلستان پیروزمندانه گذراند و بلافاصله یعنی دو روز بعد بسوی هند حرکت کرد وقتی بوطن رسید ابتدا تصمیم گرفت که در شهر بمبئی بوکالت دادگستری بپردازد اما در این منظور توفیق زیاد بدست نیاورد.

اتفاقاً در همان زمان مؤسسه «دادا عبدالله» باو پیشنهاد کرد که بنمایندگی آنها بافریقای جنوبی برود و در آنجا بمعاضدت حقوقی و قانونی نمایندگان آنها بپردازد و در یک دادرسی که در پیش بود شرکت کند گاندی این پیشنهاد را پذیرفت و در آوریل ۱۸۹۳ با کشتی بسوی آن ناحیه حرکت کرد.

در افریقای جنوبی : نخستین چیزی که هنگام ورود گاندی بافریقای جنوبی در او اثر گذاشت محیط فشار و تبعیض های خفقان انگیز نژادی بود که برای هندیان مقیم آن سامان وجود داشت.

در موقعی که از شهر «چارلز تون» بسوی «ژوهانسبورگ» مسافرت میکرد در راه برای او حادثه ئی پیش آمد در آن زمان مسافرت بوسیلهٔ کالسکه صورت میگرفت اما در راه شهر «پرتوریا» او را بعلت تیرگی رنگ پوستش بداخل کالسکه راه ندادند و بیرون از اطاق کالسکه در جای رانندهٔ

نشاندند در حالیکه خود را نده با سایر مسافران سفید پوست در داخل کالسکه نشست.

پس از مدتی کالسکه ران هوس کرد سیگاری بکشد ومیخواست در جای گاندی بنشیند، در این وقت گونی کهنه کثیفی را در کف کالسکه پهن کرد و بگاندی دستور داد که بر روی آن بنشیند. گاندی این دستور را نپذیرفت و کالسکه ران دشنام گویان با ضربات مشت ولگد خود بجان او افتاد ومیخواست او را از کالسکه پائین بیندازد.

اما گاندی که میله های نشیمنگاه خود را محکم چسپیده بود تسلیم نمیشد وضمناً بمقابله هم نمی پرداخت. در نتیجه بعضی از مسافران سفید پوست نسبت برفتار خشونت آمیز کالسکه ران اعتراض کردند تا ناچار از زدن گاندی دست کشید و گاندی هم توانست جای خود را حفظ کند.

دفاع از عدالت :

بر اثر این قبیل آزمایشها که از تجاوزات و بیداد گریها نسبت به هموطنانش در افریقای جنوبی بدست میاورد حس عدالت اجتماعی در او رشد یافت. در این جهت عده ئی از هموطنانش را دعوت کرده پیشنهاد تشکیل یک انجمن را مطرح ساخت. هدفش از تشکیل این انجمن آن بود که برای رفاه حال هندیانی که در افریقای جنوبی مستقر شده اند بکوشند وخدمات داوطلبانه خود را برایگان بآنها تقدیم دارند.

هر چند گاندی بعنوان یک وکیل و برای شرکت در یک دادرسی به افریقای جنوبی رفت مدت سه سال در آن سامان ماند و یک سازمان مقاومت در مقابل تجاوزاتی که در آنجا نسبت به هندیان عمل می آمد بوجود آورد.

سپس گاندی برای مدتی کوتاه بعنوان مرخصی و دیدن خانواده اش بهند رفت و بزودی با فریقای جنوبی بازگشت.

در غیاب او اخبار جعلی و تحریف شده در بارهٔ فعالیت های او در هند برای حمایت از هندیان افریقای جنوبی پخش شده بود و جامعهٔ سفید پوستان اروپائی این منطقه سخت از او ناراضی بودند. باین جهت وقتی که گاندی به بندر "دوربان" رسید انبوه کثیری از سفید پوستان آنجا با و حمله بردند و با سنگ و چوب بجان او افتادند واگر یک زن شجاع انگلیسی بکمک او نیامده بود چه بسا که در همانجا کشته میشد.

گاندی با وجود این مشکلات فعالیت های خود را برای بهبود وضع زندگی هموطنانش در جنوب افریقا با بردباری و ثبات قدم دنبال کرد.

در کنگرهٔ ملی هند :

در سال ۱۹۰۱ گاندی یکبار دیگر بهند آمد این بار بکلکته رفت در موقعی که او بآن شهر رسید دوران انعقاد جلسات "کنگرهٔ ملی هند" بود که گاندی هم در آن شرکت کرد و حضور یافت و باکمال مسرت ملاحظه کرد که قطعنامه ئی در بارهٔ جنوب افریقا با اشتیاق فراوان بتصویب رسید.

بزودی جامعهٔ هندیان مقیم افریقای جنوبی او را به آنجا دعوت کردند در موقعی که "جوزف چمبرلن" وزیر مستعمرات بریتانیا از آنجا دیدن میکرد موضوع وضع هندیان آن سامان را در برابر او مطرح سازد.

در سال ۱۹۰۷ موقعی که ناحیهٔ ترانسوال در افریقای جنوبی یک حکومت خود مختار و مستقل برای خود بدست آورد قانونی که بنام "قانون سیاه" معروف گشت بتصویب رسید که بنا برآن تمام هندیان مقیم آنجا چه مرد و چه زن ناچار بودند نام خود شان را دفاتر مخصوص ثبت کنند و نشانهٔ انگشت خود شان را نیز بسپارند.

گاندی بجامعهٔ هندیان افریقای جنوبی توصیه و راهنمائی کرد که باین مقررات ناشایست تن در ندهند واگر لازم باشد حتی زندان را بپذیرند.

در اثر توصیهٔ سال ۱۹۰۸ خود گاندی در افریقای جنوبی دستگیر گردید و بدو ماه زندان محکوم گشت. بدنبال او عده زیادی از پیروان مبارزهٔ او که "ساتیاگراهی" نامیده میشدند نیز بزندان رفتند.

عاقبت در سال ۱۹۱۴ موافقتنامه ئی میان او و ژنرال اسموتش بامضاء رسید که در طی آن بسیاری از درخواست های هندیان مورد قبول

قرار گرفت .

در فوریهٔ سال ۱۹۱۵ گاندی بطور نهائی بهند باز گشت درحالی که هیچ نوع ثروتی با خود نداشت جز این که بمردم وطنش خدمت کند .

اشرام سوبارماتی :

در ماه ... سال ۱۹۱۵ گاندی در ساحل رودخانه "سابارماتی" در حومهٔ شهر "احمدآباد" در مغرب هند یک "اشرام" (خانقاه هندو) تاسیس کرد که "اشرام ساتیاگراها" (خانقاه مبارزهٔ عدم خشونت) نامید در حدود بیست و پنج نفر زن و مرد از پیروان گاندی که در این اشرام منزل کردند در راه : حقیقت اهیمسا (عدم خشونت) عدم ازدواج ، دزدی نکردن ، مالک نشدن سوگند خوردن و خود را برای خدمت بمردم هند وقف ساختند .

نخستین مبارزهٔ ساتیاگراهای گاندی در هند در "چامپاران" در استان "بیهار" بود که در آنجا در سال ۱۹۱۷ بدرخواست یک دهقان فقیر به مبارزه برای دفاع از دهقانان آن ناحیه پرداخت که مورد استثمار بسیار شدید و توانفرسائی قرار داشتند .

اما موقعیکه قانون "رولات" (دربارهٔ وضع سیاسی هند) وضع گردید و ضمن آن حتی آزادیهای ابتدائی مدنی از مردم سلب شد . گاندی خواه ناخواه بطور قاطع بمبارزهٔ سیاسی کشیده شد .

مبارزات سیاسی :

گاندی برای مبارزهٔ خود "هرتال" یا مقاومت آرام مسالمت جویانهٔ ملی را اعلام داشت که یکنوع سوگواری ملی بشمار میرفت و در طی تظاهرات آن مردم دکانهای خود را می بستند و با پرچم های سیاه نفرت خود را اعلام میداشتند درخواست گاندی در سراسر هند مورد قبول واقع شد . و تظاهرات وسیعی صورت گرفت .

در ۱۳ آوریل سال ۱۹۱۹ در محل "جالیانوالاباغ" در شهر امیرتسر، در شمال هند، گروهی از مردم بدون سلاح که بتظاهرات مسالمت آمیز پرداخته بودند در یک محیط بسته و محدود مورد هجوم و گلوله باران سربازان انگلیسی قرار گرفتند و آنجا در حدود ۱۲۰۰ نفر کشته شدند و بیش از ۳۶۰۰ نفر مجروح گشتند این کشتار وحشیانهٔ مردم یکپارچه طوفانی از خشم در سراسر هند برانگیخت . و در نوامبر همان سال گاندی مبارزهٔ معروف "عدم همکاری" با حکمرانان خارجی را آغاز کرد و همچون ساحری شعله های غرور و اشتیاق را در سراسر کشور برافروخت .

برای شروع این مبارزه گاندی تمام نشانها و مدالهای افتخار را که دولت بخاطر خدمات اجتماعیش در جنوب آفریقا و در دورانهای جنگ و فعالیت هایش در کمک به مجروحان و به سازمانهای صلیب سرخ به او هدیه کرده بود پس فرستاد .

بسیاری از هندیان نیز بدنبال او القاب افتخاری و نشانها و مدالهای خود را پس فرستادند، وکلای عدلیه که برای دولت کار میکردند استعفا دادند، دانشجویان و دانش آموزان مدارس دولت انگلیسی را ترک میگفتند و هزاران نفر مردم هندی داوطلبانه بسوی روستاها رفتند تا پیام مبارزهٔ عدم خشونت و عدم همکاری با دولت حاکم را در همه جا پراکنده سازند و توده های مردم را برای دفاع از حق و قانون پرورش دهند .

توده های رنجبر مردم که قرنها زیر فشار قرار داشتند با شهامت و دلیری و فداکاری بی سابقه ئی قیام کردند پارچه ها و مشروبات و کالاهای خارجی در خرمن های بزرگ آتش سوزانده شد . زنان از اسارتگاه منزل که از قرنها پیش به آنجا رانده شده بودند بیرون آمدند و دوشادوش مردان در راه مبارزه قرار گرفتند تا هم خودشان و هم وطنشان را از اسارت چند قرنی آزاد سازند .

بر اثر این حوادث صدها نفر نیز بزندانها رفتند و میلیونها نفر دیگر خود را داوطلبانه برای رفتن بزندانها آماده میساختند اما در فوریهٔ سال ۱۹۲۲ ناگهان این مبارزه از اوج خود فرود آمد

زیر اعدهٔ از دهقانان در ناحیهٔ چوری چورا بر اثر شور و هیجان انقلابی خود یک پست پلیس را آتش زدند و چند نفر در آتش سوختند. این واقعهٔ خشونت آمیز گاندی را بسیار متأثر ساخت و با این مناسبت به آن دوران مبارزه پایان داد و بخاطر وقوع این امر که آنرا گناه میشمرد پنج روز روزه گرفت.

مبارزهٔ نمک

در ۱۲ مارس سال ۱۹۳۰ گاندی بار دیگر یک نهضت عظیم دیگر را در هند شروع کرد. در آن موقع از طرف دولت قانونی برای برقراری عوارضی بر نمک وضع گردید. گاندی رسماً به نایب السلطنهٔ هند اطلاع داد که این قانون را محترم نخواهد شمرد و با آن مبارزه خواهد کرد. و باین منظور باتفاق هفتاد و هشت نفر از زنان و مردان پیرو خود راه پیمائی معروف خود را بسوی "دندی" در خلیج بمبئی آغاز کرد که ۲۴ روز طول کشید و در آنجا برخلاف مقررات قانون به تهیهٔ نمک پرداخت و بدنبال او میلیونها نفر در سراسر هند به تهیهٔ نمک پرداختند این مبارزه یکبار دیگر آتش اشتیاقهای ملی را برانگیخت و آنرا به اوج بیسابقه‌ای رساند و یکبار دیگر در ظرف چند هفته صدها هزار نفر از مردان و زنان هند بزندانها رفتند و دستگاه عظیم دولت را از کار انداختند.

در ۵ مارس سال ۱۹۳۱ متارکه نامهٔ میان گاندی و لرد ایروین نایب السلطنهٔ هند به امضاء رسید و در ۲۹ اوت همان سال گاندی بعنوان تنها نمایندهٔ مردم هند برای شرکت در دومین کنفرانس میزگرد و گفتگو دربارهٔ سرنوشت آیندهٔ هند به لندن رفت اما دست تهی باز آمد و مسئلهٔ استقلال هند با لاینحل ماند.

از هند بیرون بروید

وقتی در سال ۱۹۳۹ جنگ دوم جهانی آغاز گردید گاندی از انگلیسها دعوت کرد که هند را ترک بگویند تا هند بصورت یک کشور آزاد، و نه کشوری اسیر بتواند در راه دفاع از آزادی و استقلال کشورهای دیگر بجنگد اما با انتشار این دعوت، گاندی و تمام اعضای کمیتهٔ عاملهٔ کنگرهٔ ملی که دکتر راجندرا پراساد، رئیس جمهوری کنونی، جواهر لعل نهرو نخست وزیر کنونی و مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم وزیر فرهنگ فقید هند و بسیاری از شخصیت های کنونی و معروف دیگر از جملهٔ آنها بودند بازداشت و زندانی شدند.

بدنبال این بازداشت ها قیام عمومی بزرگی روی داد که با خشونت و شدت و با خونریزی و کشتار سرکوب گردید. با اینهمه حکومت بریتانیا نمیتوانست کاملاً بر هند مسلط باشد و آنرا آرام نگاه دارد و اوضاع روز بروز بدتر میشد قحطی و آشفتگی که در هند رواج یافت ارکان حیثیت امپراطوری بریتانیا را متزلزل ساخت.

عاقبت بریتانیا از جنگ دوم جهانی پیروز بیرون آمد اما از نظر مادی و معنوی فرسوده شده بود و ناچار در ۱۲ اوت سال ۱۹۴۶ نایب السلطنهٔ هند از جواهر لعل نهرو شاگرد و دوست و همکار مهاتما گاندی دعوت کرد که یک دولت موقتی برای هند تشکیل دهد.

در این موقع بود که اخبار تلخی از خشونت هائی که در ناحیهٔ "نواکلی" در بنگال شرقی بر ضد هندوان آغاز شده بود انتشار یافت. گاندی فوراً بآنجا رفت و از ۷ نوامبر ۱۹۴۶ تا ۲ مارس ۱۹۴۷ در آنجا ماند و به آرام ساختن مردم مشغول بود. سپس از آنجا به "بیهار" رفت که در آنجا متقابلاً آشوبهائی از طرف هندوان بر ضد مسلمانان آغاز شده بود.

سرانجام

عاقبت در ۱۵ اوت ۱۹۴۷ هند مستقل گشت اما بدنبال آن استقلال رقابت‌ها و شورشها و کشتارهای مهیب مذهبی آغاز گردید. گاندی دائماً کوشش خود را بکار میبرد که هندوان و مسلمانان را با هم سازش دهد و عاقبت جان خود را هم در این

راه نهاد -

در ۳۰ ژانویه سال ۱۹٤۸ یکی از هم مذهبان متعصبش اورا با ضرب چند گلوله از پای در آورد و وجود این همچون آتش مقدسی خاموش گشت -

معهذا تعلیمات گاندی با جسم او نمرد حتی با تقدس و قدرت و نیروی بیشتری توسعه یافت و مردم هند دریافتند که گاندی حتی پس از مرگش چه تاثیر عظیمی در مغز و در قلب آنها دارد -

گاندی یک وطن پرست میهن تابعیت و کوته نظر نبود بلکه یک مربی بزرگ اخلاقی بود که نه فقط مورد احترام و ستایش هموطنان خودش میباشد بلکه مورد علاقه و احترام مردم سراسر جهان است -

از نظر جواهر لعل نهرو، پدرم گاندهی جی را از جهت تقدسش و از جهت (مهاتما) بودنش نمیستود بلکه او را از جهت انسان بودنش ستایش می کرد. پدرم خود شخصیتی نیرومند و انعطاف ناپذیر داشت و بهمین جهت قدرت فکری و روحی گاندی جی توجه و احترام او را جلب میکرد. زیرا روشن بود که این مرد ضعیف الجثه و کوچک اندام، در پشت اندام نحیف و لاغر خود روحی پولادین داشت که همچون صخره ئی استوار بود و در زیر هیچ فشار ناروائی خم نمیشد با وجود قیافه اش که تاثیر زیادی در شخص نمی بخشید و با وجود جامهٔ ساده اش و برهنگیش، در او یک چیز با عظمت و شاهانه وجود داشت که هر کس را وادار میساخت با کمال میل از او تبعیت و اطاعت کند با وجود کمال ملایمت ارادی و منتهای سادگی عمدی که داشت قدرت اقتدار فراوانی در نهادش بود که خودش هم بآن وقوف داشت گاهی با منتهای عظمت و اقتدار دستوراتی صادر میکرد که (باید) اجرا میشد -

چشمان آرام و بر حالتش شخص ما در زیر نگاه خود قرار میداد و درون روشن را می کاوید. صدای روشن و پاک او تا اعماق قلب نفوذ می یافت و انسان را منقلب میساخت چه طرف خطاب او یک نفر میبود و چه هزاران نفر سحر مغناطیسی کلام او اثر خود را می بخشید و هر کس احساس میکرد که با سخنران یک پیوند و ارتباط مخصوص و مستقیم دارد این یک احساس شگفت انگیز بود که هوش و ذکاوت در آن راه و اثری نداشت. او از جذب و جلب ذکاوت و هوشیاری اشخاص هم غافل نمیماند اما در برابر او مغز و منطق انسان نقش ثانوی را پیدا می کرد. این "جادو گری" او اثر بلاغت و فصاحت خیره کننده یا تاثیرات هیپنو تیزمی هم نبود. بیان او همیشه ساده، فوق العاده عریان و مستقیماً مربوط با صل موضوع بود. صمیمیت مطلق و خصوصیت فردی خود او بود که بکلام جان مخصوص می بخشید -

چنان حالتی داشت که انگار ذخائر عظیمی از نیروهای درونی و نا پیدا در اختیار اوست شاید هم صورت افسانه آمیزی که باو بخشیده بودند و افسانه هائی که درباره اش رواج یافته بود این تاثیر را در شنونده بوجود می آورد در هر صورت یک بیگانه و کسی که با این افسانه ها و با محیط او ارتباط معنوی نسبداشت تاثیر سحر انگیز او را تا این اندازه احساس نمی کرد با اینهمه یکی از خصوصیات قابل ملاحظهٔ گاندهی جی قدرتی بود که در متقاعد ساختن یا اقل خلع سلاح کردن استدلالی حریفان خود داشت -

هر چند که گاندی جی زیبائیهای طبیعت را میستود و از آنها لذت میبرد اما برای درک و لذت بردن از زیبائی و هنر و آنچه مخلوق و ساختهٔ بنوع آدمی بود ذوق متوسط و ضعیفی داشت (تاج محل) در نظر او فقط مظهر اعمال شاقهٔ کارگران بود بوها و عطرها در او تاثیر کامی نبخشید با وجود این برای خود یک هنر زندگی خاصی بوجود آورده بود و زندگانیش خود یک شاهکار واقعی هنری شده بود. هر یک از حرکاتش پر از معنی و لطف بود و بدون آنکه کوچکترین عدم تناسبی در آنها وجود داشته باشد -

در تمام وجودش هیچ چیز زننده و خشن چیزی از آن ابتذال

که متاسفانه درکشور ما، در طبقات متوسط زیاد بچشم میخورد وجود
ت آرامش درونی را برای خود بدست آورده بود همین آرامش
از او منعکس میگشت. او همواره با قدمهای استوار و تزلزل ناپذیر
هبای پرپیچ و خم زندگی پیش میرفت -

(از فصل ۱۸ کتاب زندگی من)

نماینده توده ها : گاندی نماینده واقعی توده

دهقانان وچکیده اراده دانسته یا ندانسته آنهاست. او حتی خیلی
از نماینده آنهاست. او مظهر ایدآلها و آرزوهای این صدها
ین نفوس دهقانان هندی بشمار میرود. مسلماً او نمونه یک دهقان
سط هندی نیست -

او با ظرافت طبع و ذکاوت ادراک وحساسیت فوق العادئی
د مردی بسیار خوش ذوق است که نظری وسیع هم دارد.
او یک (انسان) ودر عین حال یک چکیدهٔ رنج وریاضت است
هیجانات وشهوات خود تسلط دارد وآنها را بصورتی عالی وآسمانی
رده است وعواطف خود را بسوی روحانیت ومعنویت سوق
ها شخصیت خیره کنندهٔ او مردم را همچون آهن ربا بخود میکشاند
س آنها را بی علاقه بودن وصرفنظر کردن از علائق دلبستگیها بخواند

تمام صفات او با یک دهقان متوسط هندی تفاوت
ن دارد وبا اینهمه او یک (دهقان بزرگ) است ومرد تربیت
اهل زمین دنیا را با چشم یک دهقان مینگرد و در برابر بعضی
های زندگی هم همان چشم بستگی یک دهقان را دارد -

اما هند کنونی سرزمین دهقانانست وانگار او هم سراسر هند
رست خود لمس کرده است وآنرا بهتر از هرکس میشناسد.

کوچک ترین ارتعاشات هند را با یک اطمینان تقریباً
ی بوسیله حالات روحی خاص خود درک میکند ودر لحظات
باقدام میپردازد -

او نه فقط برای دولت بریتانیا صورت یک رمز ویک معما را

دارد بلکه برای ملت خود واطرافیان نزدیکش نیز چنین است !
شاید اگر او درکشور دیگری غیر هند میبود با اوضاع او ودی تناسبی
نمیداشت اما چنین بنظر می رسد که هند او را بخوبی درک میکند -

هند امروز این مرد را که جنبه های مذهبی وپیامبری دارد و
دربارهٔ گناه ورستگاری وعدم خشونت حرف میزند میستاید و
دوست میدارد -

در اساطیر وافسانه های مذهبی هند داستانهای فراوانی از
مرتاضان بزرگ وجود دارد که بر اثر قدرت وریاضت وشدت
فداکاری نفس صورت یک (کوه عظیم شایستگی) را پیدا میکنند وبمقام
همه خدائی میرسند ومیتوانند نظم موجود را هم تغییر بدهند ودر مقدرات
تاثیر بگذارند -

در مقابل قدرت روحی فوق العادهٔ گاندی جی ونیروی عظیم وکه
انگار از یک ذخیرهٔ تقصان ناپذیر معنویت ناشی میشود همیشه بیاد این
همه خدایان افسانه ئی افتاده ام -

مسلماً او از نوع مردم عادی جهان ما نبود. او از یک قماش دیگری
بود واغلب مثل این بود که از اعماق چشمهایش یک موجود ناشناختهٔ
دیگر بما مینگریست -

هند، حتی هند شهرها حتی هند صنعتی وجدید در خود نشانه های
دهقانی فراوان داشت وهنوز رنگ دهقانی خود را رها نکرده بود
بنابراین بسیار طبیعی بود که هند این فرزند خود را که در عین حال، هم
با او شبیه بود وهم با او تفاوت داشت بصورت یک بت ویک رهبر
محبوب بپذیرد -

گاندی جی یادگارهای باستانی وخاطراتی را که تقریباً از یاد
رفته بود از نو زنده کرد وهند را متوجه روح خود ساخت -

هند در میان نیرنگهای رنج آور زمان حال، تنها ومحروم میبایست
دست وپا میزد ودر دریاهای مبهمی دربارهٔ گذشته وآیندهٔ خود
داشت. اما گاندی آمد ودر فکر او امید را برانگیخت ودر کالبد متزلزل

تازان او نیروئی تازه دمید. در نتیجه مهرهای هند، آینده صورتی دلپذیر و امیدبخش بخود گرفت. هند همچون (ژانوس) (خدای افسانه‌ئی یونان که دو سر داشت) شد که هم به پشت سر، بگذشته مینگرد و هم بجلو و آینده و میکوشد که این هردو را باهم پیوند دهد.

(از فصل ۲۲ کتاب زندگی من)

دلیر و بیباک

دمی گاندی ظهور کرد همچون جریانی از هوائی تازه و خنک بود که ما را مجال آورد و توانستیم نفسی عمیق بکشیم. همچون یک پرتو نور بود که در ظلمات تابید و نیز گبها را از برابر دیدگان ما مرتفع ساخت. همچون گردبادی بود که بسیاری چیزها را زیرو رو کرد و بیش از هرچیز در افکار مردم اثر گذاشت.

او در کار اجتماعی خود از بالا پائین نیامد. چنین بنظر میرسید که او از میان میلیونها نفوس هند بیرون آمده است. بزبان ایشان سخن میگفت و دائماً به آنها و زندگی سخت و دردناکشان توجه داشت.

او بما میگفت تمام شما که از ثمرهٔ کار دهقانان و کارگران زندگی میکنید ایشان را آسوده بگذارید. روش و اوضاعی که فقر و تیره روزی را تولید میکند از میان بردارید.

از آن پس آزادی سیاسی شکل تازه‌ئی بخود گرفت و حدود پهناورتری یافت.

ما فقط قسمتی از آنچه را او میگفت قبول میکردیم و گاهی هم آنها را اصلاً نمی‌پذیرفتیم. اما تمام این سخنان او جنبه‌های ثانوی داشت. روح اصلی تعلیمات او بیباکی و حقیقت همراه با اقدام و عمل بود که همیشه رفاه توده‌های مردم را در نظر داشت.

در کتابهای باستانی و مقدس ما گفته شده بود که بزرگترین عطیه برای یک فرد یا یک ملت (ابهایه) (بی باکی) است که فقط شامل دلیری و شهامت جسمی نمیشود بلکه باید ترس و باک را از ذهن و فکر هم بدور داشت.

کتابهای (جانکه) و (یاجنا والکیا) در اوان تاریخ ما گفته‌اند که وظیفهٔ رهبران یک ملت آنست که آنها را صبور و بیباک بار آورند. اما در دوران تسلط انگلیسی‌ها مهمترین انگیزه و عامل حکومت (ترس) بود. ترس و وحشت همه جانبه، همراه با فشار و تضییقات، ترسی خفقان انگیز، ترس از ارتش، ترس از پلیس، ترس از جاسوسان مخفی که در همه جا پراکنده بودند، ترس از طبقهٔ مأموران رسمی، ترس از عمال مالکان، ترس از صرافان و وام دهندگان، ترس از گرسنگی و بیکاری که مردم همواره در آستانهٔ آن بودند. همهٔ این ترسها بر کشور مسلط شده بود و بر ضد تمام این ترسهای مسری بود که صدای گاندی با آرامش و اعتماد بلند شد و طنین افکند که (نترس)

آیا تمام این چیزها ساده بود؟ نه، ابدا

ترس هیولائی بوجود می آورد و میسازد که از واقعیت خیلی مهیب‌تر است و موقعیکه واقعیت با آرامش مورد تجزیه و تحلیل قرار گیرد و نتایج آن از روی اراده پذیرفته شود هیولای وحشت بسیاری از اثرات شوم خود را از دست میدهد.

بدین ترتیب بود که با طنین صدای استوار و متین گاندی ناگهان بار سنگین هیولائی ترس از شانه‌های مردم برخاست، بدیهیست نه کاملاً و به یکباره ولی تا اندازه عجیبی زیاد و تدریجاً.

همچنانکه ترس با دروغ و جعلیات خویشاوندی دارد، حقیقت هم بدنبال جسارت و بیباکی فرا میرسد.

بر اثر وضع جدید هندیان حقیقت را بیش از پیش باور میکردند و در طبیعت ایشان تغییر بزرگی روی نمیداد معهذا وقتیکه احتیاج به جعلیات و روشهای مخفی و نهانی کم شد حرکتی به عظمت تغییرات اقیانوس نمایان گشت.

این تغییر روحی عظیمی بود که در هند تحقق می یافت و تقریباً مثل آن بود که یک پزشک بیماریهای روحی با روشهای پسیک آنالیزی باعماق گذشته‌های یک بیمار بنگرد و ریشه‌های عقده‌های روحی او را که پیدا کند و آنرا در برابرش بگذارد و بدین ترتیب بار بیماری را از روح او بردارد (از کشف هند)

از شاعر گرامی ازبکستان
شرف رشیدوف

و ترجمه فارسی شاعر معروف تاجکستان
میرزا ترسون زاده

ترانهٔ کشمیر

نویندهٔ معروف ازبک "شرف رشیدوف" هنگامی که به کشمیر سفر کرد و با مردم آن سرزمین و اد بیات و فرهنگ ملی آن آشنائی یافت، قصه ای بنام "ترانهٔ کشمیر" نوشت که شاعر مشهور تاجیک "میرزا تورسون زاده" آن را بزبان فارسی ترجمه کرده و اینست خلاصه آن داستان۔

"هنگامی که در کشمیر بودم این ترانه های محبت را شنیدام، این ترانه ها از دل و جگر سروده شده، آرزو و امید خلق را افاده کرده اند۔ از زبان بزبان، از نسل به نسل، از دور بدور گذشته، همیشه بعاشقان مردانگی، بمعشوقان امید بخشیده اند۔ به دلها بال و پر عطا نموده، به انسانها راه نجات را نشان داده اند۔ این ترانه ها تاریخ گذشتهٔ خلق را زنده کرده اند۔ درین افسانه ها جوانمردان نا ترس، مرغان و گلها تصور یافته و در شکل گل، دختران با وفا در پیش چشم جلوه گر نموده اند۔ این ترانه ها فکر و ذکر ما را مفتون کرده بجوش آورده اند، ما را جادوگرانه و سحر انگیزانه بخود کشیده اند۔ وقتی که ما این ترانه ها را می شنیدیم، مبارزهٔ جوانمردان و دختران کشمیر را که در مثال "بمبور" و "نرگس" تصویر کرده شده اند به پیش نظر میآوردیم، ملاقاتهای تاریخی و صحبت های شوق انگیزی که با داستان کشمیر بیان کرده ایم، تا آخر عمر بیاد ما باقی میماند۔ این قصه هم در نتیجهٔ تاثرات همان روزهای فراموش نشونده (نشدنی) نوشته شده است ما درین جا کوشش کردیم که محبت و احترام نسبت بدوستان کشمیری و هندوستانی را از صمیم دل اظهار نمائیم۔"

باری درین افسانهٔ کشمیری حکایت از زیبائی باغ و گلهای بهاری است چنانکه گوید۔

"شکوفه ها یکی از دیگری زیباتر، یکی از دیگری خوشرو تر، یکی از دیگری سیر برگتر و یکی از دیگری سیر غنچه ترند۔ گلهای رنگ برنگ جمال دختران بقدر سیده را بیاد آورده، حسن خود را بتماشه گذاشته، لطافت خود را روشن تر نمائش داده، و دنیا چهر و محبت بهار را طنطنه میکردند.... باغ گلها در دامان کوهای بلند چنان حیات بخش، چنان هم جادوگر است که بلبلان بیشمار از شاخ بشاخ، از گل بگل پرواز کرده، به غنچه های نو شگفته چشم می دوزند و تمام روز و شب مستانه میسرایند۔ آنها با آهنگهای شوخ و دلربا..... در شان حسن و لطافت خوبان مدح، میخوانند، آنها حیات این باغ و محبت گلها را ستائش می کنند۔ گل از همه باغ گلها، با حسن خود در جهان مشهور گردیده، نازنین نرگس می باشد۔ آیا یکان مرغ هست که حسن نرگس را ترنم نکرده باشد؟ به محبت آن سزاوار شدن و به وصال آن رسیدن را امید نکرده باشد؟"

"نرگس براه دوست چشم دوخته مادامی که سرود انتظاری را می سراید آهنگ سرود آن از آهنگ سرود عاشقان دیگر نفیس تر صدا می دهد۔"

جانان دلم افگار است   چشمم برهت چار است
بی دیدن رخسارت   گل در نظرم خار است
جانانه رهت دور است   معشوق تو رنجور است
عشق من و دلدارم   افسانهٔ مشهور است
هم فصل بهار آمد   هم د "ر" نه قطار آمد
کی آئی و من گویم   "یار آمد و یار آمد"
آئی بیبرم خیزم   صد شور برانگیزم
در روی رهت از باغ   گل چینم و گل ریزم

"نرگس در باغی که در دامن کوهها در وادی خرم واقع است به خرسنگی از میان گلها جای گرفته است، تکیه داده چشمان کلان خود را پر خمار کرده، همچون شیدای عشق "بمبور" با آواز دلفریب

می در کف بہار است — سوسن پیالہ دار است
بلبل بہ بزم خوبان — بدست ویر خمار است
از ہر گلی کہ دیدی — افسانہ ای شنیدی
از عشق غنچہ برتن — صد پیرہن دریدی
نرگس اگر سراید — گل در فغان درآید
از قصۂ محبت — باب نوی کشاید

گلہای باغ اکنون — با بلبلان دل محزون
یک جا بہ صف نرگس — خوانیم شاد و محزون
تا این سرود از دور — رفتہ بگوشش بمہجور
یک یک بیان نماید — احوال یار مہجور

غزل

از مولوی عبدالرحمٰن صاحب شائق مرحوم (ان رحوم)

(بھوپالی)

بگذر ز جرم بے حد و ہم از خطائے ما
ما بندۂ تو ایم تو ئی ای خدائے ما
با آہ و گریہ بسکہ تر و تازہ آمدیم
بہ زین ہوا و آب چہ نشو و نمائے ما
فرخندہ این شب است و این روز خرم است
ای مہ بہم جلوہ بارض و سمای ما
بقراط و جالینوس و فلاطون من تو ئی
رنجور آمدیم و بدستت شفائی ما
ما بد کنیم و نیک مکافات میدہی
افزون وفائی تست ز جور و جفائی ما
فریاد رحمت تو چسان قسمتی نمود
وصل تو بہر غیر فراق از برای ما
بیگانہ کن ز خلق و بخود آشنا بساز
بیگانہ از تو بودہ ام ای آشنائی ما
توفیق ہم ز تست وگرنہ بہ پیش تو
ما کیستیم و چیست خدایا دعائی ما
آمرزش جرائم شائق زہی ہوست
رحمت بوجد رفت رساند نوای ما

غزل

از بیرسٹر محبوب الرحمٰن بسمل بھوپالی

بی اے آنرز۔ ایم اے۔ (علیگ)

در عشق تو برباد م بربادہ چنین باید
از ہر دو جہان رستم آزادہ چنین باید
این نالہ و این آہی صد حیف کہ بی سود است
یارب بکنار آید فریادہ چنین باید
بر نعمت او شاکر بر فتنۂ او صابر
راضی برضا باشد منقادہ چنین باید
آن جان بہار آمد آن شوخ نگار آمد
از فرط طرب رقصم دلشادہ چنین باید
ہر قطرۂ خون من بر جور تو می نازد
بیدادہ چنین باید جلادہ چنین باید
جز درد تو در قلبم نہ دارد نہ دگر دردے
ہم از پئے قصر دل بنیادہ چنین باید
بر کندہ رہا سازد او طائر بسمل ما
بین شوخی صیادم صیادہ چنین باید
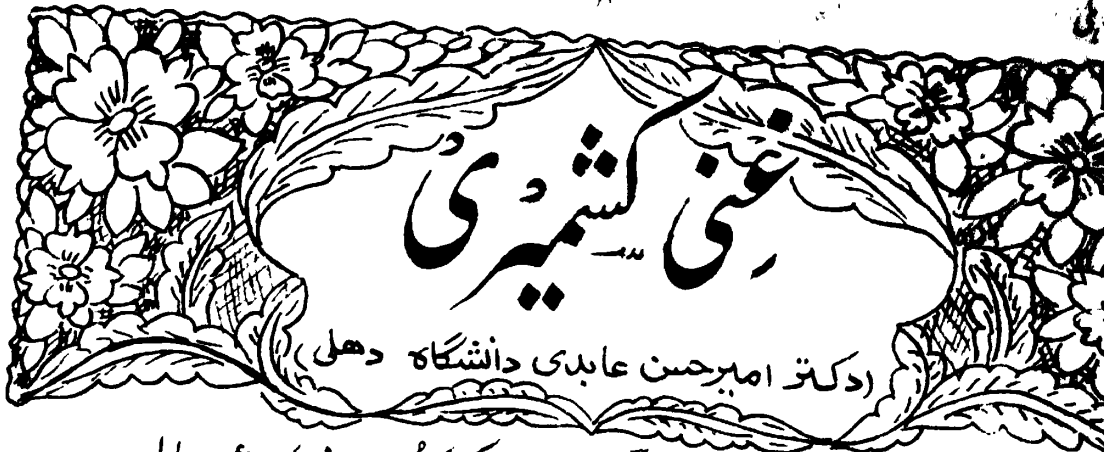
غنی کشمیری

(دکتر امیرحسن عابدی دانشگاه دهلی)

ملا محمد طاهر اشنوی کشمیری متخلص به غنی شاگرد ملا محمد محسن فانی
ن دمتوفی بسال ۱۰۸۱ هجری مطابق ۱۶۷۰-۱ میلادی
.. اشنی یکی از قبائل برجسته کشمیر میباشد. در مرآة الخیال
شده است : بمدد طالع دراک در فنون و علوم برا ستاد
دستی می نمود. هرگاه شیخ را مسئله مشکل شدی از وی استفسار

ری ؟ ص ۱۶۲

غنی وطن خود را خیلی دوست می داشت و هیچوجه
خواست از آن جائی فرح بخش و خرم خارج شود. و از سفر اصلاً
رای می نمود :

بسکه شد زنجیر پایم رشتهٔ حب الوطن
در سفر دایم چو سوزن چشم دارم در قفا

اما در وطن همواره درد می کشید :

هر که پابند وطن شد می کشد آزارها
پای گل اندر چمن دایم پر است از خارها

و سپس از محیط ناسازگار و شومی تقدیر شکایت
می کند :

نه شاهی که مردم آدم بی سایه را دیدند
غریب است این زمان گر سایهٔ آدم شود پیدا

و مثل بیشتر هنرمندان غنی هم حس کرد که ارزش
وی چنانکه باید شناخته نشده :

هر کس که هنرمند زید در عالم
هست از هنر خویش دلش را صد غم
دیدی که بوقت رشته تابی خیاط
می ساید دست از تاسف برهم

غنی مدح کسی را نگفته و در استغناء کامل بسر می برد :

سعی روزی بر نمی دارد مرا از جای خویش
آبرو چون شمع میریزم ولی در پای خویش

و برخلاف هنرمندان درباری از سلاطین و امرا انتظار
صله نداشت :

غنی چرا صلهٔ شعر از کسی گیرد
همین بس است که شورش گرفت عالم را

وی دوست دار فقر و زندگی ساده و بی تکلف بود -

در علم فقر هر که شد استاد چون غنی
برداشت نسخه از ورق بوریای ما

اما در عین حال مناعت طبع داشت :

غنی اگرچه فقیر است همتی دارد
نشانده است بکونین دست خالی را

تا فقر شده مقیم کاشانهٔ ما
از گرد امل تهی ست ویرانهٔ ما

رفتن بدر خانهٔ مردم عیب است
امروز که فقر هست در خانهٔ ما

ظاهر است که بدین ترتیب گوشه نشینی از مختصات وی بوده :

ہر چند غنی ہمچو نگین خانه نشین است
نامش زد رب نه برآید چه توان کرد

رو شناسم چو مردم دیده
گرچه از خانه بر نمی آیم

در تذکره نصرآبادی نوشته شده است که پادشاه وقت سیف خان (متوفی بسال ۱۰۹۵ ہجری مطابق ۱۶۸۳ میلادی) حاکم کشمیر نوشت که غنی را بدربفرستد. اما غنی از حاکم مزبور درخواست کرد که بپادشاه بنویسید که رو دیوانه است. حاکم گفت عاقل را چطور دیوانه میتوان گفت سپس غنی گریبان خویش را درید و بطرف خانه روانه گردید و پس از سه روز درگذشت. اگر روایت مزبور درست باشد پس پادشاه وقت عالمگیر (۱۰۶۸ — ۱۱۱۸ = ۱۶۵۸ — ۱۷۰۷) بوده. زیرا در سال ۱۰۷۹ ہجری (۹ — ۱۶۶۸ میلادی) که سال وفات غنی است عالمگیر بر تخت سلطنت جلوس کرده بود. اما این حکایت ساختگی بنظر میرسد. زیرا عالمگیر بشعرا و صوفیان علاقه ای نداشت و ممکن است شاه جہان (۱۰۳۷ — ۱۰۶۸ = ۱۶۲۷ — ۱۶۵۸) غنی را طلب کرده باشد.

حکایت دیگر که دلیلی بر استغناء و آزادی غنی می باشد این است که میگویند عنایت خان آشنا (متوفی بسال ۱۰۸۱ ہجری ۱ — ۱۶۷۰ میلادی) پسر ظفر خان احسن (متوفی بسال ۱۰۷۳ ہجری ۳ — ۱۶۶۲ میلادی) روزی گفت که اگر مفہوم شعر با یک بار خواندن و شنیدن درک نمی شود سہل است. چون غنی شنید گفت تا امروز بر درک شعر شما اعتماد داشتم. حالا آن اعتماد از بین رفته است. و پس از آن خان مزبور را ندید.

ہمین استغنا علت بود که غنی با کسی جنگ و جدل نمی کرد.

چراغ مجلسم نبود مرا تاب جدل با کس
اگر در پیش من دم می زنی خاموش میگردم

و در مقابل خرده گیران عصر خویش خاموش بود :

ترک گویائی ز خجل نکته گیران رستن است
بستن لب بہتر از مضمون رنگین بستن است

غنی از بعضی معاصرین خود راضی نبوده و در رباعی ذیل از طغرا (م ۱۰۷۸ = ۸ - ۱۶۶۷) انتقاد میکند :

طغرا که بود روح کثیفش چه جسد
با صاف ضمیران شده دشمن ز حسد
گویند که برند شعرش ارباب سخن
نامش نبرند تا بشعرش چه رسد

در رباعی ذیل بیکی از معاصرینش اشاره میکند :

گر نسبهٔ شعر خود بپرسی از من
گویم سخنی با تو مرنجی از من
بر ہر ورقی که کرده مشق سخن
چون لوح زبان بشوی از آب دہن

و در شعر ذیل از شعرای غیر واقعی خرده گیری میکند :

خام گویان بسکه میسازند معنی ها شہید
شد زمین شعر آخر چون زمین کربلا

اما از قلندر خیلی توصیف کرده است :

از اہل سخن کسی بقلندر نرسد
در شعر با عرفی[1] و سنجر[2] نرسد

---

(۱) سنجر در سال ۱۰۲۱ ہجری (۳ — ۱۶۱۲ میلادی) درگذشته است. (۲) عرفی در سال ۹۹۹ ہجری (۱ — ۱۵۹۰) درگذشته است.

هر مصرع او بسکه بلند افتاده است
ترسم که باد مصرع دیگر نرسد

بالآخره غنی در سال ۱۰۷۹ هجری مطابق ۹-۱۶۶۸ میلادی از این جهان فانی رخت بربست. ماهر (متوفی بسال ۱۰[illegible] هجری ۹-۱۶۷۸ میلادی) قطعه تاریخ وفاتش را سروده است :

چو داشت فیض صحبت شیخ کامل محسن
غنی سر حلقهٔ اصحاب او ز نکته دانی شد
تهی چون کرد بزم شیخ را گردید تاریخش
که آگاهی سوی ملک بقا از ملک فانی شد

ولی مؤلف فرحة الفاخرین سال وفات غنی را ۱۰۷۰ هجری مینویسد و میگوید که عزیزی در مصرع ذیل تاریخ وفات او را بطور تعمیه سروده است :

افتاد بر زمین سخن از رفتن غنی

مؤلف تاریخ مرأة العالم سال وفات غنی ۱۰۷۰ هجری میگوید :

غنی و کلیم (م ۱۰۶۱ = ۲-۱۶۵۱) و قدسی (م ۱۰۵۶ = ۷-۱۶۴۶) و سلیم (م ۱۰۵۷ = ۸-۱۶۴۷) هر چهار شاعر در کشمیر در قبور الشعرا مدفون هستند.

غنی به فرزند امام حسین و شهدای کربلا خیلی علاقه داشت :

کسی بروز جزا سرخرو تواند شد
که خاکپای شهیدان کربلا باشد

در شعر ذیل از حضرت علی ستایش میکند :

مریبا است خوش آتش اولاد بولهب را
تو ابن بوترابی باید که خاک باشی

درباره سیرت غنی باید تذکر دهیم که او با وجود آن همه صفات که باعث ستایش اوست و قبلاً بآن اشاره شده نسبت بزنان خیلی بدبین است. در رباعی ذیل از ایشان بذلت و حقارت ذکر کرده است :

هر مرد که با زنان بخلوت بنشست
بر عارض خویش غازهٔ خواری بست
ننگ سر انگشت که در پنجهٔ دست
نسبت بهر انگشت فروتر بنشست

در تذکرهٔ حسینی نوشته شده است : " شاعر ماهر یک فنی ..... آب و رنگ گلستان سخندانی .... دیوانش سراپا انتخاب است" ص ۲۲۸ و مؤلف مرأة الخیال در بارهٔ او مینویسد " آنچه از طبع وقادش سرزده بود امروز در ایران و توران و سواد هندوستان بر افواه والسنه جاری است.

و این شعر از غیب دانیهای اوست :

نگردد شور من مشهور تا جان در تنم باشد
که بعد از مرگ آهو نافه بیرون میدهد بو را

ص ۱۶۲

و همین مؤلف غزل ذیل غنی را نقل کرده است :

جنونی کو که از قید خرد بیرون کشد پا را
کنم زنجیر پای خویشتن دامان صحرا را
غنی روز سیاه پیر کنعان را تماشا کن
که نور دیده اش روشن کند چشم زلیخا را

در نگارستان فارس نوشته شده است که در مدت حیات غنی دیوانش شهرت نیافت اما پس از وفات وی در ایران و توران و روم و شام هر جا منتشر گردید". ص ۱۸۲ و خود

غنی باین مطلب نیز اشاره کرده :

شعر دگران را همه دارند بخاطر
شعری که غنی گفت کسی یاد ندارد

در تذکرۂ نصر آبادی نوشته شده است : "حقاکه درست سلیقه و غریب خیال بود اشعارش همگی لطیف است" ص ۴۴۴ و مؤلف شمع انجمن میگوید : "در کمتر روزگار حیثیتی بهم رسانید. آخر بغواصی بحر سخن افتاد و جواهری که بنقد جان توان خرید بیرون آورد . . . . دیوانش سایر و دایر است" ص ۳۴۹ . ۳۴۳ صاحب ریاض الشعرا مینویسد : "درستی زبان و روانی الفاظ و لطافت معانی او مقبول همه بود . والحق از خطۂ کشمیر مثل او کسی برنخاسته" ۵۰۳ غ مؤلف تذکرة الشعرا مینویسد : "مثل او از کشمیر چه از ملک دیگر نیز از متاخرین کم برخاسته . در بستن مضامین تازه . . . . . و صفائی عبارت از همعصران بلکه از اکثر گذشتگان پیش قدم است . . . . . صائبا دویست بیت از دیوان او انتخاب زده" ص ۶۸ و صاحب نشتر عشق میگوید : "مثل او شاعری معنی یاب و محاوره دان از خطۂ کشمیر برنخاسته و باین خوبی و فصاحت تکلم نساخته . کلام او فی الحقیقت بهار کشمیر است . . . . از رنگینی فکر رنگینش چهرۂ گلرویان در غازه جوئی و از سواد مشکبارش طرۂ مرغولہ مویان در مشکبوئی" ج ۱۲۹۹م ۱۳۰۱ . مؤلف مرأة العالم گوید : "در ین فن طرز خاص اختیار کرده" ۵۰۵ غ

اما در آتشکدہ آذر نوشته شده است :

" از تمام کلیات او این یک شعر ملاحظہ و نوشته شد . بانکه گفته :

قاصد چه احتیاج که طومار روزگار
چون نامہ از شمار رسد بدر از ی روزگار

ص ۳۶۵

صائب (م ۱۰۸۱ = ۷۱ — ۱۶۷۰) در جواب غنی این غزل را سروده :

این جواب آن غزل صائب که میگوید غنی
باد ایامی که دیگ شوق ما سرپوش داشت

مؤلف مجمع النفائس مینویسد : "هر که از هند بایران پیش صائب میرفت صائب از وی می پرسید برای من از هند چه ارمغان آورده ای . و مرادش از ارمغان اشعار غنی بود .

در تذکرۂ حسینی نوشته شده است که صائب پس از شنیدن مطلع زیر برای دیدن غنی بکشمیر حرکت کرد :

حسن سبزی بخط سبز مرا کرد اسیر[2]
دام همرنگ زمین بود گرفتار شدم ص ۲۲۹

ولی روایت مزبور کاملاً اشتباه است . زیرا در فهرست موزه برتانیا نوشته شده است که غنی اولین شعرش را در سال ۱۰۶۰ هجری (۵۰ — ۱۶۴۹ میلادی) تصنیف کرد . و از لفظ غنی همین تاریخ پیدا میشود . و نیز در همین فهرست دیده میشود که غنی در عین جوانی مرد . و ما میدانیم

نیز در همین تذکره نوشته شده است که غنی از میان صد هزار بیت خود یک هزار انتخاب کرد و بقیه اشعارش را از بین برد . و منتخبات اشعارش را در دسترس صائب گذاشت . صائب ضمن مطالعه گفت کاش اینهمه اشعاری که در تمام عمر گفته ام باین کشمیری میدادند و در مقابل این یک بیت را بمن میدادند :

سری میانت شده اکر اله[1] ین
کرده جدا کاسۂ سرها زتن

(۱) کرال این لغت کشمیری است و رشته ای را میگویند که بدان کوزه گران کاسه را از چرخ جدا میکنند .

(۲) در خاتمۂ دیوان چاپی غنی نوشته شده است "ماقم الحروف میگوید عزیزی معتمد القول نقل میکرد که میرزا صاحب الفاظ بیدل میگفت که اگر این شعر از جلال اسیر میبود من گفتن شعر ترک میکردم که در لطافت لفظی و معنوی منفرد میبود" ص ۱۴۱

که صائب در سال ۱۰۴۱ هجری (۲ - ۱۶۳۱ میلادی) همراه ظفرخان احسن بکشمیر رفت، و علت رفتن صائب ملازمت با خان مزبور بوده است. مؤلف تکملة الشعرا مینویسد: «همین قدر که دیوان غنی است مشهور میرزا صائب شعر او را انتخاب کرد و باقی را در آب انداخت. باید فهمید که میرزا صائب چه ظلم و بی انصافی کرده خون همه مضامین او بر گردن صائب است.» ص ۲۷۷ اینهم اشتباه است. زیرا دیوان غنی را شاگردان وی مسلم و ملک شهید جمع و انتخاب نموده اند. مؤلف خلاصة الافکار میگوید: «با وصف ضیق فرصت سه چهار هزار بیت بلند از درمیان مرحوم بیادگار است.» فرغ و صاحب ریاض الشعرا دیوان غنی را دوهزار بیت گفته است. ازاین روایات هم سرزدن صدهزار بیت اشتباه بنظر میرسد. دیگر اینکه در خلاصة الافکار نوشته شده است که «غنی... صحبت میرزا صائب و حکیم و قدسی یافته.» فرغ و صاحب ریاض الشعرا میگوید: «غنی... صحبت میرزا را دریافته و با ابوطالب حکیم و... قدسی... صحبت داشته.» فرغ ازاین عبارات هم پیدا میشود که در مدت اقامت ظفرخان احسن و صائب در کشمیر غنی کودکی بیش نبود.

در خاتمهٔ دیوان چاپی غنی نوشته شده است: «نواب وحیدالزمان طاهر وحید (۱) دیوان او را هیکل بازوی خیال خود ساخته بود... بنازم انصاف میرزای مرحوم را.» ص ۱۰۴

غنی ارزش و هنر خویش را درک میکرد و سپس بر کمال خود در فن شعر و سخن فخر میکند:

اشعار آبدارم تا شد محیط عالم
انداختند در آب یاران سفینه ها را

〰〰〰

با یران سخنها رزان میرود
چه ایران سخن در جهان میرود

حاسد از کردهٔ خود گشت پشیمان که بزور
بر زمین زد تخم را و بافلاک رسید

〰〰〰

بود گویا طفل نو رفتار شعر تازه ام
از زبانم تا برون شد بر زبانها او فتاد

غنی فقط شاعر نبود بلکه هنرهای دیگر نیز می دانسته. اما وی در فن شعر احاطهٔ بیشتری داشت:

ز شعر من شده پوشیده فضل و دانش من
چو میوه ئی که بماند بزیر برگ نهان

غنی شاعر غزل سراست و در غزل سرائی بزرگ ترین خصوصیت وی ابداع و لطافت معانی میباشد. در نگارستان فارس نوشته شده است: «تخیلات خوش آیند و ابهام که شیوهٔ شعرای هنداست شیوهٔ او نیز بوده.» ص ۱۸۳ و در مثال شعر ذیل نقل شده است:

بی چراغیست اگر بزم خیالم غم نیست
مصرع رنجیته شمعیست که در عالم نیست

ما هر گفت که «مصرع رنجیته» را تا بحال هیچ شاعری بکار نبرده بود.

غنی یکی از شعرای هندی است که شعرای بزرگ ایران وی را گرامی می داشتند. اما در سبک هندی ماهیت شعرا بداع معانی و مضامین بدیع بوده است. غنی هم مثل شعرای عصر خویش نیز بهمین نکته توجه داشته و همواره در پی پیدا کردن معانی تازه بوده و از اینرو از سادگی و روانی و سهولت هرچه بیشتر دور میشده. و نیز ظاهر است که پیدا کردن معانی تازه در همان مضامین و مفاهیم کهنه و تکرار شده چه قدر امر مشکل میباشد چنانکه غنی باین مطلب اشاره میکند:

گر خامه را زکام بر آید زبان چه دور
شد بحر شعر خشکتر از جدول کتاب

وچون مردم نمیتوانستند چیزی تازه پیدا کنند اشعار
ان بیشتر مبتذل بود چنانکه ازاین شعر غنی برمی آید :

ازبسکه شعر گفتن شد مبتذل دراین عهد
لب بستن است اکنون مضمون تازه بستن

نیز غنی میدانست که فقط پیدا کردن معانی خوب کافی نیست .
ل کار شاعر این است که با مهارت آن معانی را بقالب شعر
در آورد :

آب بود معنی روشن غنی
خوب اگر بسته شود گوهر است

وظاهر است که همواره درپی فکر تازه وندرت خیال
بدن اشعار را پست و بلند میکند و از هم آهنگی آنها
بکاهد . و پس در یک هند اشعار شعرا یک پایه نیست
بشتر تک بیتها قابل توجه میباشد . غزلهای غنی هم از
ن عیب خالی نیست چنانکه او خود باین نکته اشاره میکند :

شعر اگر اعجاز باشد بی بلند و پست نیست
در ید بیضا همه انگشت یک دست نیست

امابعداً غنی سعی کرد که شعر او ازاین عیب خالی باشد
بلغة خودش کامیاب گردیده است :

بسکه پستی و بلندی شد زشعرم برطرف
میشود هر مصرعم با مصرع دیگر طرف

نبود بلند و پستی در شعر مو شکافان
یکدست باشد آری انگشتهای شانه

هنوز اشعار وی بحد کمال نرسیده چنانکه خود میگوید :

هرچند شد لبم چو لب جو زشعر تر
هستم هنوز تشنهٔ اشعار آبدار

تازگی وندرت از همه ابیات غنی پیداست چنانکه
از اشعار ذیل برمی آید :

حلقهٔ در نگر و رخنهٔ دیوار ببین
چشم در راه تو دارد در و دیوار بیا

هیچگه از سینهٔ صد چاک ما یاری نکرد
گرچه بستم رشته بر انگشت سوزن بارها

نیست باری در جهان سنگین تر از بار وجود
پشت خم شد زندگانی تا بسر بردیم ما

یار در چشم و نگه سرگرم صحبت وجوی اوست
پرده های دیده ام گویا نقاب روی اوست

از بستن نگه چه کُنی رنجه دست خویش
مشق اسیر کردن خونین دلان بس است

عاشقان را جنبش مژگان چشم یار کشت
عالمی را اضطراب نبض این بیمار کشت

کند در هر قدم فریاد خلخال
که حسن گل رخان پا در رکاب است

جز زیر خاک جای من خاکسار نیست
روی زمین ز مردم بالانشین پر است

تا کند از رخ زیبای تو دریوزهٔ حسن
جیب را غنچهٔ گل چاک از و دامن کرد

سر بپیش فکندن ز گنه داد نجاتم
صد طاعت ناکرده بیک سجده ادا شد

ریاض حسنش از خون دل من تازه میگردد
زردیم می پرد رنگ و برویش غازه میگردد

چاک پیراهن یوسف نبود بی معنی
خنده بر پاکی دامان زلیخا دارد

جامهٔ دیوانگی چون بر قد خود دوختم
بخیه‌ها از خار پا بر دامن صحرا زدم

کس پی تعظیم ما از اهل مجلس برنخاست
بهر پاس عزت آخر خود ز جا برخاستیم

ندارد تاب این دستم که پای نازکت گیرم
ز پا می افتم از شوق و سر راه تو میگیرم

تا در این گلشن چو تاک از می پرستی دم زدیم
سبحهٔ صد دانه را از بهر می برهم زدیم

نه درازدستی حسن شب و روز دادخواهم
نه زمین رسیده زلفت نه فلک گذشت آهم

جلوهٔ حسن تو آورد مرا بر سر فکر
تو حنا بستی و من معنی رنگین بستم

چون میوه ایم در باغ بی بهره از تماشا
فصل بهار بگذشت وقتیکه ما رسیدیم

رفت و کسی نه بدرا ز او نقش قدم هیچ سو
رنگ پریده ام مگر بود حنای پای او

غنی همواره مضامین نو ایجاد میکند و
از کسی اقتباس نکرده چنانکه گوید:

برندارم ز اشعار کسی مضمون را
طبع نازک سخن کس نتواند برداشت

از نزاکت او فتد مضمون من
گر بمضمون کسی پهلو زند

حتی اینکه مضامین خود را هم تکرار نمیکند:

در مکرر بستن مضمون رنگین لطف نیست
کی دهد رنگ ار کسی بندد حنای بسته را

اما دیگران از مضامین غنی استفاده میکردند و مثل اینکه افکار وی
را در اشعار خود می گنجانیدند چنانکه غنی در این اشعار باین
موضوع اشاره میکند:

دهد کی در حصار خط ز دزدان معنی روشن
کجا مهر از کلف محفوظ دارد خرمن مه را

برند پس از مردن ما معنی ما را
صد شکر که ماند است بیاران سخن ما

یاران برند شعر ما را
افسوس که نام ما نبرند

زمضمون دزدی یاران نمی باشد غم مارا
چنان بستیم مضمون را که نتواند کسی بردن

اما غنی در پیدا کردن افکار تازه و بدیع خیلی مبالغه کرده است
و چون پیداست هر شعری دارای تازگی باشد تصنع خیلی
زیاد در کار داده دیده میشود و ظاهر است که تصنع هر چه بیشتر
شعر را از وجیه آن خارج می کند و این گونه اشعار بیشتر
سست و پیچیده و بی لذت میباشد چنانکه در اشعار ذیل
خواهیم دید :

زبیعقلی چو طفل اشک بیک از دیدنی دانم
سر پستان تصور میکنم گوی گریبان را

فتد در خانهٔ جیبم گذار آن لعبت چین را
پر پروانه سازد شمع حسنش دامن زین را

نماید حکمتش چون در ضیا بخشی پر بیضا
گذارد پنبه را بر داغ ماهی از کف دریا

چو شکست دست و پایم مرهم دیگر نداشت
عاقبت بر خویش بستم تخته تابوت را

اصل مضمون در سبکهای هندی و عراقی یکی است . اما آنچه
که هر دو سبک را از یک دیگر جدا میکند این است که در سبک
هندی شعراء همان مفاهیم را بطرز نو و اسلوب تازه بیان
میکردند و این تازگی و ندرت بیشتر از تشبیهات و استعارات
و تمثیلات و تناسبات و مبالغات تازه پیدا می شود .
سلیس غنی هم مثل شعرای عصر خویش سعی میکرد که تشبیهات و استعارات
جدید بیاورد . مثلا می سراید :

تا دید سر برهنگی طفل اشک ما
دریا بدست موج کلاه حباب دوست

مانند نقش خاتم کز موم سر بر آرد
گر تن دهی بزمی گردد بلند نامت

تا سرکهٔ پیشانی دونان نچشیدیم
دندان طمع کند نشد در دهن ما

زبس بر خویشتن می بالم از ذوق گرفتاری
بسان بیضه می ترسم شکستن در قفس افتد

اما بیشتر تازگی تشبیهات با سستی توام می باشد . همچنین
گاه گاهی مبالغه های غنی خوب میباشد اما اکثر از دهن شعری کاه
از بسکه ضعیفم بیاد کمر او
جز مور کسی نیست غنی گورکن ما
همین طور تناسبات که یکی از محاسن شعری است چون بحد
افراط میرسد هنر خود را از دست میدهد . سرتاسر اشعار
غنی پر از تناسبات میباشد :

برای آوردن افکار نو تمثیل در سبک هندی خیلی جلو رفته
است . شبلی می گوید : "کلیم میرزا صائب و غنی آنرا گوئی
یک فن خاص قرار دادند" ج ۳ ص ۱۹۲ غنی از تمثیلات
خویش یک جهان نو پیدا میکند و گاه گاهی در اشعار او
تمثیلات پر ارزش دیده میشود چنانکه از اشعار ذیل بر می آید

زنهار ایمن مباش ای غافل از خشم حلیم
چون زمین در جنبش آید خانه ها ویران شوند

بعد مرگ گر خورد افسوس آن سرکش چه سود
مرگزد انگشت شمع از ماتم پروانه ها

~~~

تا بوت مرده ای و دشمن هشیار کرد ما را
پا بی بخواب رفته بیدار کرد ما را

~~~

فارغ بود از آفت گیتی دل روشن
از برق زیانی نرسد خرمن مه را

~~~

رفیق اهل غفلت عاقبت از کار می ماند
چو یک پا خفت پای دیگر از رفتار می ماند

~~~

بر تواضعهای دشمن تکیه کردن ابلهی است
پای بوس سیل از پا افکند دیوار را

اما بیشتر تمثیلات غنی سست و دور از کار می باشد چنانکه در مثالهای ذیل خواهیم دید :

سنگین دلی است هر که بظاهر ملائم است
پنهان درون پنبه ببین پنبه دانه را

~~~

میکند ویران تمول خانه معمور را
انگبین سیلاب باشد خانه زنبور را

~~~

دلم را خال او دزدیده در گرد خطش جویم
که سال برده را دزدان نهان در خاک می‌سازند

~~~

کی توانگر شد ز دنیا چشم دنیا دار سیر
تشنگی زائل نگردد هرگز از آب دهن

صنایع و بدایع از لوازم سبک هندی است و غنی همواره افکار و معانی نو را با استفاده از اینها جلوه می برد مثلاً می سراید :

کس وقت نزع بر سرم از بیکسی نبود
شرمنده ام ز عمر که آمد بسر مرا

~~~

نگر ز خار مغیلان تغافلی دیده است
که چشم آبلهٔ پا پر آب می بینم

آنچه دربارهٔ غنی تاکنون گفته شد ما را باصل و هنر شعری نمی رساند چون شعر چیزی دخل است باید آثار یک شاعر نو آئینه جذبات او و دیگران باشد . اما چون شاعران سبک هندی بیشتر در پی ایجاد معانی نو بودند از روحیه شعر غافل میشدند ۔ هنوز در آثار غنی ابیاتی دیده می شود که زائیده تاثرات عمیق شاعر بوده و از همه گونه تصنع خالی و روان میباشد چنانکه از مثالهای ذیل بر می آید :

در حشر شد باهل گنه ابر رحمتی
انداختم چه دامن تر را بآفتاب

~~~

کس ز فیض بحر جودش در جهان محروم نیست
پشت ماهی پر درم پشت صدف پر گوهر است

~~~

بعد مردن هم نگردم سیر از صهبا کشی
می بخُم نوشم چه گردم خاک در میخانه ها

~~~

چون قبله نما خضر ره اهل جهان باش
سرگشته خود در ره همای دگران باش

~~~

در دیدهٔ من نهان ز مردم
ای راحت جان چو خواب بنشین

درمیان جنبه های غم و شادی شاعر جنبهٔ غم و اندوه قوی‌تر میباشد. و اگر شاعری میخواهد آثارش درست عکس تصورات قلبی او باشد حتما باید درد داشته باشد. و لذا در آثار غنی هم البته بندرت ابیاتی می یابیم که احساسات غمگین شاعر را بیان میکند چنانکه در اشعار ذیل مشاهده میشود:

مارا ز آفتاب قیامت غنی چه باک
دوزخ تراست از عرق انفعال ما

~~~

همچو آتش روشن از من بود شمع هر مزار
منکه مردم کس چراغی بر سر خاکم نریخت

~~~

از جوی حرص بیش نخوردم ز قطره ای
آن نیز عاقبت عرق انفعال شد

~~~

هیچکس بر حال ما رحمی نکرد
تشنه لب مردیم و چشمی تر نشد

غنی شاعری سنجیده است و تمسخر و هزل از سیرت وی دور میباشد اما گاه گاهی در آثار او شوخی و خوش مزگی دیده می شود:

تا شود قبرش زیارتگاه ارباب ریا
خویش را زاهد بزیر گنبد دستار کشت

در همهٔ اصناف شعر فارسی غزل هرچه بیشتر با نزاکت و محدود است و چون غزل بهترین صنف برای ابراز احساسات میباشد باید صنعت مزبور به روحیهٔ شاعر قریب تر باشد. اما غنی در صدد آوردن افکار نو گاهی از حدود غزل خارج میشود و هرچه زائیدهٔ تخییل اوست در آن می گنجاند و درنتیجه نزاکت غزل بیشتر آنها را قبول نمی کند چنانکه در اشعار ذیل می بینیم:

ابر طالع را تماشا کن که در فصل بهار
بیضهٔ بلبل برای گلشن ما ژاله شد

~~~

خواستم پاک از خس و خاشاک سازم دانه را
مزرع عمرم را مور از سوراخها غربال کرد

~~~

چو بستم نامه بال کبوتر بسته شد پایش
تو گوئی حلقهٔ دام است نقش مهر مکتوبم

همچنین زبان غزل هم محدود میباشد و هر لغتی نمیتواند جزو زبان غزل شود. اما شعرای سبک هندی چون در معنی آفرینی از حد اعتدال خارج شدند هر لغتی که میخواستند داخل غزل میکردند. سپس در آثار غنی لغاتی است که با نرمی و لطافت و روانی غزل نمی سازد و ازروانی شعر کاسته می شود چنانکه در مثالهای ذیل دیده می شود:

ترک نمک گرفت نمک را خراب کرد
آخر نمک حرامی داغم کباب کرد

~~~

شیخی پارسا از سبحه گردانی پشیمان شد
که انگشتش چو مسواک از ندامت در دندان شد

بکارگاه تماشا نقاب روی ترا × زتار شعشعهٔ آفتاب می بندند
دل ممسک طمع از وسوسهٔ حرص نیارغ نیست × زره بیضهٔ فولاد بود گرچه زرش
دیوان غنی را شاگردان وی مسلم و ملک شهید جمع و انتخاب کرده اند. دیوان [illegible] با مقدمه ماهر در مطبع نول کشور لکهنؤ چاپ رسیده و دارای [illegible] بیت است.

(پایان)

مدیر محترم۔ تسلیمات۔
تین ماہ قبل بلدۂ حیدرآباد دکن میں احیائے ادبیات فارسی کے سلسلے میں ایک انجمن "بزم سعدی" کے نام سے قائم کی گئی ہے۔ دیگر مقاصد کے منجملہ فی الحال اس بزم نے اپنے دو طرحی مشاعرے بڑی ہی کامیابی سے منعقد کئے۔ امید ہے کہ یہ بزم اپنے دوسرے مقاصد کو بھی باحسن الوجوہ پورا کرے گی۔
یہ اعادہ تحصیل حاصل ہوگا کہ فارسی زبان میں علم و ادب کے بیش بہا خزائن پوشیدہ ہیں اور ان سے استفادہ کے مواقع ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔
اس لئے اس زبان کے احیاء میں جس قدر بھی سعی کی جائے کم ہے جبکہ بالواسطہ زبان اُردو کی ترقی کے لئے فارسی کا جاننا ازبس ضروری بھی ہو۔
نظر برآں "آہنگ" کی اہمیت و ضرورت اور بڑھ جاتی ہے جب ہم اس کو ان اغراض کی تکمیل میں غایت درجہ سرگرم عمل پاتے ہیں میں ارباب "بزم سعدی" اور اپنے حلقۂ اثر میں اس رسالے کے تعاون کی مقدور بھر کوشش کروں گا۔ خداے تعالےٰ آپ کی ساعی کو کامیاب فرمائے۔
لگے ہاتھوں "بزم سعدی" کے طرحی مشاعرے میں سنائی ہوئی غزل بغرض اشاعت مرسل خدمت ہے۔ امید کہ پسند فرمائی جائے گی۔

آپ کا مخلص
محمد شمس الدین تاباں عفی عنہ حیدرآباد دکن

نذرِ سعدی

ای شہریار خوبان لطف و کرم خدا را — یا در کنار ...ی یا کردہ ئی کنارا
در شکل یار دیدم خود را خود آشکارا — صد بار چاک کردم جملہ حجاب ہا را
حزن و ملال دنیا خوف و خیال عقبیٰ — غرق می خودی کن افکار نا سزا را
شکر جہان کشیدن بی کیف عشق مردن — کافیست این سزائی دامن کش و فا را
در کوی حسن و الفت عمری گذشت لیکن — با چشم پاک بین و با قلب پارسا را
دی روز دل ربودی امروز جان ببردی — شکرت اسیر کردی صبر گریز پا را
ہرچند من غریبم لیکن غیور ہستم — شاید کہ تو نہ دیدی سلطانیٔ گدا را
در راہ شوق جانان بے باک تر قدم زن — بگذاشت بر من ای دل انجام کارہا را

از قلب و روحِ تاباں صبر و قرار بردی
ای آشنا چہ کردی با یار آشنا را

رس جناب آقای
ز احسان یارشاطر

ادبیات ایران پیش از اسلام

۱- منظور ما از ادبیات پیش از اسلام فعلاً آثاری است
. از زبانهای آریائی که در این سرزمین بدانها سخن میگفته اند
باماندہ است.

۲- اقوام ایرانی در اواخر هزاره دوم پیش از میلاد
یران روی آوردند و بتدریج در نواحی مختلف آن جای
رفتند.

اقوام پارسی و مادی و پارتی و سغدی و خوارزمی
ین زمره اند.

۳- زبان این اقوام از یک ریشه بوده و باهم نزدیکی
سیار داشته اند - همچنین این زبانها از زبان سانسکریت بخصوص
بان سرودهای ودا بسیار نزدیک بوده است. این معنی از
مایسه زبانهای قدیم ایرانی چون اوستائی و فارسی باستان
سانسکریت ودا آشکار میشود - از زبانیکه نشار این زبانها
د اثری بجا نمانده ولی از مقایسه زبانهای مذکور میتوان
یگونگی آن پی برد.

۴- زبان اقوام مختلفی که بایران آمدند هر یک جداگانه بر
ل یافت و بتدریج تفاوت این زبانها بیشتر شد تا آنکه امروز
ھی از این لہجه ها با یکدیگر تفاوت کلی دارند.

۵- درمیان زبانهای ایرانی دو دسته عمده میتوان تشخیص
اد - دسته شرقی و دسته غربی این تقسیم بر حسب شباهت دستوری
غوی این زبانهاست - زبانهای هر دسته با وجود آنکه تطور
داگانه داشته اند بهم نزدیک اند.

۶- دسته شرقی شامل سغدی و ختنی و خوارزمی راستی
یشتو و بعضی از لہجه های فلات پامیر است - دسته غربی شامل
ارسی باستان و پارتی و پهلوی و کردی و بیری و لہجه های
رکزی ایران است - زبان اوستائی از جهاتی بهر دو دسته
شبیه است.

۷- از زبانهای دسته شرقی که امروز متروک اند سغدی و خوارزمی
و ختنی آثار کتبی بجا گذاشته اند - استی در قفقاز و پشتو در افغانستان
متداول است - از زبانهای دسته غربی که امروز کسی بانها سخن نمیگوید
فارسی باستان و پارتی و پهلوی صاحب آثار عمده هستند - از زبان
اوستائی که زبان یکی از نواحی شرقی ایران بوده تنها کتاب اوستا
بجا مانده است.

۸- اوستا کتاب مقدس زرتشتیان مهمترین اثری است
که از زبانهای ایران قدیم بما رسیده - اوستا نخست مفصلتر بوده
ولی بعض اجزاء آن در حوادث سیاسی از میان رفته است،
همه اوستا در یک زمان نوشته نشده بلکه بتدریج انتشار شده است و
بهمین جهت زبان آن یکسان نیست.

۹- قدیم ترین قسمت از اوستا (گاتها) یعنی سرودهای خود
زرتشت است که موضوع آن ستایش اهورا مزدا خدای بزرگ و
بیان آفرینش و پیامبری زرتشت و مدح راستی و منع از قربانی
حیوان و ذکر بدکاری اهریمن و دیوان و وعده رستگاری و غلبه
راستی است - زبان گاتها ابتدائی تر و کهن تر - سایر قسمت های
اوستا تازه تر است و شامل دستورهای دینی و سرودهای مذهبی
و ستائش ایزدان زرتشتی و آداب و رسوم عبادت است - شاید
که مهم ترین جزو این قسمت از اوستا ست سرودهای زیبا و دلکش
است در ستایش ایزدان و فرشتگان زرتشتی که عموماً در اصل خدایان آریائی بوده اند
زبان اوستا بزبان زرتشت وابسته است و در زمان زرتشت
تردید است روایات زرتشتی که باحتمال قوی دور از حقیقت نیست
وی را در حدود قرن ششم پیش از میلاد قرار میدهد.

۱۰- اوستا بخطی نوشته شده که در اواخر دوره ساسانی (در
حدود قرن ششم میلادی) برای همین منظور از خط پهلوی اقتباس

شده است - خط اوستائی خط الفبائی است و مصوت است -

۱۱ - زبانهای ایرانی بموازات یکدیگر در فلات ایران رواج داشته اند - اما در مرکز سیاسی ایران زبانهای ذیل بترتیب تاریخی تفوق یافته اند - مادی - فارسی باستان - پارتی پهلوی و دری - برتری یافتن هر یک ازاین زبانها با حوادث سیاسی مرتبط بوده است - این زبانها همه متعلق بدستهٔ غربی زبانهای ایرانی اند -

۱۲ - از زبان مادی که زبان خاندان مادی (۵۰۰ ق م - ۵۵۰ ق م) بوده اثر مستقلی بجا نمانده ولی بسیاری از کلمات آن در کتیبه های هخامنشی آمده است - پیدا است که با زبان فارسی باستان و اوستائی بسیار نزدیک بوده است - تشخیص کلمات مادی در درجهٔ اول برحسب قواعد زبان شناسی است -

۱۳ - با استقرار خاندان هخامنشی (۵۲۹ ق م تا ۳۳۰ ق م) فارسی باستان در صف مقدم زبانهای ایرانی قرار گرفت - از این زبان کتیبه های متعدد از شاهان هخامنشی خاصه داریوش بر صخرهٔ بیستون است - از پنج ستون که مهمترین کتیبه های عالم است موضوع آن شرح نسب و فیروزیها و حکومت داریوش است -

(۱۴) کتیبه های فارسی باستان عموماً بخط میخی نوشته شده - خط میخی فارسی باستان خط الفبائی نیمی و سی و شش حرف دارد - و از خطوط میخی ایلامی و بابلی ساده تر و کاملتر است -

۱۵ - زبانهای اوستائی - مادی و فارسی باستان دستور زبان مبسوط و پیچیده دارند - اسامی و صفات و ضمایر چنانکه در سانسکریت و یونانی و لاتینی معمول است صرف میشوند - مفرد و تثنیه و جمع - مذکر و مؤنث و خنثی دارند - افعال نیز مفصل است -

۱۶ - با انقراض خاندان هخامنشی و رخنه کردن تمدن یونانی و پس از استقرار خاندان اشکانی (۲۵۰ ق م تا ۲۲۴ م) زبان پارتی که متعلق زبان این خاندان بود در مرکز سیاسی ایران تفوق یافت - از این زبان دو نوع اثر عمده موجود است - یکی کتیبه های پارتی که عموماً داخل دوره ساسانی است - و دیگر آثار مانوی - کتیبه های پارتی بخطی مقتبس از خط آرامی نوشته شده و در آنها هزوارش بکار رفته یعنی کلماتی که بآرامی نوشته میشده و بپارتی خوانده می شده است - از مهمترین این کتیبه ها کتیبه (پایکولی) است - آثار مانوی پارتی مشتمل بر سرود و مناجات و غیر اینها است و بخط مانوی که مقتبس از خط سریانی است نوشته شده و هزوارش ندارد -

۱۷ - با استیلای خاندان ساسانی (۲۲۴ م تا ۶۵۲ م) زبان پهلوی که دنبالهٔ فارسی باستان است برتری یافت - این زبان نزدیک بزبان پارتی است و آثار عمدهٔ آن چهار نوع است - کتیبه های پهلوی و آثار کتابی و آثار مانوی و سکه و مهر و نگین -

۱۸ - کتیبه های پهلوی عموماً متعلق بدوره ساسانی است و بخطی مقتبس از خط آرامی - ولی جدا از خط پارتی - نوشته شده و در آنها (هزوارش) بکار رفته -

مهمترین کتیبه پهلوی کتیبه شاپور اول است در کعبه زرتشت) در نقش رستم -

۱۹ - آثار کتابی پهلوی وسیع ترین آثار ایران پیش از اسلام است و قسمت عمدهٔ آن آثار زرتشتی است - این آثار بخط پهلوی نوشته شده که دنبالهٔ خط کتیبه های پهلوی است و هزوارش دارد و خط ناقص و دشواری است -

۲۰ - از آثار زرتشتی کتابهای "دینکرت" و "بندهشن" اعتبار خاص دارند - از کتابهای غیر دینی کتابهای "کارنامهٔ اردشیر بابکان" و "یادگار زریران" و "درخت آسوریگ" در خور ذکرند - زبان پهلوی بزبان فارسی امروز نزدیک است -

۲۱ - آثار پهلوی مانوی بخط مانوی نظیر خط مانوی و پارتی نوشته شده بعض از آنها منظوم است - هزوارش در این خط بکار نمی رود - زبان این آثار با مختصر تفاوتی همان زبان پهلوی آثار زرتشتی است ولی ارزش ادبی آنها بسیار بیشتر است - قسمت عمدهٔ این آثار در کاوشهای ترکستان چین خاصه تورفان بدست آمده -

۲۲ - زبانهای پهلوی و پارتی مانند زبان فارسی کنونی که پیش از تسلط عرب زبان رسمی ایران شد نسبت بزبانهای فارسی باستان و اوستائی زبانهای ساده اند یعنی دستگاه افعال آنها ساده تر است و اسامی و صفات و ضمائر عموماً صرف نمی شوند - و تثنیه و تشخیص جنس (مذکر و مؤنث و خنثی) در آنها از میان رفته است

(باقی دارد)

...ل بهجت اسعادی — آقای جوش ملیح آبادی شاعر معروف اردو

غزل

غزل سرایان ما هرروز برد ست همواره غزل را در کر تت
...ی میسرایند و درا توال عادی کیفیت واحدی در لمحه
...حد بر نفس انسانی طاری می شود. اما برعکس آن می بینیم که علی العموم
...ای جذبه وا حد در غزلها جذبات متعدد و متضاد کارفرما می
...شد. از نیرو میتوانیم گفت. اگر بار ای برخی از نقادان را
...یع بدانیم که شعرا در غزل خود اکثر و بیشتر وقایع زندگی خود را شرح
...ید هند به وقایع زندگی بیگانگان کمتر تماس دارند، باید برای
...ست آوردن معیار غزل سیرت و کردار و مضامین غزل گو را
...دقت تحت مطالعه بگیریم که آیا قول و فعل وی باهم مطابقت و هم
...هنگی دارد یا تضاد؟ بیایید همین زمینه را تحت تجزیه و سنجش بگیریم
... آیا شاعر غزل گو از کردار و شخصیت خود سخن میراند یا نه؟ برای
...ثال "ریاض" شاعر مشهور اردو را ببینید.

ریاض شاعریست که مدار شهرت او بر خمریات است تمام
...ردم میدانند که وی در تمام عمر خود یک قطره شراب هم نچشیده
...د. از نیرو میتوان گفت که کلام ریاض ابدا مظهر سیرتش نبوده
...له صریحا برعکس آنست. پس هر چه که او درباره خمریات سروده
...طابقتی با سیرت و کردار او ندارد و ازین استنباط میشود که ریاض
...شخصیت و سیرت خود حکایت نکرده و کلامش از واقعیت عاری
...ست. و هم ازیرو ست که آنرا کلام فطری گفته نمی توانیم. در
...ینجا ممکن است کس بگوید که اشعار ریاض اگر مظهر سیرت و کردا
...روش نیست البته نماینده دهاکی وقایع حیات دیگر خواهد بود.

در جواب این میتوانیم گفت که شاعر در کلام فطری و طبیعی
...یش همواره از خود حکایه مینماید نه از دیگران. و اگر از دیگران
...یزی میگوید آنهم باندازه. نمک است در آرد، نه اینکه نمک
...آرد فراوان گردد. از ماکولات و مشروبات نمی توان بدون چشیدن

ذائقه آنرا حکایه کرد. مثلا اگر کسی را در حالت خوردن شهد می بینیم
محض بمشاهده از لذت آن بهره مند نمی شویم. ذائقه آنرا همان
شخص می فهمد که خودش چشیده باشد. همچنان اگر کسی را هنگام نوشیدن
شراب ببینیم فقط به دیدن آن مخمور شده نمی توانیم. پس اگر شاعری
شیرینی عسل و یا نشه، شراب را بدون تجربه در شعر خود تذکار میدهد
شعرش با حقیقت کلام هیچ ربطی ندارد و چنین کلام را در مجموعه اشعار
حقیقی شمرده نمی توانیم.

همچنان در مجموعه. غزلهای امیر مینائی لکهنوی دقت نمایید
شاعر موصوف در شخصیت خود یک مرد متقی و چشم و چراغ خانواده
حضرت شاه ضیا بوده تقدس و تقشف موصوف بحدی بود که بدترین
دشمنان او نیز تصدیق میکنند. شاعر موصوف در عمر خود نه فقط زنان
فاحشه بازاری را ندیده بلکه بزن نامحرم و امرد خوبرو هم نگاهی نکرده
بود. ولی اگر نظر به کلام شاعرانه وی بیندازیم می بینیم که سرتاسر کلام
او از شرح عشوه گری و غمازی زنان بازاری و نازو ادای امردان
زشت کردار و احساسات شاهد پرستی و تذکار غلغله، می نوشان
طافح مملو است.

چقدر جای تعجب است که شخصی ابدا لب بشراب نمی آلاید
و بر کسی هم عاشق نمی شود. اما هنگام سرودن غزل هم میکش و هم
شیدای دلداده میگردد. ازهمین قرار مشاهده رسیده که شخصی رند
مشرب که پیشه او دائما عشق و عاشقی بوده، لیکن در غزلهای خود
مسائل تصوف و اقوال ایمان افروز را بیان میکند. آیا چنین
طرز کلام را شاعری گفته میتوانیم؟ و این اسلوب کلام بر روی
شعرا و رخسار شاعری جهان سیلی زدن نیست؟

نکته دیگری درین باره درخور توجه میباشد که قسمت بزرگ
اشعار و غزلیات شاعران ما یعنی فیصد هشتاد عاشقانه است و

... قدرت کامل داشت. در علوم منطق و ادب و ... صرف و نحو و معانی و هندسه و نجوم و طبیعی و فقه تبحر دارد چنانچه مکالمه میرلال (بنگله) وطفل الکن که در زبان ... به نهایت حسن، نوشته شده بسیار جالب نظر است و اگر ... دی انصاف دیده شود، بعد از کلیم همدانی کمتر شعرا عدیل و نظیر او می باشند و این دعوی برتری که از رشحات قلم وی است غلط نیست ؎

چون من پس از وصال نیابی کس
صد سال اگر به کاوی ایران را

علامه شبلی در شعر العجم جلد سوم و صفحه یک صد و هشتاد و نه می نویسد در اواخر عهد ایران فی الواقع قاآنی چنان شخصی رو به عرصه عالم نهاد که در عالم شاعری انقلابی عظیم پیدا کرد. اما سخن سرائی وی نو نبودی بلکه خواب هفت صد ساله را که فراموش شده بود بیاد آورد و این غلط نیست که فرخی و منوچهری بار دیگر در قالب قاآنی رونمودند.

میرزا غالب میگفت که "قصائد از قاآنی آغاز شده بر او تمام شد" پروفسور براؤن در کتاب معروف خودش "یک سال در ایرانیان (A year Amongst the Persians)" چنان می نویسد "قاآنی المتوفی سنه ۱۸۵۴ شاعر عظیم دوره حاضر است. او در مدح و ذم عدیل نداشت. در تشبیه و استعاره و سلاست و روانی کسی همسر وی نبود اگرچه دارای علوی بیان و روحانیت مولانا جامی و شوخی و فلسفه جبر خیام و رفعت و شوکت الفاظ فردوسی نیست اما گاهی روانی و تفنن طبعش چنین بی مثل بود که در جای دیگر نتوان دید."

کلام قاآنی خیلی روان و سلیس و پر از موسیقی است

در کلامش چستی بندش و برجستگی الفاظ و انتخاب بحور چنان بکار برده که در نظمش نغمه مجسم مشاهده می شود و این روانی و نغمه طرازی از مختصات قاآنی ست. در تشبیب قصائد . . . .

. . . چنان تردستی بکار برده که در سلاست بیان و صفائی زبان تغیری پیدا نشود و این بهاد و انکلای آن شاعر نادر روزگار دلالت می نماید. از مطالعه قصائد وی چنان آشکار می شود که دو و تمام ... بی تکلف با هم پیوسته اند. در شعرای متقدمین ایران این وصف جز فرخی در شخصی دیگر نظر نمی آید. اما قاآنی در ترنم و نغمگی از و فرزان تر است. میخواهم تشبیب قصیده ای که در وصف عید نوشته این جا ذکر بدهم.

عید شد ساقی بیاور گردش آور جام را   پشت پا زن در جهان گردش ایام را
سین ساغر بس بود ای ترک ماه روز عید   گو نباشد هفت سین رندان دُرد آشام را
خلق را لب بر حدیث جان توهست و من   از شراب کهنه می جویم لبالب جام را
یک دگر را خلق می بوسند بس با شین غم گر   گرچه بوسه گیرد آن شوخ شیرین کام را

اشعاری چند از قصیده بهاریه ملاحظه شود که موزونی و برجستگی الفاظ و فقرها در تمامی اشعار روح موسیقی دمیده.

نسیم خلد می وزد مگر ز جوی بارها   که بوی مشک می دهد به هوای مرغزارها
فراز خاک و خشت ها دمیده سبزه کشتها   چه کشتها بهشتها نه ده نه صد هزارها
زنیق جو شفیق خو عقیق لب شفیق بو   زنیق زلف و دنیق موجه موز مشک تارها

قاآنی در حمد باری تعالی   قصیده ای خیلی شور انگیز و جالب نوشته که مطلعش اینست.

یارب به پادشاه رسل ماه هاشمی   یارب به هنمائی سبل شاه لافتی

در واقعه نگاری قاآنی از فردوسی پیروی نموده و حق اینست که درین صفت جز فردوسی، تمامی شعرای ایران با وی دعوه همسری ندارند، در تشبیب قصیده ای بهاریه آمد بهار و اثرات که از وی پذیر می شوند مجالس عیش و بزم غزل و بدمستی مردمان را به چنان جا بگذشتی بیان می کند که خوانندگان را مسحور می سازد و این یک جور محاکات نگاری باشد که آن را در زبان انگلیسی "سین" می گویند، ملاحظه شود:-

بهار آمد که از گلبن همین بانگ بهار آید   بهر ساعت خروش مرغ آز مرغزار آید
تو گوئی ارغنون بستند بهر شاخ و هر برگی   ز بس بانگ هزار و صلصل و دراج و سار آید
بجوشد مغز جان چون بوی گل از شاخ برخیزد   به پرد مرغ دل چون مرغ دل از شاخسار آید
ز هر سوئی نوای ارغنون و چنگ و نی آید   ز هر کوئی صدائی بربط و طنبور و تار آید
الا یا ساقیا می ده بیان من صابر ده   دمادم می خورد می ده که می ترسم خمار آید

قاآنی بر مناظر نگاری هم قدرتی داشت. مناظر نگاری موضوع قدیم شعرائے ایران است. در میان شعرائی متقدمین ایران منوچهری و فرخی درین وصف خیلی زور طبع نموده، در شعرای متاخرین قاآنی درین خصوصیت عدیل خود نداشت، او در قصائد و نظم، مناظر

قدرت را چنان به ضبط تحریر آورده که اگر آن تصاویر لفظی را یکجا جمع
کنند یک مرقع عظیم بدست آید. در تشبیب یک قصیده منظر ابر و
باران، صدای رعد و برق و اثر آن بر سبزه و گلزار را چنین در
حیطه تحریر آورده:

گردون تیره ابری بامدادان شد پدیدار | جواهرخیز و گوهرریز و گوهربیز و گوهرزا
چو چشم اهرمن تیره چو پشت سوسمار | شده گفتی همه تیره به مغزش تیغ دندان‌ها
بدل گلشن به تن زندان که گه گریان گهی خندان | چو در بزم طرب رندان شده زانسان شوریده سودا

افزونی صنایع و بدایع که کلام شعرا را مامل به روان گرداند در اشعار
قاآنی و معاصرین او خیلی به مشاهده می رود. چون قاآنی شاعر قادرالکلام
بوده آنها را بجدی بکار برده که تاثیر اشعارش دو چند شد. از خواندن
کلام قاآنی ظاهر می شود که همه جا صفت ترصیع و صنعت سوال و جواب
تشبیه و استعاره را بطرز نو گنجانیده، مضامین مختلف التنوع
اختراع نموده. چنانکه در صنعت سوال و جواب او یک مرثیه معروف
تصنیف کرد که در زبان فارسی یک شاه‌کار است.

پس از بیان مختصات کلام قاآنی میخواهم یک نکته اهم را تذکر بدهم که
در میان شعرای متقدمین و متاخرین ایران قاآنی دارای مقامی
عالی است که بیشتر الفاظ متروکه قدیم را . . . . . مستعمل ساخت و از
اختلاط قدیم و جدید چیزی تازه را بوجود آورد و شعرا را که از روایات قدیم
منحرف شده بر جاده نوین رهسپار بودند به فنون قدما
منعطف گردانید.

بعد از مطالعه این دعوه ای که علامه شبلی در شعرالعجم کرد
. . . ." که اشعار فارسی از رودکی آغاز
نموده، به استثنای قاآنی بر صائب تمام شد." درست میتوان گفت که من
این چند کلمات پراگندهٔ خود را بر این شعر قاآنی به اتمام
برسانم.

چو من پس از وصال نیابی کسی
صد سال اگر به کاوی ایران را

(پایان)

بخت خجسته

در بند نیستم من و از بند رسته‌ام
یعنی طلسم بی خبری را شکسته‌ام
بر اعتلای میهن خود دل نهاده‌ام
بر ارتقاء کشور خود عهد بسته‌ام
زنجیر غفلتی که مرا بسته بود پای
از پای خود بدست توانا گسسته‌ام
بند فریب پاره نمودم ز دست و پای
آسوده خاطرم که از این بند جسته‌ام
توفیق خدمت وطنم تا بود نصیب
من شادمان ز طالع بخت خجسته‌ام

ابوغراب جبلی

سلام

از نتیجۂ فکر اعلیحضرت معلی القاب عزیز الدوله وزیر الملک نواب محمد اسمٰعیل علیخان بہادر نواب آف ٹونک المتخلص تاج

بشوز خونِ جگر زبان را و حمدِ ربِ انام برخوان — زآبِ دیده وضو کن اول پس وضو این سلام برخوان

پس درود و سلام بے حد تو این سلام نظام برخوان — صبا بسوی مدینه رو کن از این دعاگو سلام برخوان

"بگردِ شاهِ رسل بگرد و بصد تضرع پیام برخوان"

بآرزوی نظارۂ باغ و راغ هر زه بگرد هر جا — بشوقِ گلگشت و سبز عالم ندارد جز آن مدام خود را

پی مریضانِ گردشِ دهر سودمند است این مداوا — به بابِ رحمت گہے گزر کن به بابِ جبریل گہ جبینسا

صلوٰةُ ربی علی النبی گہے به باب السلام برخوان

بدر گریبان و دامنِ جان بریز خونِ جگر خدا را — به زیورِ بے خودی عروسِ جنونِ دل همچنین بیارا

به حالِ او دیده اشک بارد دلی که شد همچو سنگِ خارا — بروزِ من صورتِ مثالی نماز بگزار اندر آنجا

به لحنِ خوش سورۂ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمام اندر قیام برخوان

بنه بصد زاری و تضرع سرِ عقیدت بخاکِ آن کو — بنه باخلاصِ عاشقانه سرِ صداقت بخاکِ آن کو

به حالتِ سجده خاک گردد سرِ نیازت بخاکِ آن کو — بنه بچندین ادب طرازی سرِ ارادت بخاکِ آن کو

صلوٰة وافر به روحِ پاکِ جنابِ خیر الانام برخوان

مثالِ من پیکرِ رضا شو ز سر قدم کن همه وفا شو — چو شمعِ سوزان همه زبان شو به لغمۂ سوز هم صدا شو

چو تاج مضطر غزل سرا شو به کشورِ یثرب بردبا شو — به لحنِ داؤد هم نوا شو به نالۂ درد آشنا شو

بحرمِ پیغمبر این غزل را ز عبدِ عاجز نظام برخوان

گفتارِ حکمت

جناب آقائی علی اصغر حکمت
سابق سفیر کبیر ایران
در هند

خاک دهلی

تابان شده دل ز خاک دهلی
وز اختر تابناک دهلی
چشمم به نثار می فشاند
دُر دانه بخاکِ پاک دهلی
من مست ازان می ام که پرورد
دهقانِ ازل ز تاک دهلی
در چرخ فلک برقص آمد
مُطرب چو نواخت راگ دهلی
از آگره مگو و فتح پورش
شاهانِ جهان هلاک دهلی
از مسجدِ قطب و قلعهٔ سُرخ
هم ملک و هم ملاک دهلی
چون آتشِ طور آب جمناست
جان باد فدای خاک دهلی
لیکن ز فراق دوستداران
شد سینه هزار چاک دهلی
بس تاج هما ز رفته آنجا
گر رفت سری چه باک دهلی
چون ما همه خسته جان حکمت
صیدی شده در فتراک دهلی

غزل

دلِ ما بشامِ زلفت ز سحر خبر ندارد
شبِ محنت غریبان بجهان سحر ندارد
به بیا ز هند جانم بقفس درون چو طوطی
همه دشت پر ز شکر چه کند که پر ندارد
نکند سخن برهمن نه دهد ز عشق پندم
که بجانِ دردمندم سخنش اثر ندارد
من و آه پر شراری که جهان بسوخت آری
نفسم بسینه یاری بجز از شرر ندارد
چو روانِ رهنوردم بدیار نیستی شد
هم ازان وطن هوای سفرِ دگر ندارم
همه باغبان ز اول گل صورتِ تو میکاشت
که بگلستان در آخر ز تو خوبتر ندارد
ز تو نامه ای و از ما ز هزار دامن اشک
ز پی نثار چشمم به ازین گهر ندارد
دلِ حکمت پریشان بخدا برد غم جان
که ز لطف های پنهان دگری خبر ندارد

بیاد لکهنؤ

یک نکته بیا ز بنده بشنو
کاندر دو جهان ز کهنه و نو
در چار جهت بهفت اقلیم
بهتر نبود ز شهر لکهنو

سلام

از نتیجهٔ فکر اعلیحضرت معلی القاب عزیز الدوله وزیر الملک نواب محمد اسمٰعیل علیخان بهادر نواب آف ٹونک متخلص به تاج

بشوز خونِ جگر زبان را و حمدِ ربِّ انام برخوان ‌‌ ‌ زآب دیده وضو کن اول پس از وضو این سلام برخوان

پس از درود و سلام بے حد تو این سلام نظام برخوان ‌ ‌ ‌ صبا بسوی مدینه رو کن ازین دعاگو سلام

"بگرد شاهِ رسل بگرد و بصد تضرع پیام برخوان"

بآرزوی نظارهٔ باغ و راغ هرزه مگرد هر جا ‌ ‌ ‌ بشوقِ گلگشت و سیر عالم مدار جبران مدام

پیِ مریضانِ گردشِ دهر سود مند است این مداوا ‌ ‌ ‌ به بابِ رحمت گهے گذر کن به بابِ جبریل گسیبی

صلوٰةُ ربّی علی النبی گهے به باب السلام برخوان

دست زدام جم د جان ابتہ موی تیم

در دم این تپیدگی، در خودم این رمیدگی،

ساکنِ کنجِ بیخودی، بسملِ خوی کیستم!

جلوه گرم بهر جهت، نعتِ منست هر صفت،

سجده کنان بجان و دل، جانبِ سوی کیستم!

[illegible] جهان [illegible] پس نگنتم روان،

[illegible] کیستم!

اهمه دلبری و نازشیوه گرفته ام نیاز

خاکِ نمط بزیرپا در رهِ کوی کیستم!

(پروفیسر رشید احمد صدیقی)

قصۂ آدم کو رنگین کیا ہو یا نہ کیا ہو لیکن یہ حقیقت
...نات میں رنگینی اور اس کے سانسے زندگی
...ہے مسند زن حکیموں اور دانشوروں
...کا موضوع رہا ہے اور ہمیشہ سے فن کاروں کے اعصاب پر عورت سوار
...ہے، اسرار حیات کو کھولنے اور معرکۂ بود و نبود کو گرم رکھنے میں
...تخلیق کی اس دیوی کا ہاتھ رہا ہے، لیکن اس مشت خاک کی برتری
...بلندی کے باوجود مشاہیر عالم اور ارباب دانش و فہم نے اس کے ساتھ
...بڑے ظلم روا رکھے ہیں، گیٹے کا قول ہے کہ عورت کی تخلیق پسلی
...ٹیڑھی ہڈی سے ہوئی ہے جسے خود خدا بھی نہ سیدھا کر سکا۔ الفریڈ
...ی مسیت (Alfred de musset) نے عورت کو "سایہ" کہا ہے،
...کے پیچھے دوڑیے وہ دور دور بھاگے گی، اس سے دور بھاگیے وہ
...پ کا پیچھا کرے گی، شیکسپیئر نے کہا ہے کہ عورت میرے لئے اور خود اپنے
...ایک معمہ ہے (Nietzsche) ایک قدم اور آگے جاتا ہے اور عورتوں کو
...شیطان کے اعضاء سے تعبیر کرتا ہے۔

پیغمبر اسلام نے بجا طور پر نہایت واضح اور صاف لفظوں میں مذہب
عبادت، اور تعلیم و تربیت سے متعلق عورت کے حقوق اور سیاسی و سماجی
زندگی میں اس کے رتبے کا تعین فرمایا ہے اور دنیا کی نظروں میں اس کا مقام
بلند ہو گیا لیکن تعجب ہے کہ آنحضرت صلعم کے پیرو عموماً عورت کے ساتھ وہ سلوک
نہ کر سکے جس کی وہ صحیح معنوں میں حقدار ہے۔ خود ایران کی قدیم و جدید
شاعری میں شعراء نے عورت کی ذات سے تنفر کیا ہے اور اسے تمام برائیوں کا
سرچشمہ قرار دیا ہے، فردوسی کہتا ہے :

زن و اژدہا ہر دو در خاک بہ
جہان پاک ازین ہر دو ناپاک بہ

اسدی کا خیال ہے کہ :

زن نیک در خانہ ماراست و گنج
زن بد چو دیو است و مار شکنج

نظامی گنجوی کہتا ہے :

زن از پہلوی چپ گویند خاست
نیاید ہرگز از چپ راستی راست

جامی کا بھی یہی خیال ہے :

حضرت شاہ نیاز بریلوی

حضرت شاہ نیاز احمد صاحب نیاز، چشتی، قادری بن حاجی حضرت حکیم شاہ رح سرہندی مولدش سرہند است. تحصیل علوم ظاہری و باطنی از مولانا محمد فخر الدین صاحب دہلوی کرد و بعمر ہفدہ سالہ دستار فضیلت علم ظاہری بالای سر کرد و بدست حضرت مولانا محمد فخر الدین قدس سرہٗ بیعت کرد و بجگہ مرشد خود در بانس بریلی اقامت کرد باز بمقام رامپور بر دست مبارک شاہ عبد اللہ شاہ صاحب بغدادی کہ یکی از فرزندان حضرت غوث الاعظم رح بودند بیعت فرمود و بعمر ہفتاد و ہفت در بریلی تاریخ ششم ماہ جمادی الثانی ۱۲۵۰ھ ہجری بحق پیوست. حلقہ مریدانش از کابل تا کشمیر از و بدخشان دائرہ بود. این شاعر شیرین کلام متبحر شعرهای خودش بہ وحدت الوجود غوطہ ور شدہ میگوید از نیرو ہند ہا از کلامش فرح میبخشند نمونہ کلام حضرت نیاز رح برای خوانندگان محترم ہدیہ مینمایم۔

با ہمہ حسن و خوبیم، عاشق روی کیستم!
رستہ زدام جسم و جان، بستہ موی کیستم!

در دلم این تپیدگی، وز خودم این رمیدگی،
ساکن کنج بیخودی، بسمل خوی کیستم!

جلوہ گرم بہر جہت، نعت منست ہر صفت،
سجدہ کنان بجان و دل، جانب سوی کیستم!

مست ز بوی من جہان، در پس نکہتم روان،
والہ و مست در پی نکہت و بوی کیستم!

با ہمہ دلبری و ناز شیوہ گرفتہ ام نیاز
خاک نمط بزیر پا در رہ کوی کیستم!

جدید ایرانی شاعری میں عورت

از پروفیسر محمد عبدالحمید فاروقی ایم اے پی ایچ ڈی صدر شعبہ ہای فارسی اردو و اسلامک کلچر
(گجرات کالج احمد آباد)

میں شاعر کی اہمیت کا اندازہ اس سے کرتا ہوں کہ اس کا خدا، انسان اور عورت کے
متعلق کیا تصور ہے ہماری زندگی اور ہماری شاعری میں ان تینوں کو بڑا دخل ہے
جس شاعر کا جیسا تصور عورت کا ہوگا کم و بیش ایسا ہی تصور اس کا خدا اور انسان
کا ہوگا، انسان کی عظمت کا قائل خدا کی عظمت کا قائل ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا
.....“ (پروفیسر رشید احمد صدیقی)

ابلیس کے لہو نے قصۂ آدم کو رنگین کیا ہو یا نہ کیا ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ عورت کے وجود سے تصویر کائنات میں رنگینی اور اس کے ساز سے زندگی کا سوز دروں قائم ہے، ابتدای آفرینش سے مسئلۂ زن حکیموں اور دانشوروں کی توجہ کا مرکز رہا ہے اور ہمیشہ سے فن کاروں کے اعصاب پر عورت سوار رہی ہے، اسرار حیات کو کھولنے اور معرکۂ بود و نبود کو گرم رکھنے میں ہمیشہ تخلیق کی اس دیوی کا ہاتھ رہا ہے لیکن اس مشت خاک کی برتری و بلندی کے باوجود مشاہیر عالم اور ارباب دانش و فہم نے اس کے ساتھ بڑے بڑے ظلم روا رکھے ہیں، گیٹے کا قول ہے کہ عورت کی تخلیق پسلی کی ٹیڑھی ہڈی سے ہوئی ہے جسے خود خدا بھی اُسے سیدھا نہ کر سکا۔ الفریڈ ڈی میسیت (Alfred de musset) نے عورت کو "سایہ" کہا ہے، اس کے پیچھے دوڑیئے وہ دور دور رہے گی، اس سے دور بھاگئے وہ آپ کا پیچھا کرے گی، نتیشے نے کہا ہے کہ عورت میرے لئے اور خود اپنے لئے ایک مسئلہ ہے Richter ایک قدم اور آگے جاتا ہے اور عورتوں کو شیطان کے اعضاء سے تعبیر کرتا ہے۔

پیغمبر اسلام نے پہلی مرتبہ نہایت واضح اور صاف لفظوں میں مذہب عبادت، اور تعلیم و تربیت سے متعلق عورت کے حقوق اور سیاسی و سماجی زندگی میں اس کے رتبے کا تعین فرمایا ہے اور دُنیا کی نظروں میں اس کا درجہ بلند ہو گیا لیکن تعجب ہے کہ آنحضرت کے پیرو عموماً عورت کے ساتھ وہ سلوک نہ کر سکے جس کی وہ صحیح معنوں میں حقدار ہے۔ خود ایران کی قدیم و جدید شاعری میں شعرا نے عورت کی ذات سے تمسخر کیا ہے اور اُسے تمام برائیوں کا سرچشمہ قرار دیا ہے، فردوسی کہتا ہے :

زن و اژدها ہر دو در خاک بہ
جہان پاک از این ہر دو ناپاک بہ

اسدی کا خیال ہے کہ :

زن نیک در خانہ ما راست و گنج
زن بد چو دیو است و مار شکنج

نظامی گنجوی کہتا ہے :

زن از پہلوی چپ گویند برخاست
نیاید ہرگز از چپ راستی راست

جامی کا بھی یہی خیال ہے :

زن از پہلوی چپ شد آفریدہ
کس از چپ راستی ہرگز ندیدہ

لیکن انسانی فطرت کے تقاضوں سعدی کا تصورِ زن شاعروں سے بالاو برتر ہے۔

زنِ خوب و فرمانبر و پارسا
کند مردِ درویش را پادشا

مکتبی شیرازی بھی سعدی کا ہم خیال ہے۔

زنِ پرہیزگارِ زایندہ
مرد را دولتیت پایندہ

جدید ایرانی شاعری ۱۹۰۶ء کے انقلاب کی پیداوار کہی جاتی ہے جب کہ مظفر الدین شاہ نے مشروطہ (constitution) کی منظوری دی اور ایرانی پارلیمان کا قیام عمل میں آیا، اس انقلاب نے ایرانی معاشرت اور سیاست کے دھارے کو یک لخت موڑ دیا اس دور کے شاعروں کی نگارشیں ہمیں ایک نئے طرزِ فکر اور نئے موضوعات سے روشناس کراتی ہیں، یہ جدید شاعر اب حال و قال اور خال و جمال سے اپنے افکار کے جال نہیں بنتے بلکہ معاشی، معاشرتی اور عمرانی مسائل کو اپنے فکر و فن کی جولانگاہ قرار دیتے ہیں، پرانے اور فرسودہ نظام سے بیزاری اور ایک جہانِ نو کی تعمیر کو اپنی شاعری کا مطمحِ نظر ٹھہراتے ہیں۔

معاشرے کی از سرِ نو ترتیب و تہذیب کا جذبہ جدید ایرانی شاعروں کے دلوں میں اپنی پوری قوت سے موجزن ہے اور وہ ہر نقشِ کہن کو مٹانے پر تلے ہوئے نظر آتے ہیں، اصلاحات کا یہ جذبہ معاشرے کے ہر شعبے میں کارفرما ہے اور چونکہ عورت اس معاشرے کی ترتیب و تطہیر میں ایک اہم کردار متصوّر ہونے لگی ہے اس لئے جدید شاعروں نے عورت کو ایک نئے زاویے سے دیکھنا اور پرکھنا اپنا شعار بنایا ہے اب عورت ان کے لئے صنفِ نازک نہیں ہمسر اور ساتھی ہے جسے کارزارِ حیات میں مردوں کے دوش بدوش ستیزہ کار ہونا اور ایک جہانِ تازہ کی تعمیر کرنا ہے، اب عورت چراغِ خلوت نہیں شمعِ جلوت ہے، عار و ننگ قوم نہیں، آب و رنگِ ملت ہے۔

عورت کے اس نئے تصور اور احترام کی جھلک دورِ مشروطیت کے اکثر شاعروں کی تخلیقات میں ملتی ہے چنانچہ اشرف الدین اشرف پہلا شاعر ہے جس نے اپنی نظم "نصیحت یک خانم بدخترش" میں عورتوں سے براہِ راست مخاطب ہو کر انھیں بیدار ہونے اور علم و ہنر حاصل کرنے کا پیغام سنایا ہے بعض اشعار ملاحظہ ہوں۔

روزِ نشاطِ عالم است، ای دخترک بیدار شو
وقتِ بلوغِ آدم است، ای دخترک بیدار شو

آمد بشارت از فلک، دختر بود زُسکِ مَلَک
زین مژدہ ہا دل بیغم است ای دخترک بیدار شو

اندر اروپا سربسر در علم و تحصیلِ ہنر
زن افضل است و اقدام است ای دخترک بیدار شو

فرمود فخرِ کائنات: علم از برای مومنات
یار و رفیق و ہمدم است ای دخترک بیدار شو

فرمود ختم المرسلین: تحصیلِ علم و خط و دین
از بہرِ نسوان الزم است، ای دخترک بیدار شو

مشروطہ شد شہرِ وطن، سرزد شگوفہ در چمن
بر برگِ ہر گل شبنم است، ای دخترک بیدار شو

اسی طرح ایک نظم "فصلِ بہار" میں لڑکیوں کو گھر کی چار دیواری سے نکل کر علم و ہنر حاصل کرنے کی تلقین کی ہے۔

ای دخترِ من درس بخوان، فصلِ بہار است
بیکار بخانہ منشین، موقعِ کار است

~~~

یک چادری از عفت ناموس بسر کن
وانگاہ برو مدرسہ، تحصیلِ ہنر کن
خود را زکمالات و ہنر نورِ بصر کن
چون دخترِ بی علم و ہنر دہہ خوار است
ای دخترِ من درس بخوان فصلِ بہار است
~~~

ای دخترکان در طلب علم بکوشید
رخت هنر و معرفت از علم بپوشید

از زمزمۀ علم چو زنبور بجوشید
در حفظ شما شهپر جبریل حصار است
ای دختر من درس بخوان فصل بهار است

ایک نظم "مجمل احوال" میں اشرف کہتا ہے کہ لوگ اپنے سلسلۂ نسب کو سلاطین سلف سے ملانے کی کوشش کرتے ہیں کوئی کیقباد اور اسکندر اور کوئی کیانی اور ساسانی خاندان سے منسوب ہے، ہر شخص اپنے باپ دادا کے نام سے ملقب ہے لیکن کوئی اللہ کا لال ایسا نظر نہیں آتا جو اپنی ماں کے نام سے خود کو منسوب کرے گویا ماں بیچاری جزو آدم، یا نسل انسان نہیں ہے چنانچہ شاعر خود کو اپنی ماں سے منسوب کرتے ہوئے کہتا ہے :

چه شد که اسم نسا کمتر از رجال شده
حقوق مادر بیچاره پائمال شده
من علیله که هستم درین دیار بلا
بود قلی پدرم، نام مادرم زهره

ولیک از پدر خویش عار دارم من
بنام مادر خود، افتخار دارم من

ازین به بعد بهر دفتری و هر جائی
بود علامت فامیل[1] بنده زهرائی

تعدد ازدواج پر بھی بعض شاعروں نے بڑی سختی سے نکتہ چینی کی ہے، اشرف نے بھی اپنی ایک نظم "یک مرد و دو زنه" میں ایک دو جورو والے کا قصہ بڑے لطیف پیرائے میں پیش کیا ہے کہ کس طرح ایک مرد دو بیویوں کے نرغے میں گھر کر مال و دولت کے علاوہ اپنی مونچھ اور داڑھی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے نظم کے اختتام پر اشرف نے اپنے ہم وطنوں کو یہ نصیحت کی ہے۔

هست آسوده یک زن و یک مرد
مرد در عمر خود نه بیند درد
زن یکی و خدا یکی گفتند
آن کسانیکه باشعف خفتند

از دو زن غیر وحشت و جنجال
چون نماند برای مرد محال

آخر کار همچو پروانه
می شود مستمند و دیوانه

دور مشروطیت کے شاعروں میں ملک الشعرا بہار عورتوں کی آزادی اصلاح و بہبود کے لئے پیش پیش نظر آتا ہے، ملک و قوم کی ترقی میں بہار پردے کو ایک سنگ گراں تصور کرتا تھا اور ابتدا ہی سے اس کے خلاف برسر پیکار ہو گیا تھا اس نے اپنی نگارشات میں بڑی سختی سے پردے کی رسم پر نکتہ چینی کی ہے، ۱۹۳۶ء میں جب رضا شاہ نے پردے کی رسم کو ختم کئے جانے کا اعلان کیا تو بہار نے ایک نظم "ای زن" لکھ کر اس اعلان کا پرجوش خیر مقدم کیا ہے بعض اشعار ملاحظہ ہوں :

جوان بخت و جهان آرائی ای زن — جمال و زینت دنیائی، ای زن
ترا حاجت بآرایش نباشد — که خود پا تا سر آرائی ای زن
نبودی زندگی گر زن نبودی — وجود خلق را مبدائی ای زن
بنای نیک بختی را بگیتی — تو هم معمار و هم بنائی ای زن
تواضع را چو خیزی پیش شوهر — همایون شاخهٔ طوبائی ای زن

دریغا گر تو با این هوش و ادراک
بجهل از این فزون ترپائی ای زن

ایک نظم "زن شر خدا است" میں عورت کے اوصاف گنائے ہیں اور تعدد ازدواج اور پردے پر بڑے لطیف اور طنزیہ پیرائے میں چوٹ کی ہے بعض اشعار سنیئے :

خانم آن نیست که جانانه و دلبر باشد — خانم آنست که با دل شوهر باشد
زن یکی بیش مبر زانکه بود فتنه و شر — فتنه آن به که در اطراف تو کمتر باشد
زن شیرین بمذاق دل ارباب کمال — گرچه قند است، نباید که مکرر باشد
کی توان داد میان دو نفر انصاف درست — کاینچنین مرتبه مخصوص پیمبر باشد

[illegible] مرد نشری سرہ[۱] و زن غزلی تر باشد
[illegible] کذب نسلها چون یکی خانه دو مادر باشد
[illegible] از کشور ما این حرکات تا که زن بسته و پیچیده بچادر باشد

[illegible] لڑکیوں کو حسن و جمال کے بجای علم و کمال پر بھروسہ کرنے کی [illegible] ہے۔

ای دختر

[illegible]منمای بحسن و بجمال ای دختر سعی کن در طلب علم و کمال ای دختر
ذره ای علم و حکمت در وسط مغز بود به که در کنج لبت دانهٔ خال ای دختر
[illegible]ی هنر نیست مثر صفت غنج و دلال[۲] با هنر جلوه کند غنج و دلال ای دختر

ایک نظم "عفت زن" میں عورت کے قلب و نظر کو عفت و عصمت کا مرکز و محافظ کہا ہے پردے کو نہیں، ملاحظہ ہو :

عفت زن

ز چشم شوخ رقیبای صنم چه پوشی روی؟ بپوش قلب خود از وی که آبرو اینجاست
نگاه دار دل از آرزوی نامحرم که فر و جاه و جمال زن نکو اینجاست
حذر چه میکنی از چشم غیر و صحبت خلق؟ ز قلب خویش حذر کن که گفتگو اینجاست
خیال غیر مکن هیچ کان حجاب لطیف که چون دریده نه قابل رفو اینجاست
خدای عشق و عفاف است همره زن خوب بهشت شادی و فردوس آرزو اینجاست

حجاب پردهٔ مؤمن حجاب عفت نیست
هزار نکتهٔ باریک تر ز مو اینجاست

ایرج مرزا کی "مادر" پہلی نظم ہے جس نے ایرانیوں کے قلب و ذہن کو یک قلم چونکا دیا اور انھیں عورت کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے اور پرکھنے پر ابھارا۔ یہ نظم اپنی سلاست سادگی اور سوز و گداز کی وجہ سے جدید ایرانی شاعری کا شاہکار سمجھی جاتی ہے اور اکثر نصاب کی کتابوں میں جگہ پاتی ہے مشہور مستشرق پروفیسر براؤن نے اپنی مایۂ ناز تصنیف تاریخ ادبیات ایران جلد چہارم کو اپنی ماں سے معنون کرتے ہوئے یہ نظم نقل کی ہے۔

مادر

گویند مرا چو زاد مادر پستان بدهن گرفتن آموخت
شب‌ها بر گاهوارهٔ من بیدار نشست و خفتن آموخت
لبخند نهاد بر لب من بر غنچهٔ گل شگفتن آموخت
یک حرف و دو حرف بر دهانم الفاظ نهاد و گفتن آموخت
دستم بگرفت و پا بپا برد تا شیوهٔ راه رفتن آموخت

پس هستی من ز هستی اوست
تا هستم و هست دارمش دوست

ایرج مرزا کی اکثر تخلیقات عورتوں کی آزادی اور حقوق مساوات کی ترجمان ہیں، وہ تعدد ازدواج اور پردے کو عورتوں کی فلاح و بہبود کے لئے مضر خیال کرتا ہے، مندرجہ ذیل اشعار میں پردے پر بڑے مؤثر اور مدلل الفاظ میں نکتہ چینی کی ہے۔ :

خدایا تا که این مردم بخوابند زنان تا کی گرفتار حجابند
مگر زن در میان ما بشر نیست؟ مگر در زن تمیز خیر و شر نیست؟
زنان را عصمت و عفت ضرور است نه چادر لازم و نه چاقچور[۳] است
اگر زن را بیاموزند ناموس زند بی پرده بر بام فلک کوس
گرفتم من که این دنیا بهشت است بهشت حور در لفافه زشت است
اگر زن نیست عشق اندر جهان نیست جهان بی عشق زن باشد جهان نیست

ذیل کے اشعار میں شادی بیاہ کے طریقے خصوصاً بیوی کے انتخاب پر اپنی نفرت کا اظہار کیا ہے اور ملا کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے :

خدایا کی شوند این خلق رسته ازین عقد و نکاح چشم بسته
بگیرد زن ندیده روی او را بری ناآزموده خوی او را
بدان صورت که از نوع بقال خریداری کنی خربوزهٔ کال[۵]

۱؎ سرہ: خالص۔ ۲؎ غنج و دلال : عشوہ و غمزہ۔ ۳؎ موئے بال سے بنا ہوا [illegible] ۴؎ چاقچور : چمڑی مہری کا پائجامہ جسے پردہ نشین عورتیں پاؤں ڈھکنے کے لئے ایران میں پہنتی تھیں۔ ۵؎ کچا

ویا مدخانہ آری ہمدو داد ندانستہ کہ شیرین است یا نہ

در ایران تا بود ملا و منتی

برو زِ بد تر از این ہم نشینی

پروین اعتصامی ایران کی ان معدودے چند شاعرات میں سے ہے جن پر جدید ایرانی شاعری کو بجا طور پر ناز ہے، پروین کی زندگی ایک المیہ ہے جسے اس نے بڑی کامیابی سے مرتے دم تک اپنے سینے میں چھپائے رکھا اور اس کی تخلیقات میں اس المیہ کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا، اس کی اکثر نظموں میں عورتوں کے معاشی و معاشرتی مسائل پر اس کے خیالات کا اظہار ملتا ہے زندگی اور آئندہ نسل کی تربیت میں عورت کی اہمیت کو ایک نظم میں بڑے لطیف اور دلکش پیرائے میں پیش کیا ہے ۔

مرد و زن

وظیفۂ زن و مرد ای حکیم دانی چیست ؟

یکی است کشتی و آن دیگریست کشتی بان

چو ناخداست خردمند و کشتیش محکم

دگر چہ باک ز امواج و ورطہ و طوفان

بروز حادثہ اندر یمِ حوادثِ دہر

امید سعی و عمل ہاست ہم ازین ہم از آن

ہمیشہ دخترِ امروز مادرِ فرداست

ز مادر است میسّر بزرگیِ پسران

زنانہ امریکن ہای سکول طہران سے گریجویٹ ہونے پر پروین نے ایک نظم "نہال آرزو" کے عنوان سے کہی جس میں تعلیم نسواں پر اپنے دلی جذبات کا اظہار کیا ہے بعض اشعار سنیئے :

پستیٔ نسوانِ ایران جملہ از بی دانشی است

مرد یا زن برتری و رتبت از دانستن است

زین چراغ معرفت کامروز اندر دستِ ماست

شاہراہ سعی و اقلیم سعادت روشن است

بہ کہ ہر دختر بداند قدر علم آموختن

تا نگوید کس پسر ہشیار و دختر کودن است

ایران میں پردے کی منسوخی کے فرمان کا پروین نے پر جوش خیر مقدم کیا چنانچہ اپنی ایک نظم "زن در ایران" میں اپنے تاثرات کا اس طرح اظہار کیا ہے :

زن در ایران پیش از این گوئی کہ ایرانی نبود

پیشہ اش جز تیرہ روزی و پریشانی نبود

زندگی و مرگش اندر کنج عزلت میگذشت

زن چہ بود آن روزہا گر زانکہ زندانی نبود

کس چو زن اندر سیاہی قرنہا منزل نکرد

کس چو زن در معبدِ سالوس، قربانی نبود

ایک قطعے میں عورتوں کو گوہرِ تعلیم و تربیت خریدنے کی تلقین کی ہے۔

بہ رشتۂ ہنر و کارخانۂ دانش

متاعہاست بیا تا شویم بازرگان

زنی کہ گوہرِ تعلیم و تربیت نخرید

فروخت گوہرِ عمرِ عزیز را ارزان

پروردگار نے بھی عورتوں کی زبوں حالی پر ندامت کے آنسو بہائے ہیں اور تعدد ازدواج پر بڑی سختی سے نکتہ چینی کی ہے، ایک نظم میں عورت کی عظمت و برتری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کی بارگاہ میں جبین عقیدت و نیاز خم کی ہے، بعض اشعار ملاحظہ ہوں :

بنالیم لختی بایران خود — برین کاخ وارون و ویران خود

بمونی بیزر و دو صد زن و آن — ہمان زن کہ ارزد بپوشش جہان

پدرہا در آنجا چو سوداگران — فروشند ہموارہ دوشیزگان

فغان از چنین باب بیدادگر — دریغ از چنین دختِ خونین جگر

ہلا دخترِ پاک اندیش ما — دوای دلِ خستہ ریش ما

تو باید کہ این خاک گلشن کنی — ز مہر خدا این خانہ روشن کنی

دلِ تو کہ نوری ز یزدان در اوست — دلِ تو کہ عشق ز یزدان در اوست

سزد گر بر آن دل نماز آورم — دلِ خویشتن چون نیاز آورم

محمد کسائی نے اپنی ایک نظم میں ایرانی عورتوں کو پردے سے باہر نکلنے اور کارزارِ حیات میں مردوں کے دوش بدوش نبرد آزما ہونے کا مشورہ دیا ہے :

دختر! پردہ بیفگن ز رخِ چون قمرت — زچہ مستیر سی اگر او فتد از کس نظرت
این حجابی کہ تو از مادر خود بردہ ارث — نیست در شرع نہ این پیچیدہ رو بند برت
خوبی تو نہ ہمان خال و خط و زلف و قد است — کاین ہمہ ہیچ نیرزد و چو نباشد ہنرت
خیز و مردانہ بمیدانِ عمل پای بنہ — کسبِ صنعت کن چون دور شدی از پدرت
خوار و بیچارہ و عریان و پریشان نشوی — نکند چادرِ عفت تلف و دربدرت

ایک اور نظم میں عورتوں کے حقوقِ مساوات کی پُر زور وکالت کی ہے :

(۱)

در مملکتی کہ زن بقانون — با مرد حق سخن ندارد
گر مردش بیت زن بگیرد — او جرئت چہ و چون ندارد
تا پا نہد از رحم بہ بیرون — حقی بجز اندرون ندارد
دیگر چہ تساوی حقوق است — آقای مقالہ ساز بس کن
اندر برِ عنکبوت خون خوار — کمتر تعریف از مگس کن

(۲)

در مملکتی کہ زن اسیر است — واندر کفنِ سیاہ ملفوف
در مملکتی کہ زن چو اشیاء — در بیع آید بشرط موصوف
در مملکتی کہ می فروشند — در کودکی از سرای مالوف
در مملکتی کہ زن بحبس است — وآن حاجی ریش حرمہ مکشوف
راجع بہ تساوی حقوق ہست — عیب است دگر دہن کشادن

موضوعِ صداقت و مہر موہوم
آوردن و درمیان نہادن

ایک مسدس میں شیخ کی قدامت پرستی پر چوٹ کی ہے اور موجودہ معاشرے میں عورت کی تعلیم و تربیت کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔
ایک بند سنئے : شیخنا نوبت تحصیل زنانست امروز
بانوی فاضلہ یک رکن جہانست امروز

صحبت از شرکت مرد پامال است امروز
چادر و پیچہ دگر نقص زنان است امروز
شیخنا عفت با داشتن چادر نیست
یا اگر ہست پس آن قحبۂ با چادر کیست

فاطمہ سلطان خانم ادیبۃ الزمان، جدید ایرانی عورتوں کی آزادی اور ان کے جذبات و احساسات کی مخلص نمائندہ اور کامیاب ترجمان ہے اس کی بیشتر تخلیقات کے موضوع موجودہ نسوانی مسائل کے گرد گھومتے ہیں، ایک نظم میں اپنی دختر سے مخاطب ہو کر نصیحت کرتی ہے کہ نسوانی حسن کی تزئین کے لئے کن چیزوں کی ضرورت ہے۔

بمن دہ گوش را ای دخترِ من — یگانہ دخترِ نیک اخترِ من
ہمیشہ کوش در تہذیبِ اخلاق — کہ اخلاقت شود از نیکوئی طاق
اگر خواہی بیارائی رخت را — وہی زینت جمالِ فرخت را
بگو مشاطۂ عصمت بیاید — ز عفت بر تو آرائش نماید
بگیسو پیچ و خم زہ از دقائق — بکش وسمہ بابرو، از حقائق
بکش بر دیدہ ات سرمہ ز آزرم — بنہ بر عارضت گلگونہ از شرم
بکنج لب بنہ خالِ ادب را — مکن بیہودہ بخندہ باز لب را
بہ صابونِ حیا دست و رخت شو — بزن آبِ کمال و عقل بر رو
بہ رخ مس سفیدآب شرف کن — ہوس را از کنارت برطرف کن
عزیز جانِ من زنہار زنہار — مشو با مردم بی تربیت یار
حقوق ہر کسی منظور می دار
تلافی نیکوئی نیکی بجا آر

"عزتِ زن" کے عنوان سے ایک نظم کہی ہے جس میں عورتوں کے کمال و ہنر اور عظمت و بزرگی پر بڑے لطیف پیرائے میں استدلال کیا ہے، یہ نظم خلوص، سادگی اور مجموعی تاثر کی بنا پر بڑی مقبول ہوئی ہے اور اکثر درسی کتابوں میں جگہ پاتی ہے بعض اشعار سنئے :

چو آفتاب پدیدار شد اگرچہ بلند
نہفتہ بود ہنر در زنانِ دانشمند ..

ہنر خلیفہ فرزند باشد انسان را　　ہمی بباید کز زن بزاید این فرزند
بنات حوا اگر با کمال و معرفتند　　سر سپہر برآرند بر بہ خم کمند
زنان مشابہ روحند نوع مرد جسم　　ز جان روشن باشد ہمیشہ تن خورسند
ای آنکہ طعنہ زنی بر کمال و فضل زنان　　بحال دیدہ کہ جہلت لبر خمار فگند
مگر نہ حضرت صدیقہ دخت پیغمبر　　فگند بالش رفعت فراز چرخ بلند
مگر نہ مریم با نفس خود مجاہدہ کرد　　پس مرا اورا با ارواح قدس شد پیوند
مگر نہ آسیہ شد از خشوع بی ہمتا　　مگر نہ رابعہ شد در خضوع بی مانند
اگر نبا نیث از قدر مرد ماں می کاست　　خدا بشمس نمی خورد در بنی سوگند
زنان فراخور مدحند و در خور تمجید　　کہ امہات کمالند و مستحق پسند
زنان با ہنر الحق سزد کہ فخر کشند　　ازین صحیفہ کہ شد خوشتر از صحیفہ زند

محمد ہاشم افسر نے عورتوں کے حقوق کی پُر زور نمائندگی کی ہے اور ان کی بیچارگی اور پس ماندگی کا ذمے دار مردوں کو ٹھیرایا ہے۔ چنانچہ ایک رُباعی میں کہتا ہے :

دست چپت از راست ندارد کم و کاست　　میکرد اگر کار قوی بود چہ راست
گر زن نبود چو مرد تقصیر شماست　　از بہر زنان علم و ہنر باید خواست

ایک قطعے میں تعدد ازدواج کا سبب خود عورتوں کو قرار دیا ہے۔

زنان گویند اگر مردی دو زن گیرد ستم باشد
شب و روز از برای خود بلای جان و تن باشد

چرا زن شوہری گیرد کہ جز او ہمسری دارد
خدا را این بلا را زن برای خویشتن دارد

اگر خواہد کہ این روز سیہ آید بسر باید
زن دانا نہ گردد ہمسر مردی کہ زن دارد

ابو القاسم لاہوتی نے اپنی شعری تخلیقات میں پردے اور عورتوں کی پس ماندگی پر بڑی شدت سے نکتہ چینی کی ہے اور ان خرابیوں کا علاج علم و ہنر بنایا ہے، ۱۹۱۱ء میں لاہوتی نے ایک غزل کہی ہے جس میں عورتوں سے اپیل کی ہے کہ وہ پردے کو خیر باد کہہ کر مردوں کے دوش بدوش آزادانہ تعلیم و تربیت اور علم و ہنر حاصل کریں، اشعار سنئے :

بردار پردہ ای صنم ماہروی من　　تا روی تو زیاد کند آبروی من
ہر جا کہ گفتگو ز نقاب تو میشود　　خندد رقیب و گریہ بگیرد گلوی من
خواہم میان جامعہ آزاد و بینمت　　جز این، بجان تو، نبود آرزوی من

ایک نظم "بہ دختران ایران" میں پردے کے خلاف سخت احتجاج کیا ہے اور عورتوں کو علم و دانش اور احوال جہاں سے واقفیت حاصل کرنے کا مشورہ دیا ہے :

اندرین دورہ تمدن ضمالا یق نیست　　دلبری چون تو ز آرایش دانش یکنار
ننگ باشد کہ تو در پردہ و خلقی آزاد　　شرم باشد کہ تو در خواب و جہانی بیدار
حیف نبود قمری شکل تو محروم از نور　　عجب نبود شجری چون تو تہیدست از بار
ترک چادر کن و مکتب برو و درس بخوان　　شاخہ جہل ندارد ثمری جز ادبار
دانش آموز و از احوال جہان آگہ شو　　وین نقاب سیہ از روی مبارک بردار

عارف قزوینی فارسی کا سب سے بڑا تصنیف گو (گیت کار) شاعر ہے اس نے اپنے گیتوں اور نظموں میں عورتوں کے حقوق آزادی و مساوات کی پُر زور حمایت اور پردے کی شدت سے مخالفت کی ہے، اپنے ایک گیت کی ابتدا اس شعر سے کرتا ہے :

"تا رخت متقید نقاب است
دل چو پیچہ است پیچ و تاب است"

ایک نظم "تمدن بی تربیت نسوان" میں کہتا ہے کہ اگر عورتیں پردے سے باہر نہیں آئیں گی تو تہذیب و تمدن ادھورے رہ جائیں گے۔

بفکن نقاب و بگذار در اشتباہ ماند
تو برآن کسیکہ می گفت رخت بماہ ماند

بدر این حجاب و آخر بدر آ، ز ابر چون خور
کہ تمدن، از نیائی تو، بہ نیم راہ ماند

ایک غزل "حجاب" میں پردے کو خیر باد کہنے کی پُر زور اپیل کی ہے :

ترک حجاب بایدت ای ماہ روی گیر　　در گوش وعظ واعظ بی آبرو، مگیر
بالا بزن، بہ ساعد سیمین نقاب را　　گر منع چہ شد، مگیر ز نم، آنرا فرد گیر

شکستہ کن طرۂ آشفتہ کار زہد یک موی حرف زاہد خود بین بر گیر

کمالی اصفہانی کو افسوس ہے کہ :

ز جیب علم بر آورده سر زنان ملل

زنان ما بسیہ جامہ اندرند ہنوز

چنانچہ ۱۹۳۶ء میں جب پردے کی منسوخی کا فرمان جاری ہوا تو کمالی نے ایک نظم "آزادیٔ زنان" لکھ کر اس جرأت مندانہ اقدام کا خیر مقدم کیا ہے اور اس کو رضا شاہ کا درخشندہ ترین کارنامہ بتایا ہے :

ز صدہا کار زیبا و درخشان که شد بر دست شاہنشاہِ ایران

بُود یک کار از این رخشنده تر کو زنان را داد آزادی چو مردان

محمد حسین شہریار نے اپنی ایک نظم "ای زن" میں عورتوں کو حقوقِ مدنیت سے واقف ہونے، 'دام سیاہ' کو چاک کرنے اور سعی و عمل سے 'پرچم اقبال و شرف' کو کرۂ ارض پر لہرانے کا مشورہ دیا ہے۔

یک دم ز حقوق مدنی دم بزن ای زن

وین دامِ سیہ سلسلہ بر ہم بزن، ای زن

این جامہ ماتم بدل ما زده صد چاک

صد چاک در این جامۂ ماتم بزن، ای زن

با سعی و عمل پرچم اقبال و شرف را

مردانہ ببر تا سرِ عالم بزن، ای زن

تو ماہِ مقنع بسر خود چہ زنی مشت

آن مشت بسرِ شیخِ معمم بزن، ای زن

میرزادہ عشقی نے ایک طویل نظم "کفن سیاہ" لکھی ہے جس کے آخری بند میں اپنے ہم وطنوں سے پردے کے خلاف متحد ہونے اور عورتوں کو آزادی دلانے کی پُرزور اپیل کی ہے تاکہ عورتیں سماجی زندگی سے بہرہ ور ہو سکیں ورنہ جب تک عورتیں پردے میں رہیں گی ایرانی قوم کا نصف حصہ مردہ متصور ہوگا۔

یا من ایک وده سه گوینده ہم آواز شود

کم کم این زمزمہ در جامعہ آغاز شود

با ہمین زمزمہ ہا روی زنان باز شود

زن کند جامۂ شرم آرد و سر افروز کند

لذت از زندگی جمعیت احراز شود

ورنہ تا زن بکفن سر برده نیمی از ملتِ ایران مرده

ایک قطعہ میں کمال و ہنر کی اہمیت جتلاتے ہوئے ایک بے کمال عفیفہ پر ایک عالم فاحشہ کو ترجیح دی ہے :

آن زن که عفیف و بی کمال است زان، عالمہ لوند بہتر

آن میوه که بو ندارد اصلا زان میوه که کرده گند، بہتر

مہدی خان قلزم نالاں ہے کہ عورت، جو مخزنِ خلقت، فرشتۂ رحمت، اور چشمۂ حیات، ہے کب تک کفن پوش، دیو و دد و غم سے ہم آغوش، اور ذہن سے فراموش رہے گی، معاشرے کی چشم و گوش کب تک اندھی اور بہری رہے گی؟ شاعر کے لئے سب سے بڑی خوشی کا دن وہ ہوگا جس دن پردے کی لعنت ایران سے ختم ہو جائے گی :

تا کی اندر محیط "ایران" زن زنده زنده سیہ کفن پوش است

تا کی این فرشتۂ رحمت با دد و دیو و غم ہم آغوش است

آری آن چشمۂ حیات ہنوز از ہمہ یادہا فراموش است

آری آن چشم و گوش جامعہ باز کور از دیده و کر از گوش است

روزِ جشن بزرگ ما روزی است که شود این حجاب منکسب نیست

ایک نظم "دختر" میں ایران کی دوشیزاؤں سے مخاطب ہو کر انھیں ماضی سے عبرت حاصل کرنے اور آئندہ نسل کی رہبری کا مشورہ دیا ہے، یہ نظم بھی اپنے خلوص اور تاثر کی وجہ سے بڑی کامیاب سمجھی جاتی ہے اور نصابی کتابوں میں درج ہوتی ہے :

دختر ای مادرِ نژادِ جدید دختر، ای اصل نسلِ آینده

تو بگیر از گذشتہ عبرت و شو نسلِ آینده را نماینده

علم را حرزِ جانِ خویش بساز تا شود ملت ہمہ گراینده

پای عفت بکوب تا نگری ہر سری زیر پات ساینده

دور کن پرده از جمال که باز خور ز مشرق شود برآینده

تو با علم و تربیت نشوی　　باعثِ قدر و منزلت نشوی

فرات یزدی نے تعددِ ازدواج کی خرابیوں پر ایک بڑی بھرپور
طنزیہ رباعی کہی ہے :

ہر کیہ دو زن گرفت، دلخون گردد　　حالش، ز غم و غصہ، دگرگون گردد
ہر کس کہ بدل مہرِ دو لیلیٰ بگزید　　آشفتہ تر از ہزار مجنون گردد

فردوسی اور اسدی نے عورت کو مار اور اژدر سے تعبیر کیا ہے
وحید نے ایک نظم میں اس کا بڑا دندان شکن جواب دیا ہے :

زن مست او در جہان ناپاک اژدر
بتر از مادہ اژدر، اژدرِ نر

جدید ایرانی شاعروں میں بھی فردوسی، اسدی، اور نظامی
کے ہمنوا پائے جاتے ہیں مثلاً محمد حسن رہی ایک نظم "زن" میں عورتوں
سے نالاں ہے اور ان کے خلاف نفرت و حقارت کا اظہار کرتے ہوئے
پارسا اور فاحشہ میں بھی کوئی تمیز نہیں کرتا اور انھیں مکر و فن کا مجسمہ
بتاتا ہے :

الہی در کمندِ زن نیفتی　　اگر افتی بروزِ من نیفتی
زنان چو آتشند از تندخوئی　　زن و آتش زیک جنسند گوئی
نباشد در مقامِ حیلہ و فن　　کم از ناپارسا زن، پارسا زن
زنان در مکر و حیلت گونہ گونند　　زیانند و فریبند و فسونند

اسی طرح میرزادہ حانی نے بھی اپنی مزاحیہ نظموں میں عورتوں
کے ساتھ تمسخر کیے ہیں، کہیں تو مردِ بے زن کی حالتِ زار بیان کی ہے

درماندہ و زار، مردِ بی زن
مبہوت و نگار، مردِ بی زن

اور عورتوں کو کنواری رکھنے کا گناہ مردِ بی زن، کے
سر تھوپتا ہے :

باشد گنہِ زنانِ بی مرد
بالسبت ہزار مردِ بی زن

اور کہیں "مردِ زن دار" کی درگت بناتا ہے :

در رنج و عذاب مردِ زن دار
از غصہ کباب مردِ زن دار

کہیں دو جورو والوں کا مرثیہ پڑھتا ہے :

سوزد از آتشِ جادو پیرِ مردِ دو زنہ
وای بر حالِ دلِ ما، زرِ مردِ دو زنہ

دو جورو والے کے سر پر ایک طرف سے جوتی اور دوسری طرف
سے لات اور گھونسہ پڑتا ہے :

لنگ کفش از طرفی آید و از سوی دگر
میخورد مشت و لگد بر سرِ مردِ دو زنہ

یہاں تک کہ اُسے دوزخ میں بھی عورتوں سے چھٹکارا نہیں ملتا۔

در قیامت ہم از آسیب زنان ایمن نیست
در سقر باشد اگر مسکنِ مردِ دو زنہ

عید بقرعید اور تہوار کے موقعوں پر کریب چارجٹ اور
وائل اور نئے فیشن کے کپڑوں کی فرمائش عورتوں کا مرغوب شغل ہے۔
شاعر بیچارہ ان فرمائشوں کا شکار ہے۔

شب عید است و گرفتارِ زنِ خویشتنم　　داد از دستِ زنم
او ست جفتِ من و من جفتِ ملال و محنم　　داد از دستِ زنم
ہم کریپ ژرژت زمن خواہد و ہم تُور سہ ووال　　مدفرم امسال
خود نہ شلوار بپایم نہ قبائی بہ تنم　　داد از دستِ زنم
گفت اگر پول نداری ز چہ ہستی زندہ　　من شدم شرمندہ
گفتمش زندہ از آنم کہ نباشد کفنم　　داد از دستِ زنم

بیوی بچوں سے جز نالہ و شیون اور کچھ حاصل نہیں لیکن عورت نالہ
و فرزند کے بغیر بھی مجسم شیون ہے۔

حاصلِ فرزند و زن جز نالہ و شیون نباشد
زن بغیر از نالہ و فرزند جز شیون ندارد

"ایکاش" میں ایک بیوی کی آرزوؤں اور ارمانوں کا نقشہ
کھینچا ہے

ایکاش کہ شوہرم گدا بود　　با عاطفہ بود و با وفا بود
ایکاش میانۂ من و او　　کمتر جدل و سر و صدا بود
ایکاش کہ مادر حسودش　　چندی سرش از تنش جدا بود
ایکاش برای رفع حاجت　　سرمایۂ بانگ مال ما بود

اسی طرح محمود افشار اپنے معاصرین بہار، اشرف، عشقی، عارف وغیرہ کے برخلاف عورتوں کو پردے میں رکھنے کا حامی ہے، اس کی رائے میں پردہ ہی عورتوں کی عصمت وعفت کا محافظ ونگہبان ہے :

پردہ زنہار مفگن ز رُخ چون قمرت
تا مبا دار سد از چشم بدکس نظرت
این لطافت کہ تو داری نہ دگر کس دارد
درزی طبع بریدہ است لباسی برت
غازہ بر روی مکن، وسمہ برابروی مکش
کہ تو خوبی، نتوان ساختن از زین خوبترت
رقص با ہرکس و ہر جای مکن، می ترسم
نقص حسنت شود و عیب بجای ہنرت

دہخدانے ایک قطعہ میں عورت پر بڑی چوٹ کی ہے :

زن بجان مقہور شیطانست و مرد　　ہست مقہور زن، اینت صعب درد
زن ہوسّی بارہ است و تو زن بارۂ　　باید این بیچارگی را چارۂ
تو نیابی نان خشک و شوخ شب　　او ہمہ حلوا کند در شب طلب

لیکن رہی روحانی اور افشار کی قماش کے شاعروں کی آواز صدا بہ صحرا سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی، جدید ایرانی معاشرے میں عورت کا درجہ متعین ہو چکا ہے اور اس کے تعین کرنے میں جدید ایرانی شاعروں کا بڑا حصہ ہے، ایرانی عورت تیزی سے ترقی وتمدن کی راہ پر گامزن ہے اور اپنی منزل پر پہنچنے کے لئے اب کوئی قوت اُسے روک نہیں سکتی،

ایران ایک عظیم ماضی، ایک عظیم ادب اور ایک عظیم کلچر کا حامل رہا ہے، عورت کے متعلق وہ اس کے بدلے ہوئے رجحانات یقیناً دنیا سے اس کی قومی عظمت کو منوانے میں ممد ومعاون ثابت ہوں گے۔

مقالے کی تیاری میں ذیل کی کتابوں سے مدد لی گئی

(۱) نسیم شمال : جلد اول و دوم۔ اشرف
(۲) دیوان بہار　جلد اول و دوم۔
(۳) سخنوران ایران در عصر جدید : جلد اول و دوم۔ (ڈاکٹر محمد اسحٰق)
(۴) تذکرۂ شعرای معاصر ایران : خلخالی۔
(۵) سخنوران نامی معاصر، جلد اول و دوم۔ برقعی۔
(۶) منتخبات دیوان عارف : دین شاہ ایرانی۔
(۷) دیوان عشقی
(۸) دیوان پروین۔ اعتصامی۔
(۹) مجموعہ اشعار دہخدا۔
(۱۰) Persian Revolution : Prof: E.G. Browne
(۱۱) The Press & Poetry of Modern Persia　E. G. Browne
(۱۲) Poets of the Pahlavi Regime : D. J. Irani
(۱۳) Modern Persian Poetry : Dr. M. Ishaq
(۱۴) Post-Revolution Persian Verse　Dr. Munibur Rahman

زن ایرانی
سرمشق تمام ایرانی
زن بشنو کہ سرمشقی تو با سیرت چو دانشمند
زن نو دارد کہ بیداری یا بیداری
سرمشق ناموس داری
(ابوالقاسم لاہوتی)

حضرت امیر خسرو کی غزل گوئی

(پروفیسر محمد یونس دہلی کالج)

(۱۲۵۲ء - ۱۳۲۵ء)

خسرو نے اصناف سخن میں ہر موضوع پر طبع آزمائی کی ہے۔ انھوں نے قصیدہ، غزل، مثنوی، رباعی وغیرہ پر ضخیم دیوان اور کلیات تصنیف کئے ہیں قطع نظر مثنوی اور قصیدہ سے اس وقت ہم صرف ان کی غزلیات سے بحث کریں گے

اگر ہم خسرو کی غزل کو فارسی ادبیات کی تاریخ کی روشنی میں دیکھیں تو ہمیں مولانا شبلی کے اس قول کی صحت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ غزل کی درجہ بدرجہ ترقی کے بارے میں وہ لکھتے ہیں :-

"ایران میں شاعری کی ابتدا قصیدہ سے ہوئی۔ ابتدا میں غزل جوش طبع سے نہیں بلکہ اقسام شاعری کو پورا کرنے کی غرض سے وجود میں آئی۔ قصیدہ کی ابتدا میں عشقیہ شعر کہنے کا دستور تھا اس حصہ کو الگ کرلیا تو غزل بن گئی گویا قصیدہ کے درخت سے ایک قلم لیکر الگ لگا لیا"

اگر خسرو کی غزلیات کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ بات بالکل واضح ہو جائے گی کہ ان میں اکثر و بیشتر بہار کا ذکر ہے یعنی ان کی غزل تشبیب بہاریہ کے نزدیک ہے ایک دو مثالیں ملاحظہ ہوں۔

باز ابر آمد و بر سبزہ گل افشانی کرد — برگ گل را صدف لؤلؤ مرجانی کرد
قدح لالہ چو از باد صبا گردان گشت — مست شد بلبل و آہنگ غزل خوانی کرد
شاہد باغ زبک ریختن بارانی! — گوشہا را ہمہ پر لؤلؤ عُمّانی کرد
مرغ در پردۂ عشاق سرودی می گفت — چاک زد پیرہن خود گل و یارانی کرد
ای صبا دی کہ فلانی بچمن مئی می خورد — ہیچ یاد من گم گشتۂ زندانی کرد
آخر این شعر ہم آن بود کہ او خندہ زنان — بر لب آب نشست و شکر افشانی کرد

بیا ساقی دمی در دہ کہ گل در بوستان آمد — ز جام لالہ بلبل مست گشت و در فغان آمد
شرابی خورد غنچہ از ہوای ابر در پردہ — صبا تا کہ لبش بوسید بویش در دہان آمد
میان غنچہ و گل از پی رز بو و اشکالے — کشاد آن عقدۂ مشکل صبا چون درمیان آمد
نفیر بلبلان نگذاشت خفتن چشم نرگس را — بسے گر خوابی اندر دیدۂ آن ناتوان آمد

اگرچہ بوستان پر رویہای خوب شد از گل بروی خویش روی خویش آخر چون توان آمد
الا ای ماہ خرگاہی کہ ماندی در پس پردہ برون آی و تماشا کن کہ گل در بوستان آمد
گلستانیست خاک آستانت از رخ خوبان
کہ مرغ آن گلستان خسرو سحر البیان آمد

رسید بادِ صبا تازہ کرد جان مرا نہفتہ داد بمن بوی دلستان مرا

صبا سواد چمن را چو نسخہ کرد ی آب بگل نمود کہ بنگر خط روان مرا
مرا گذر بگلستان بسی است لیک چہ سود کہ سوی من گذری نیست گلستان مرا
گمان ہمی برد م کز فراق آو بزیم غم نہفتہ یقین می کند گمان مرا
فغان من زکجا بشنود بگوش آنشوخی کہ خود نمی شنود گوش من فغان مرا
بپرید جانب او مرغ روح با من گفت کہ من شدم تو نگہدار آشیان مرا
خوش آن دمی کہ در آید بسفیدہ دم زدرم پراز نثارہ و مہ کردہ خانمان مرا
نہاد بر لب من لب نماند جای سخن کہ مہر کردہ بانگشترین دہان مرا
ردای صبا تو بگو سرو رفتہ را باز آی نو بہار بدل کن بگیے خزان مرا
ز رفتن تو بجان آمدم نمی دانم کہ رفتنت زکجا خواست بہر جان مرا
دلِ شکستہ و خسرو بجانب تو شتافت
غریب تست نگہدار مہمانِ مرا

اب ان اشعار کے مطالعہ کے بعد ہماری توجہ انوری کے قصائد کی طرف منذول ہوتی ہے۔ انوری نے اپنے قصائد میں اکثر تشبیب میں بہار کے مضامین باندھے ہیں۔

صبا بسبزہ بیاراست باغ دنیا را نمونہ گشت زمین مرغزار عقبی را
نسیم باد در اعجاز زندہ کردن خاک بہر در آب ہمہ معجزات عیسی را
بہار در زر و گہر می کشد بدامن ابر نثار موکب اردی بہشت واطفی را
ملذان طیور الذ بر منابر شاخ زنیم شب متر صد نشستہ الی را
چمن گر نسیم ملک شد کہ شاخ نسترنش طلوع داد بیک شب ہزار شعری را

کجاست مجنون تا عرض دادہ در یابد
نگارخانۂ حسن و جمال لیلیٰ را

یہ مقالہ بہت طویل ہو جائے گا اگر میں یہاں انوری کی تشبیب سے بحث کروں اور اس کے مقابلے میں ایسی غزلیں امیر خسروؔ کی پیش کروں جو تشبیب بہاریہ سے مشابہ ہیں بہرحال مندرجہ بالا اقتباسات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ خسرو کی غزل اور انوری کی تشبیب میں ایک ہی طرح کے مضمون باندھے گئے ہیں لیکن اس بات کا اعتراف کرنا پڑیگا کہ خسرو کا انداز بیان زیادہ دلکش ہے اور اس کی وجہ ظاہر ہے کہ خسرو کے کلام میں روانی اور ترنم کے ساتھ ساتھ زبان بہت سلیس ہے تشبیہ اور استعارے بھی پیچیدہ اور دور از کار استعمال نہیں کئے گئے ہیں لیکن اس کے برخلاف انوری قصائد میں اگرچہ مشکل پسندی اس حد تک تو نہیں ہے جتنی خاقانی کے یہاں پائی جاتی ہے مگر یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہ سلیس اور تکلف سے خالی ہے۔

جب ہم کسی مبتدی کو غزل کی تعریف بتاتے ہیں تو اس سلسلے میں یہی کہتے ہیں کہ غزل کے معنی ہیں "بہ معشوقان سخن راندن" اگر اس تعریف پر ہم غور کریں تو غزل کی یہ تعریف بہت مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے اور تشنہ بھی کیونکہ آج غزل بہ معشوقان سخن راندن تک محدود نہیں رہ گئی ہے بلکہ اس کے میدان کو اس قدر وسیع کر دیا گیا ہے کہ زندگی کے ہر پہلو کو اس میں سمویا جا سکتا ہے۔ میرے نزدیک یہ کوئی خوبی نہیں کہ ایک غزل میں تصوف، تغزل، تمسخر، پند و نصائح کے مضامین باندھ دیئے جائیں۔ حافظ کی غزلیات میں یہ بات عام طور سے ملے گی اور اس کی غزلیات میں ہر قسم کے تاثرات ملیں گے خواہ وہ غزل سے متعلق ہوں یا نہ ہوں۔ اگرچہ خسرو کی غزل کا میدان اتنا وسیع تو نہیں جتنا اس کو حافظ نے بنا دیا ہے مگر خسرو کی غزل "سخن راندن با معشوقان" کے گرد گھومتی ہے ان کی کوئی بھی غزل شاید ہی خواہ پانچ شعر کی ہو یا دس بارہ کی مگر ہر شعر میں معشوق سے متعلق مضامین [illegible]

تو کہیں ابرو کی، یعنی پوری غزل معشوق کے سراپے کے گرد گھومتی ہے اس میں وصال کی تمنائیں بھی ہیں اور ہجر کے نالے بھی، رُخ یار دیکھنے کی تمنا بھی ہے اور طاقت دیدار کے فقدان کا شکوہ بھی۔ مگر تصوف سے غزل بالکل پاک ہے خسرو نے جس معشوق کا تصور پیش کیا ہے وہ حافظ کے معشوق سے بالکل جداگانہ ہے خسرو کے اشعار پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ جس معشوق کا نقشہ کھینچ رہا ہے ہماری طرح گوشت پوست کا بنا ہوا انسان ہے روئے سخن کسی پیر طریقت یا عشق حقیقی کی طرف نہیں، لیکن یہ بات نہ بھول جانی چاہئے کہ وہ خود بہت بڑے صوفی تھے اور اپنے پیر حضرت نظام الدین اولیا کے عاشق صادق ہونے کے طور پر میں آپ کے سامنے خسرو کی ایک غزل پیش کی جاتی ہے جس کے پڑھنے سے اندازہ ہوگا کہ پوری غزل میں معشوق کا سراپا بیان کیا گیا ہے۔

لعلت چنان یا لب یا ہست نجان چیزی
رُولیست ترا یا مہ یا خود بہ ازان چیزی

ہمنشین کہ نمی خیزد یک سرو بہ بالا ہست
خود پیش تو کی خیزد اے سرو روان چیزی

من پیش درم از تو تو غم نخوری از من
آرے نبود مہ را از ضعف گران چیزی

خندہ زنی از خواہم قندے برد آن تو
یعنی کہ از آن گفتن تا بہ بدہان چیزی

خواہم بقبوں لستی درجیا دو بیت باید
اینک غزل خسرو بر گیرو بخوان چیزی

فارسی شاعری میں قاآنی کا کلام اس لئے مشہور ہے کہ شروع سے آخر تک موسیقی، ترنم اور غنا سے بھرپور ہے یہی چیز خسرو کی غزلیات میں ہے جو اکثر شعرا کے کلام میں کم ملے گی خسرو نے ردیف وقافیہ کا خیال رکھتے ہوئے بھی ایسے الفاظ کا انتخاب کیا ہے جو مترادف ہیں اور ایک قسم کی موسیقی اور ہم آہنگی پیدا کر دیتے ہیں۔ ایک غزل ملاحظہ ہو۔

جان من از آرام رفت، آرام جان من کجا
ہجرم نشان فتنہ شد، فتنہ نشان من کجا

آمد بہار مشکدم، سنبل دمید و لالہ ہم
سبزہ بصحرا زد قدم، سرو روان من کجا

درکار غم شد سرم ۔ بی پردہ شد مستورم
تلخست عیش از دوریم، شکرفشان من کجا

شخصم ضعیف و دیدہ تر از زین میان زار گہ
اینک مہیا شد مگر، لاغر میان من کجا

ہر دم جگر در سوز و تاب از دیدہ ریزم خون ناب
اینک می وانیک کباب آن میہمان من کجا

جان ست آن یار نکو رفتہ دل خسرو بدو
گر دل برفتست این مگو، این کہ جان من کجا

خسرو کی شاعری میں جو چیز زیادہ کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ ان میں ہندوستانی عناصر نہیں ملتے اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کی شاعری بالکل روایتی شاعری ہے۔ ایرانی شعرا نے اکثر ترک لڑکوں سے دل لگایا ہے اور ان کی محبت کا دم بھرتے نظر آتے ہیں خسرو کی شاعری میں بھی جا بجا ترک لڑکوں کا ذکر ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان پر بری طرح فریفتہ ہیں۔

خسرو نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ پوری ایک غزل لڑکے کو خطاب کر کے کہی ہے۔

جانی ندانم این چنین تا زندگانی اے پسر
کز خوبرویان جہان باکس نمانی اے پسر

زرین کلہ بالای سر جعد سے فر و تر از کمر
رہ می روی و زجعد تر دل می فشانی اے پسر

کشتی اگر دل برکنی مردم اگر دور افگنی
زیرا کہ ہم جان منی ہم زندگانی اے پسر

چون نیست صبر از روی تو ہر عاشق بر بوی تو
ہمچون سگ بر دم در کوی تو گر تو بخوانی ای پسر

آزردہ جانی رامکش بے خانمانی رامکش
مسکین جوانی رامکش آخر جوانی اے پسر

خسرو درین بے چارگی دارد سر آوارگی
در کار او یکبارگی نامہربانی اے پسر

خسرو کی شاعری کے روایتی ہونے کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ ابتدا میں جس شخص نے غزل گوئی شروع کی اس وقت سے آج تک ہر شاعر مضامین باندھتا چلا آ رہا ہے کہ معشوق ہمیشہ جفا کرتے ہیں، ظالم بے وفا اور بے مروت ہوتے ہیں، سب ہی عاشق فراق میں جلتے ہیں، ہجر کی تڑپ ان کو بے چین رکھتی ہے وصال کی حسرت لیکر وہ دنیا سے کوچ کر جاتے ہیں ہر شاعر خود کو حقیر اور ذلیل خیال کرتا ہے اور کوئے جاناں میں مر جانا باعث سعادت سمجھتا ہے۔

...ابتدا سے آج تک کوئی بھی عاشق یا شاعر ایسا پیدا نہیں ہوا
...ی زندگی میں معشوق مہربان اور باوفا بن کر آیا ہو اس سے اندازہ
...ہے کہ معشوقوں کی جفاکاری ہماری شاعری کا ایک جزوِ عظیم
...ئی ہے اور اس نے روایت کی شکل اختیار کر لی ہے اور اس روایت
...ڑنے کے لئے کوئی بھی تیار نہیں خسرو بھی ان روایات کے
...ح سے پابند ہیں ۔

...شب در دلم آن کافر خونخوار می گردد
...راست ارچہ بستر زیر پہلو خار می گردد

مرہم را خاک خواہی ز بدن اندر کوی او روزی
کہ دیوانہ دلم گرد و بلا بسیار می گردد

...رنجہ بہ تیر افگندن ای ترک کمان ابرو
...ملین صید ہم در دیدنت مردار می گردد

گرچہ از من شیر مردی ناید اندر کوی عشق
چون سگان شہری ز بازار بودن ہم خوش است

آخرای گریہ ہمی جان مرا خواہی سوخت
ہیچ اندر دلِ او کارگری دانی کرد

...انہ خود از در تو شد دور | باز اغ چہ حیلہ کا ستخوان برد

ریزی تو خون بر آستان من شویم از اشک روان
کالودہ دیدن چون توان، آن آستان پاک را

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ عربی شاعری کی یہ خصوصیت ہے
...ں میں مرد اظہار عشق میں پہل کرتا ہے اور مرد ہی کی طرف سے
...ار عشق کیا جاتا ہے لیکن ہندوستانی روایات اس کے برعکس ہیں،
...ں عورت مرد کے لئے تڑپتی ہے اور اس کی محبت میں گھلتی ہے
...ی مثال ہمیں سنسکرت کے مشہور ڈرامہ شکنتلا سے ملتی ہے

یہاں پر میں علی اصغر حکمت صاحب کی شکنتلا سے مثال کے طور پر چند شعر پیش کرتا ہوں جن سے شکنتلا کے جذبات کی عکاسی و شباہت سے بچھڑ جانے کے بعد ہوتی ہے ۔

ماند بیکس شکونتلا تنہا | ہم ز یار و دیار ماندہ جدا
کار او کاین چنین پریشان شد | سینہ پر آہ و دیدہ گریان شد
خویشتن را چون فرد و تنہا دید | نفس سرد از جگر بکشید
با دل داغدار و سینہ ریش | چون سر زلف خود بماند پریش
پای صبرش نبود و دوست ستیز | نہ دل ماندن و نہ راہ گریز

اگر یہ روایت ہے درست کہ ہندی عورت مرد پر جان دیتی ہے تو پھر خسرو کی غزلیات روائتی ہیں ۔ ان میں ایرانی فضا ہے جہاں مرد پر مرد جان دیتا ہے ۔ لڑکوں کے ہاتھوں دل ہارنا ۔ ان کے گھوڑوں کی ٹاپوں تلے جان دینا اور اپنے کو ان کے دروازہ کا کتا سمجھنا یہ سب ایرانی شاعری کے عناصر ہیں جن کے لئے ہندوستانی فضا سازگار معلوم نہیں ہوتی اس حیثیت سے پھر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایرانی غزل حقیقت سے زیادہ نزدیک ہے کیونکہ وہاں عام طور پر ترک لوٹ مار مچایا کرتے تھے اور اکثر ایرانی ان کی زلف کے دام میں اپنا دل پھنسایا کرتے تھے حافظ خود ایک ترک کے بارے میں فرماتے ہیں ۔

اگر آن ترک شیرازی بدست آرد دل ما را
بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

اگر ایران کے شعرا اس قسم کے مضامین اپنے اشعار میں باندھیں تو چنداں تعجب کی بات نہیں مگر ہندوستانی فضا میں یہ بات اکھڑی اکھڑی سی معلوم ہوتی ہے ۔

تجاہل تنگ معشوق کے اوصاف کے خسرو کے نزدیک عشق بچوں کا کھیل نہیں ہے اس میدان میں بڑے بڑے دلیر بھی ہار جاتے ہیں چنانچہ ایک جگہ خود کہا ہے ۔

نے ہر کسے ست عشق بازی | [illegible]
[illegible]

آقای شبیر احمد خاں غوری
ایم اے۔ ایل ایل بی۔ بی ٹی ایچ
رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اترپردیش

شیراز مشرق

(اعتذار: "آہنگ" کے پچھلے شمارہ میں آقای ڈاکٹر علی اصغر حکمت کا ایک مقالہ جونپور اور اس کے آثار قدیمہ پر شائع ہوا تھا جس میں فاضل مقالہ نویس نے جونپور کی سیاسی تاریخ اور اس کے فن تعمیر کے ساتھ خصوصیت سے اعتنا کیا ہے لیکن مشرق میں جونپور کی شہرت اس کی عمارتوں کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ ان ارباب کمال کی وجہ سے ہے جن کے وجود مسعود سے جونپور "دہلی ثانی" اور "شیراز ہند" کا مصداق قرار دیا گیا۔

یہ سچ ہے کہ "شیراز ہند" نے سعدی اور حافظ پیدا نہیں کئے لیکن اگر "شیراز ایران" محقق دوانی اور صدرائے شیرازی اور ایران (قرون مابعد میں) میر باقر داماد پیدا کئے تو "شیراز ہند" کو بھی فخر ہے کہ اس خاک پاک نے ملا محمود کو جنم دیا جن کا "شمس بازغہ" فلسفہ کی ادبیات عالیہ میں ایک بلند مقام رکھتا ہے جونپور کے تذکرے میں اس عمیق الفکر فلسفی اور اس کے پاس مایۂ ناز شاہکار کی کمی بری طرح محسوس ہوتی ہے۔

پھر فاضل مقالہ نویس نے آخر میں "مراکز ادب و دانش" کے عنوان سے فضلائے جونپور کا جو تذکرہ دیا ہے، وہ اس دانش کدہ مشرق کی ثقافتی ثروت کے پیش نظر بغایت مختصر ہے۔ انہوں نے صرف دو باکمالوں کا اس ضمن میں ذکر کیا ہے یعنی قاضی شہاب الدین محمد (؟) اور شیخ بہاء الدین شاہ مدار (؟) سطور ذیل میں "عہد شرقی" کے مشاہیر علماء و مشائخ کا ایک اجمالی تذکرہ پیش کیا جا رہا ہے۔)

سیاسی انتشار آٹھویں صدی ہجری کا نصف آخر ہندوستان کی تاریخ میں انتشار و طوائف الملوکی کا زمانہ ہے۔ محمد تغلق (۷۲۴-۷۵۲ھ) کی غیر دانشمندانہ پالیسی نے ان فارق المرکز قوتوں کو جنم دیا جنھوں نے کچھ ہی دنوں میں اس کی وسیع سلطنت کو پارہ پارہ کردیا۔ اس طوائف الملوکی کے نتیجے میں سب سے پہلے دکن کی بہمنی سلطنت کی بنیاد پڑی جہاں حسن گنگو بہمنی کے خاندان نے ۷۴۸ھ سے ۹۳۴ھ تک حکومت کی تا آنکہ محسن کش امراء نے اس عظیم سلطنت کو پانچ حصوں میں بانٹ دیا۔ ۸۰۴ھ میں مالوہ اور منڈو کی مستقل سلطنت قائم ہوئی جو ۹۷۹ھ تک باقی رہی۔ گجرات کی سلطنت ۷۹۴ھ میں قائم ہوئی اور ۹۹۱ھ تک آزاد رہی۔ ۷۹۶ھ میں جونپور کی حکومت کا آغاز ہوا جہاں کچھ بعد شرقی خاندان نے اپنی خود مختاری کا اعلان کردیا اور شاہان شرقیہ کے نام سے ۸۸۱ھ تک جونپور، بہار، اور ترہت پر حکومت کرتے رہے ان کے علاوہ خاندیش، بنگال، سندھ، ملتان اور مالابار میں مقامی حکومتیں قائم ہوگئیں۔

لیکن اس طوائف الملوکی سے ایک فائدہ ضرور ہوا۔ ہر سلطان اپنی جگہ علم و ادب کی سرپرستی کے لئے کوشاں تھی۔ سلاطین با اقتدار علماء و فضلاء کی تربیت میں ایک دوسرے سے گوئے سابقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔ ان میں خصوصیت سے جونپور قابل ذکر ہے جو "مشرق کا شیراز" کہلاتا تھا۔ آزاد بلگرامی نے لکھا ہے:-

"دار الحبور جونپور... بلدة عظیمة من صوبه الہ آباد کانت دار الخلافة السلاطین الشرقیة فی ذکر طبقتهم سطور فی تواریخ الهند نشأ بها کثیر من المشائخ والعلماء"[1]

دار الحبور (علماء کا دیس) جونپور صوبہ الہ آباد کا ایک بڑا شہر ہے۔ بادشاہوں کا دار السلطنت تھا ان کے خاندان کا ذکر ہندوستان کی تاریخوں میں مشہور ہے۔ اکثر مشائخ و علماء یہاں پیدا ہوئے۔

شرقی خاندان جونپور کے شرقی سلاطین کا مورث اعلیٰ ملک سرور تھا جسے سلطان ناصر الدین محمد شاہ نے (۷۸۹-۷۹۶ھ) نے خواجہ جہاں کا خطاب دیکر اپنا وزیر بنایا تھا۔ ۷۹۶ھ میں اس کے بیٹے ناصر الدین محمود شاہ نے ملک سرور کو "سلطان الشرق" کا خطاب دیکر پورب کی حکومت سپرد کیا۔ ملک سرور نے ۸۰۲ھ میں وفات پائی اور متبنٰی ملک قرنفل اس کا جانشین ہوا۔ چونکہ بادشاہ دہلی کا اقتدار

[1] سبحۃ المرجان

...صرف برائے نام رہ گیا تھا لہٰذا ملک قرنفل نے مبارک شاہ کے نام سے اپنی خودمختاری کا اعلان کیا۔ نظام الدین ہروی نے طبقات اکبری میں لکھا ہے۔

چون سلطان الشرق وفات یافت و متقارن این احوال امر حکومت دہلی بیش از بیش مختل شد و کار سلطنت از نظام افتاد۔ ملک مبارک شاہ قرنفل کہ پسر خوانده سلطان الشرق بود باتفاق امرا و سرداران خود را مبارک شاہ خطاب داده لوائے حکومت برافراخت۔[1]

مبارک شاہ نے ۸۰۴ھ میں وفات پائی اور اُس کا چھوٹا بھائی ابراہیم شاہ شرقی اُس کی جگہ تخت حکومت پر متمکن ہوا۔ عرصہ تک محمود شاہ دہلی کے ساتھ آویزش رہی۔ شروع میں محمود تغلق اور اُس کا وزیر اقبال خاں ابراہیم شاہ شرقی سے جونپور چھیننے کی کوشش کرتے رہے۔ بعد میں مرکزی حکومت کے ضعف و انحلال سے ابراہیم شاہ نے خود دہلی فتح کرنے کی ہمت کی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ ۸۱۵ھ میں محمود تغلق نے وفات پائی اور اُس کے ساتھ تغلق خاندان کا خاتمہ ہوگیا۔ ۸۱۶ھ میں سید خضر خاں نے دہلی میں سادات کی حکومت کا آغاز کیا۔ ابراہیم شاہ نے اس انقلاب کو فال نیک تصور کیا اور پھر تسخیر دہلی کی نیت سے چلا مگر جب خضر خاں کی قوت و شوکت اور استحکام حکومت کا پتہ لگا تو راستہ سے لوٹ آیا۔ اس کے بعد وہ چند سال تک رفاہ عام کے کاموں کی تعمیر اور علم و ادب کی سرپرستی میں مشغول رہا۔ فرشتہ لکھتا ہے:-

در سنہ سمت عشر و ثمانمائہ بار دیگر بقصد تسخیر دہلی از دار الملک خود روان شد و بعد از کوچ چند از راہ برگشتہ بدار العلم جونپور آمد و بصحبت علماء و مشائخ و تعمیر ولایت و تکثیر زراعت مشغول شده و سالہا بہیچ طرف سواری نفرمود۔[2]

۸۳۱ھ میں بیانہ کے معاملے میں مبارک شاہ بادشاہ دہلی سے اور ۸۳۶ھ میں کالپی کے قضیے میں سلطان ہوشنگ شاہ والی مالوہ سے جنگ ہوئی مگر کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ ۸۴۴ھ میں ابراہیم شاہ نے وفات پائی۔

[1] طبقات اکبری صفحہ ۵۲۷ [2] تاریخ فرشتہ جلد دوم صفحہ ۳۰۶

ابراہیم شاہ کے بعد اُس کا بیٹا محمود شاہ جونپور کے تخت پر بیٹھا۔ شروع میں کالپی کے معاملے میں محمود شاہ خلجی سے بہت زیادہ آویزش رہی مگر شیخ الاسلام چانڈیا کی وساطت سے دونوں میں صلح ہوگئی۔ محمود شاہ نے اڑیسہ پر بھی حملہ کیا اور بہت مال غنیمت لے کر واپس آیا۔ اس عرصہ میں دہلی کے اندر سید خاندان کی حکومت بھی ختم ہوگئی اور ۸۵۵ھ بہلول لودھی بادشاہ ہوا۔ چونکہ ابھی بہلول کی سلطنت مستحکم نہیں ہوئی تھی لہٰذا محمود شاہ تسخیر دہلی کے ارادے سے روانہ ہوا۔ اور ۸۶۱ھ میں اٹاوے کے قضیے نے نازک صورت حال پیدا کر دی۔ دونوں بادشاہوں کی فوجیں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہوگئیں مگر مقابلہ کی نوبت نہ آئی تھی کہ محمود شاہ کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد اُس کا بیٹا محمد شاہ تخت نشین ہوا اور اُس نے بہلول لودھی سے صلح کر لی۔ مگر محمد شاہ شرقی کی سفاکی و خونریزی سے امراء بددل ہوگئے اور اُسے قتل کر کے اُس کے چھوٹے بھائی حسین شاہ شرقی کو بادشاہ بنایا۔

حسین شاہ بہلول لودھی سے صلح کی تجدید کی۔ اس کے بعد سب سے پہلے اُس نے اپنی فوجی طاقت کو بڑھایا۔ پھر اڑیسہ پر حملہ کیا۔ اس کے بعد گوالیر کے قلعہ کو مفتوح کیا۔ اس طرح طاقت بڑھانے کے بعد اپنی ملکہ کے اغواء سے (جو دہلی کے آخری سید بادشاہ علاء الدین شاہ کی بیٹی تھی) ۸۸۳ھ میں دہلی پر حملہ کیا مگر شکست کھائی لیکن وہ اس شکست سے بددل نہیں ہوا اور اگلے سال پھر حملہ کیا مگر پھر شکست کھائی۔ اس کے بعد بھی دو مرتبہ اُس نے دہلی پر حملہ کیا اور دونوں مرتبہ شکست کھائی۔ آخری مرتبہ بہلول لودھی نے جونپور تک فتح کر لیا اور اپنے بیٹے باربک شاہ کو جونپور کی حکومت پر مقرر کیا۔ اس طرح ۸۸۱ھ میں شرقی خاندان کی حکومت کا خاتمہ ہوا۔

شرقی سلاطین کی علمی سرپرستی نویں صدی ہجری کا آغاز دہلی اور مغربی ہندوستان کے لئے انتہائی انتشار و اختلال لے کر آیا۔ دہلی کی پراگندگی کیا کم تھی کہ تیمور نے ۸۰۱ھ میں ہندوستان پر حملہ کیا اور اُس کے خوف سے اہل کمال دہلی چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ انھیں امن و امان جونپور ہی میں نظر آیا۔ اس لئے دہلی کا فضل و کمال سمٹ کر جونپور میں منتقل ہوگیا۔ ان ارباب کمال کی تربیت میں ابراہیم شاہ شرقی (۸۰۶-۸۴۴ھ) کا نام خاص طور سے تاریخ میں مشہور ہے،

نظام الدین ہروی لکھتا ہے :-

"علماء بزرگان کہ از آشوب جہان پریشان خاطر بودند بجونپور درآن ایام دارالامان بود سر برآوردند و آن دار السلطنت از فرقدوم علماء دار العلم گردید و چندین کتب و رسائل بنام او تصنیف شد مثل حاشیہ ہندی و بحر المواج و فتاوی ابراہیم شاہی و ارشاد و غیر ذالک"[۱]

اسی طرح فرشتہ ابراہیم شاہ کے متعلق لکھتا ہے -

"اما شاہے بود متصف بعقل و دانش و تدبیر - در عصر وے فضلائے ممالک ہندوستان و دانشمندان ایران و توران کہ از آشوب جہان پریشان خاطر بودند بدار الامان جونپور آمدہ در مہد امن و امان غنودند و از خوان احسان او زلہا بردا شتہ بنام نامی او چنانچہ بزبان قلم خواہد آمد چندین کتب و رسائل پرداختند"[۲]

ابراہیم شاہ علماء پر جان قربان کرنے کے لئے تیار رہتا تھا (تفصیل آگے آرہی ہے) اُس کے عہد حکومت کا خاص کارنامہ فتاوا ابراہیم شاہیہ کی تدوین ہے -

اسی طرح فرشتہ ابراہیم شاہ کے بیٹے اور جانشین محمود شاہ کے متعلق لکھتا ہے

"سلطان محمود شرقی بجانب جونپور شتافت و بدستور پدر بزرگوار دست بذل و عطا از آستین جود و سخا برآوردہ علماء و فضلا و صلحا بلکہ جمیع طبقات انام و اعلیٰ اختلاف مراتبہم محظوظ و بہرہ مند گردانید"[۳]

آخری شرقی سلطان حسین شاہ خود عالم تھا - وہ قاضی سماءالدین جونپوری کا شاگرد تھا جو ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی کے تلامذہ کے شاگرد تھے - بعد میں اُس نے اُنہیں قتلغ خاں کا خطاب دیکر اپنا وزیر بنا لیا تھا -

دہلی کی ثقافتی روایات کا جونپور میں تسلسل | جونپور کا حلقۂ علم و ادب عروس البلاد دہلی ہی کی ثقافتی روایات کا تسلسل ہے ، جو ارباب کمال دہلی سے جونپور پہونچے اُن میں قاضی شہاب الدین دولت آبادی سب سے زیادہ مشہور ہیں - اُن کے ذریعہ علم و ادب کا چراغ جو دو سو سال سے دہلی میں روشن تھا جونپور میں منتقل ہوا

[۱] طبقات اکبری [۲] تاریخ فرشتہ جلد دوم صفحہ ۳۰۷ [۳] ایضاً صفحہ ۳۰۹

اس کی تفصیل حسب ذیل ہے :-

آٹھویں صدی ہجری میں دہلی کے اندر مولانا معین الدین عمرانی سر آمد فضلائے روزگار سمجھے جاتے تھے - آزاد بلگرامی نے لکھا

"مولانا معین الدین عمرانی دہلوی قدس سرہ از علماء فحول و جملہ فروع و اُصول بود و اُستاد شہر دہلی عمرہا اللہ تعالیٰ و معاصر سلطان محمد تغلق شاہ"[۱]

مولانا معین الدین عمرانی ہی کو محمد تغلق نے شیراز بھیجا تھا کہ کسی طرح قاضی عضد الدین الایجی کو ہندوستان لے آئیں مگر سلطان ابو اسحٰق انجو والی شیراز کے اصرار سے قاضی عضد نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا - مولانا معین الدین عمرانی قیام شیراز کے زمانہ میں اہل عجم پر بھی اپنے فضل و کمال کا سکہ جما آئے - آزاد بلگرامی نے لکھا

"مولانا معین الدین عمرانی وقتے کہ بہ خطۂ شیراز وارد شدہ در آنجا آثار فضل و دانش از و بظہور رسید و بہ مزید اعزاز و اکرام اختصاص یافت"[۲]

مولانا معین الدین عمرانی کے شاگرد رشید مولانا خواجگی دہلوی تھے - اُنہوں نے اُستاد کی وفات پر اُن کی روایات کو جاری رکھا آزاد بلگرامی نے لکھا ہے :-

"مولانا خواجگی دہلوی نور اللہ مضجعہ عالم ربانی و تلمیذ مولانا معین الدین عمرانی است - بس از طے منازل فنون ظاہر جادہ پیمائے طریق باطن شد .... ہموارہ بدانش آموزی می پرداخت و طائفہ تحصیلیان را از سرمایۂ علوم بہرہ مندی ساخت"[۳]

مولانا خواجگی کے شاگرد قاضی شہاب الدین تھے - فتنۂ تیمور کے زمانہ میں اُستاد و شاگرد وطن قدیم کو چھوڑ کر پورب چلے - مولانا خواجگی کالپی میں ٹھہر گئے - اور قاضی شہاب الدین جونپور پہونچے جہاں ابراہیم شاہ شرقی نے نہایت عزت و احترام کے ساتھ اُن کا استقبال کیا - آزاد بلگرامی نے لکھا ہے :-

"ایامے کہ رایات تیمور بہ جانب دہلی حرکت کرد قاضی در رکاب اُستاد خود مولانا خواجگی طریق ہجرت از دہلی پیمود - مولانا در کالپی

[۱] تذکرہ ماثر الکرام صفحہ ۱۸۶ [۲] حافظ نے ابو اسحٰق کے دربار کے پنج رتن میں گنا ہے "دگر شہنشہ دانش عضد کہ در تصنیف بنائے کار مواقف بنام شاہ نہاد" [۳] تذکرہ ماثر الکرام صفحہ ۱۸۶ [۴] ایضاً صفحہ

رحل اقامت افگند و قاضی جانب جونپور رفت۔ سلطان ابراہیم شرقی اشرق اللہ ضریحہ مقدم او را مغتنم دانستہ لوازم قدرشناسی افزون از وصف بجا آورد و بخطاب ملک العلمائی بلند آوازہ ساخت[1]"

اس طرح دہلی کی قدیم ثقافتی روایات جونپور میں منتقل ہوئیں۔ اس کے علاوہ شرقی سلاطین کی ہنرپروری و قدرشناسی نے اطراف و اکناف ملک سے ارباب کمال کو کھینچ بلایا جس کی وجہ سے جونپور "دہلی ثانی" بن گیا۔ فرشتہ لکھتا ہے:۔

"مردم از اطراف و اکناف ہندوستان کہ مشحون از خلل شدہ بود روئے بجونپور آوردہ ہریک فراخور مرتبت و حالت نوازش می یافتند و از دحام مشائخ و علماء و سادات و نویسندہ از ہر حیثیت بجائے رسید کہ جونپور را دہلی ثانی می گفتند[2]"

قاضی شہاب الدین دولت آبادی | نویں صدی کے ہندوستان کے ملک العلماء قاضی شہاب الدین صدر نشین انجمن ارباب فضل و کمال تھے۔ آزاد بلگرامی نے لکھا ہے:۔

"قاضی شہاب الدین بن عمر الزاولی الدولت آبادی رحمہ اللہ رو عمدہ دانش مندان ہند است و شہرہ بلاد عرب و عجم، چراغ امتیاز در انجمن اقران برافراخت۔ اگرچہ دران عہد دانشمندان دیگر نیز فائق عصر بودند اما طالع شہرتے کہ او یافت احدے را میسر نہ گشت و آثاری کہ از و بر صحیفۂ روزگار باقی ماند از دیگرے پیدا نیست[3]"

بقول فرشتہ قاضی شہاب الدین کا خاندان غزنی سے آیا تھا اور وہ آٹھویں صدی ہجری میں شہر دہلی کے اندر پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے پہلے قاضی عبدالمقتدر شریحی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور اپنی مستعدی اور سرعت فہم و ذکا سے بہت جلد اُستاد کی نظروں میں سما گئے چنانچہ آزاد بلگرامی نے لکھا ہے:۔

"قاضی عبدالمقتدر در باب او می فرمود بیش من طالب علمے می آید کہ پوست او علم و مغز او علم و استخوان او علم است[4]"

قاضی عبدالمقتدر نے ۷۹۱ھ میں وفات پائی۔ غالباً اُن کے بعد قاضی شہاب الدین مولانا خواجگی کی خدمت میں پہنچے اور وہاں سند فراغ حاصل کی۔ اس زمانہ میں میر سید گیسو دراز نے خواب دیکھا جس کی تعبیر شہر دہلی کی خرابی و ویرانی تھی۔ کچھ ہی دن بعد تیمور کے حملے کی متوحش خبریں آنا شروع ہوئیں۔ اہل دہلی اپنا وطن مالوف چھوڑ کر بھاگنا شروع ہوئے مولانا خواجگی بھی اپنے شاگرد رشید قاضی شہاب الدین کو لے کر باہر نکلے۔ مولانا خواجگی کالپی میں ٹھہر گئے اور قاضی شہاب الدین جونپور پہونچے جہاں سلطان ابراہیم شاہ شرقی نے اُنہیں خطاب "ملک العلمائی" سے نوازا اور ممالک محروسہ کا عہدۂ قضا تفویض کیا۔ ابراہیم شاہ کو قاضی شہاب الدین کے ساتھ جو عقیدت تھی فرشتہ اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"سلطان ابراہیم در تعظیم و توقیر او بسیاری کوشید و در روزہائی تبرک در مجلس او بر کرسی نقرہ می نشست۔ می گویند وقتے مولانا را مرضے طاری شد۔ سلطان ابراہیم بعیادت او رفتہ بعد از تفتیش احوال و اظہار لوازم مہربانی قدحے را پر از آب کردہ گرد مولانا گردانید و خود آن نوشیدہ گفت بار خدایا ہر بلائے کہ در راہ او باشد نصیب من گرداں و او را شفا بخش[5]"

قاضی شہاب الدین کو بھی سلطان ابراہیم سے بیحد محبت تھی چنانچہ جب ۸۴۴ھ میں اُس کا انتقال ہوا تو اُنھیں اس درجہ صدمہ ہوا کہ اُسی سال داعی اجل کو لبیک کہا۔ فرشتہ لکھتا ہے

"قاضی شہاب الدین نیز با سلطان عصر موافقت کرد و چندان از فوت شاہ ابراہیم شرقی مغموم گشت کہ در ہمان سال یعنی اربعین و ثمان مائۃ بعالم قدس تشریف برد[6]"

قاضی شہاب الدین کے نفس گرم کی تاثیر سے جونپور مرجع طالبان علم بن گیا مگر درس و تدریس کے ساتھ انہوں نے تصنیف و تالیف کا مشغلہ بھی جاری رکھا۔ فرشتہ لکھتا ہے:۔

"تصانیف مستحسنۂ آن بزرگوار شہرت تمام دارد مثل حاشیۂ کافیہ کہ مشہور است بحاشیۂ ہندی و مصباح و متن ارشاد در نحو و بصلع المثال (؟) است و بدیع البیان و فتاوائے ابراہیم شاہی

[1] ایضاً صفحہ ۱۸۸ [2] تاریخ فرشتہ جلد دوم صفحہ ۳۰۶
[3] تذکرہ ماثر الکرام صفحہ ۱۸۸ [4] ایضاً صفحہ ۱۸۸

[5] تاریخ فرشتہ جلد دوم صفحہ ۳۰۶ [6] ایضاً صفحہ ۳۰۶

بحر المواج نام دارد و رسالہ مناقب سادات و رسالہ عقیدہ از مولفات اوست۔"[۵]

بہر حال اس صاحب فضل و کمال کی حسب ذیل تصانیف مشہور ہیں:-

۱۔ تفسیر بحر المواج:- فارسی زبان میں ہے۔ شیخ عبد الحق نے اخبار الاخیار میں لکھا ہے کہ اس کے اندر ملک العلما نے سجع کی رعایت کی ہے لہذا اکثر مقام پر عبارت حشو و زوائد سے مملو ہے۔ اس تفسیر کا امتیازی وصف یہ ہے کہ اس میں آیت کریمہ کی ترکیب نحوی اور وجوہ وصل و فصل کے بیان کا خاص طور پر التزام کیا گیا ہے۔ آزاد بلگرامی نے لکھا ہے:-

"بحر مواج تفسیر کلام اللہ بزبان فارسی در رین تفسیر سعی بلیغ در بیان ترکیب و معنی و بوجوہ وصل و فصل آیات بینات بکار بردہ"

۲:- فتاوائے ابراہیم شاہی۔ صرف غلام علی بیجاپوری (فرشتہ) نے اسے ملک العلماء کی تصانیف میں محسوب کیا ہے۔ دوسرے لوگ قاضی احمد بن محمد جونپوری کی تدوین بتاتے ہیں۔

۳۔ شرح اصول بزدوی۔ صرف بحث امر تک ہے جس زمانہ میں قاضی شہاب الدین شیخ محمد بن عیسیٰ کو اصول بزدوی پڑھاتے تھے اُس زمانہ میں اسے تصنیف کیا۔

۴۔ العقیدۃ الشہابیہ:- ہندوستان کی کلامی تصنیفات میں اب تک جو کتابیں دستیاب ہوئی ہیں، عقیدہ شہابیہ اُن میں سب سے قدیم ہے۔ اس کا ایک مخطوطہ رضا لائبریری رام پور میں ہے۔ انداز بیان متکلمین کے بجائے اہل اصول کا ہے۔

۵۔ شرح کافیہ:- سب سے زیادہ شہرت قاضی شہاب الدین کی "شرح کافیہ" کو نصیب ہوئی جو دنیائے اسلام میں "حاشیہ ہندی" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ کتاب مصنف کی زندگی ہی میں قبول عام حاصل کر چکی تھی۔ ہندوستان کے علمائے عجم نے بھی اس کے ساتھ اعتنا کیا۔

۶۔ ارشاد۔ نحو میں مشہور متن ہے۔ اس کی تہذیب و ترتیب میں مصنف نے بہت زیادہ کاوش کی تھی۔ آزاد بلگرامی نے لکھا ہے:-

"ارشاد متن در علم نحو کہ تمثیل مسئلہ در ضمن تعبیر التزام کردہ و طرزے تازہ بر روئے کار آوردہ"[۶]

۷۔ بدیع المیزان:- تاریخ فرشتہ میں اس کا نام بدیع البیان ہے مگر آزاد بلگرامی نے "بدیع المیزان" لکھا ہے یہ بلاغت میں تھی اور اس کی عبارت مسجع تھی۔

۸۔ شرح قصیدہ بانت سعاد: بڑی مطول اور مشرح شرح ہے۔ دائرۃ المعارف حیدرآباد سے شائع ہو گئی ہے۔[۷]

۹۔ رسالہ فارسی در تقسیم علوم و صنائع۔

۱۰۔ مناقب السادات: فارسی زبان میں ہے۔ اس کے تقریباً پانچ مخطوطے رضا لائبریری رام پور میں موجود ہیں جن میں ایک ۸۶۴ھ کا مکتوبہ ہے ان کے علاوہ معافیہ (صرف میں) مصباح، شرح قصیدہ بردہ اور ہدایۃ السعداء (فارسی) بھی اُن کی طرف منسوب ہیں۔

قاضی شہاب الدین ہندوستان کے اُن معدودے چند علماء میں سے ہیں جن کی تصانیف کے ساتھ علمائے ولایت نے بھی اعتنا کیا ہے چنانچہ:-

ا۔ شرح کافیہ (حاشیہ ہندی) پر توقانی، ابو الفضل گازرونی اور غیاث الدین منصور شیرازی نے حواشی لکھے۔ علمائے ہند میں سے اُن کے شاگرد مولانا علاء الدین جونپوری نیز دوسرے تلمیذ رشید مولانا عبد الملک کے شاگرد میاں الہداد جونپوری نے اس شرح پر حواشی لکھے۔

ب۔ قاضی شہاب الدین کا متن "ارشاد" بھی علمائے ولایت میں "متن ہندی" کے نام سے بہت مقبول ہوا۔ خطیب ابو الفضل گازرونی نے اس پر ممزوج شرح لکھی۔

قاضی شہاب الدین کی اولاد | قاضی شہاب الدین کی کسی اولاد نرینہ کا پتہ نہیں چلتا۔ دختر نیک اختر کی شادی شیخ نصیر الدین بن نظام کے ساتھ ہوئی تھی۔ شیخ نظام الدین امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ کی ... میں سے تھے۔ پہلے دہلی آئے، بعد میں جونپور تشریف لائے۔

---

[۴] ایضاً صفحہ ۲۰۰۔ [۵] تذکرہ ماثر الکرام صفحہ ۱۸۹

[۶] ایضاً صفحہ ۱۸۹۔ [۷] مصداق الفضل شرح قصیدہ بانت سعاد

نصیرالدین بن نظام الدین کے ملک العلماء کی صاحبزادی سے تین بیٹے تھے صفی الدین، رضی الدین اور فخر الدین۔

صفی الدین (المتوفی ۹۱۵ھ) غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ اپنے نانا قاضی شہاب الدین سے علوم ظاہری کی تکمیل کی اور شیخ اشرف بن ابراہیم سمنانی سے علوم باطنی کی۔ شیخ صفی الدین کی تصانیف میں دو کتابیں مشہور ہیں۔

۱۔ دستور المبتدی (صرف میں) اور

۲۔ غایتہ التحقیق (شرح کافیہ)۔ حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں اس شرح کی بہت زیادہ تعریف کی ہے۔

شیخ صفی الدین کے صاحبزادے شیخ اسمٰعیل (۸۶۰-۹۴۷) تھے جن کے واسطے اُنہوں نے یہ دونوں کتابیں تصنیف کی تھیں شیخ اسمٰعیل از کیائے روزگار ہیں سے تھے سولہ سال کی عمر میں معقول و منقول سے فراغت حاصل کی۔ اس کے بعد مسند درس پر بیٹھے اپنے والد بزرگوار کی وفات پر اُن کے سجادہ نشین ہوئے ۹۴۷ھ میں وفات پائی۔

شیخ صفی الدین کے پوتے شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ بڑے متبع سنت اور جید عالم تھے۔ علم کلام کی متداول کتاب "شرح الصحائف" پر تعلیقات لکھیں نیز "عوارف المعارف" اور "التعرف" کی شروح لکھیں ان کے علاوہ ایک اور کتاب "انوار العیون و اسرار المکنون" بھی ان سے یادگار ہے۔ اس زمانہ میں وحدت الوجود کا بڑا چرچا تھا۔ شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ بھی اس کے بڑے سرگرم مبلغ تھے چنانچہ اُن کا یہ شعر محافل سماع کی جان ہے ؎

گفت قدوسی فقیرے در فنا و در بقا		خود بخود آزاد بودی خود گرفتار آمدی

انکے صاحبزادے بھی وحدت الوجود کے قائل تھے مگر پوتے شیخ عبدالنبی اسکے منکر تھے۔ اسی لئے ناراض ہوکر انکے والد نے اپنے گھر سے نکال دیا تھا۔

قاضی شہاب الدین کے دوسرے نواسے شیخ رضی الدین تھے انہوں نے بھی اپنے نانا (قاضی شہاب الدین) سے تعلیم حاصل کی تھی۔ فقہ و اصول فقہ اور علم کلام و عربیت میں دستگاہ عالی رکھتے تھے۔ ابراہیم شاہ شرقی نے انھیں ردولی شریف کا قاضی بنایا تھا انہوں نے وہیں توطن ہوگئے اور وہیں درس و افادہ میں عمر بسر کی۔

تیسرے نواسے مولانا فخر الدین تھے وہ جونپور میں پیدا ہوئے وہیں اپنے نانا سے تعلیم حاصل کی اور ان کے فیض تاثیر سے فقہ و اصول اور عربیت و کلام میں تبحر حاصل کیا۔

قاضی شہاب الدین کے تلامذہ: نواسوں کے علاوہ قاضی شہاب الدین کے تلامذہ میں مندرجہ ذیل علماء مشہور ہیں۔

مولانا عبدالملک جونپوری: جونپور میں پیدا ہوئے اور بچپن ہی سے قاضی شہاب الدینؒ کی خدمت میں رہے۔ اٹھارہ سال کی عمر میں سند فراغ حاصل کی اس کے بعد درس و تدریس میں مشغول ہو گئے اپنے عہد کے علماء مشاہیر میں سے تھے ۸۶۹ھ میں وفات پائی۔

مولانا عبدالملک کے شاگرد میاں الہداد جونپوری تھے۔ بعد فاتحہ فراغ عمر گرامی کا بیشتر حصہ تالیف و تصنیف میں صرف کیا۔ مصنفات میں حاشیہ تفسیر مدارک، شرح اصول بزدوی کے علاوہ قاضی شہاب الدین کی "شرح کافیہ" پر حواشی مشہور ہیں۔ آزاد بلگرامی نے لکھا ہے:-

"عمر گرامی را بیشتر بہ تدریس و تصنیف صرف ساخت و تصانیف رائقہ و توالیف فائقہ پرداخت مثل شرح ہدایہ فقہ در چند مجلد و شرح بزدوی و حواشی بر حواشی ہندیہ و حاشیہ تفسیر مدارک"[۱]

مولانا علاء الدین جونپوری: عرصہ تک قاضی شہاب الدین سے تعلیم پائی۔ اُنہیں کے واسطے ملک العلماءؒ نے کافیہ کی شرح لکھی تھی بیس سال کی عمر میں سند فراغ حاصل کی اور مسند درس و افتا پر متمکن ہوئے جونپور کے مشاہیر اساتذہ میں محسوب ہوتے تھے۔ اُنہوں نے استاد (قاضی شہاب الدین) کی شرح کافیہ پر حاشیہ لکھا تھا۔

شیخ محمد بن عیسیٰ: صدیقی النسب تھے۔ ۸۰۸ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے لیکن حملہ تیموری کے زمانہ میں اُن کے والد ماجد جونپور چلے گئے جہاں شیخ محمد بن عیسیٰ نے قاضی شہاب الدین کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ قاضی شہاب الدین کو اُن سے بیحد محبت تھی اور انہیں کے واسطے اُنہوں نے "اُصول بزدوی" کی شرح لکھی تھی۔ فراغت کے بعد عرصہ تک درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے پھر توجہ الی المعبود کے جذبے سے مغلوب ہوکر درس و تدریس [illegible] اور ریاضت و مجاہدہ میں زندگی گزار دی چالیس سال [illegible] تجرید کے بعد ۸۶۸ھ میں وفات پائی۔ [illegible]

---

[۱] تذکرہ مآثر الکرام صفحہ ۱۹۳

تریا تحفہ قبول نہیں کیا - اکثر فرمایا کرتے تھے ؎

فقر خود بافسر شاہان نمی دہم — من فقر خود بملک سلیمان نمی دہم
درد نج فقر و درد دل گنجے کہ یافتم — این نج را براحت شاہان نمی دہم

قاضی سماء الدین جونپوری: قاضی شہاب الدین کے براہ راست شاگرد نہیں تھے بلکہ اُن کے تلامذہ سے تعلیم حاصل کی تھی اپنے عہد کے اکابر علماء میں سے تھے آخری شرقی سلطان حسین شاہ اُنھیں کا شاگرد تھا - اُس نے تخت نشین ہونے پر اُن کے فہم و ذکا کی بنا پر اپنا وزیر بنایا اور قتلغ خاں کا خطاب دیا - حسین شاہ اور بہلول لودھی سے جو دہلی میں معرکے ہوئے قتلغ خاں (قاضی سماء الدین) اُن میں موجود تھے اور ۸۸۱ھ کے آخری معرکے میں قید ہوئے - رسمی علوم میں تبحر کے علاوہ اصابت رائے اور حسن تدبیر کے ساتھ متصف تھے، فرشتہ نے لکھا ہے کہ جب بہلول لودھی نے اپنی وفات کے قریب اُمرار کے دباؤ سے سکندر لودھی کو ولیعہدی سے معزول کرنا چاہا اور اُسے دہلی سے بلایا تو سکندر لودھی نے قتلغ خاں ہی سے مشورہ کیا اور اُنہیں کی رائے پر عمل کیا -

"سلطان سکندر بقتلغ خاں وزیر سلطان حسین شرقی کہ دستگیر شدہ در دہلی محبوس بود و باصابت رائے اشتہار داشت مشورت کرد"[۱]

شرقی عہد کے دیگر علماء قاضی شہاب الدین کے تلامذہ کے علاوہ دیگر علمائے کرام نے بھی جونپور کی ثقافتی ثروت میں حصہ لیا - ان کا استقصا تو بہت مشکل ہے صرف اُن مشاہیر اہل علم کا ذکر کیا جاتا ہے جن کے نام عام تاریخ و تراجم کی کتابوں میں محفوظ رہ گئے ہیں -

ان میں سب سے مشہور قاضی عبدالمقتدر شریحی (اُستاد قاضی شہاب الدین) کے پوتے اور شاگرد ابوالفتح بن عبدالحی تھے - ۷۷۲ھ میں اپنے والد کی وفات کے کچھ ہی دن بعد پیدا ہوئے لہذا دادا قاضی عبدالمقتدر نے پرورش کی اور اُنھیں سے تعلیم حاصل کی - بعد فراغت کچھ دن دہلی میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے - فترت تیموری کے زمانہ میں ۸۰۱ھ میں دہلی چھوڑنے پر مجبور ہوئے اور جونپور پہونچکر وہیں سکونت اختیار کرلی - فقہ و اصول اور علم کلام و عربی ادب میں ید طولیٰ حاصل تھا - ۸۵۹ھ میں وفات پائی -[۲]

عہد شرقی کے دیگر علماء میں دوسرا مشہور نام قاضی نظام الدین احمد بن محمود جونپوری صاحب "فتاوائے ابراہیم شاہیہ" کا ہے - ان کے اسلاف عرب سے آئے تھے اور گجرات میں سکونت اختیار کرلی تھی وہیں قاضی نظام الدین احمد کی ولادت ہوئی - اُنہوں نے علماء گجرات سے تعلیم حاصل کی اور فقہ و اصول میں تبحر حاصل کیا یہاں تک کہ اکابر علماء میں محسوب ہونے لگے - مگر بعد ازاں جونپور چلے آئے جہاں ابراہیم شاہ شرقی نے اُنھیں عہدہ قضا عنایت کیا - قاضی نظام الدین کا بڑا کارنامہ جو سلاطین شرقیہ کی علمی سرپرستیوں کا شاہکار سمجھا جانا چاہیے "فتاوائے ابراہیم شاہیہ" کی تدوین ہے - اسی زمانہ میں گجراتی کے ایمار سے مفتی رکن الدین ناگوری اور اُن کے صاحبزادے مفتی داؤد نے "فتاوائے حمادیہ" مرتب کیا مگر "فتاوائے ابراہیم شاہیہ" کو زیادہ شہرت ہوئی فقہ حنفی کا یہ شاہکار ایک سو ساٹھ فقہ کی کتابوں کی مدد سے تیار کیا گیا تھا - حاجی خلیفہ نے اسے "فتاوائے قاضیخاں" کا ثانی بتایا ہے - قاضی نظام الدین احمد نے ۸۴۲ھ میں وفات پائی -

قاضی شہاب الدین کے معاصر اور حریف قاضی نصیر الدین جونپوری تھے - دہلی میں پیدا ہوئے - ابتدائی زندگی وہیں بسر ہوئی اور قاضی عبدالمقتدر شریحی سے علوم متداولہ کی تکمیل کی - قاضی عبدالمقتدر بھی اُن پر بہت زیادہ مہربان تھے اور بڑی محبت اور شفقت سے اُنھیں پڑھاتے تھے - فاتحۂ فراغ کے بعد دہلی ہی میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا مگر فترت تیموری کے زمانہ میں دہلی چھوڑ کر جونپور چلے آئے جہاں عہدۂ قضا پر مامور ہوئے - مگر آخر میں مستعفی ہو کر عزلت گزین ہوگئے اور بقیہ عمر زہد و عبادت میں گزار دی - قاضی شہاب الدین نے جب "ارشاد" (در نحو) کو تصنیف کیا تو اُن سے خواہش کی کہ اسے اپنے یہاں نصاب میں داخل کریں تاکہ اُن کی اس قدر افزائی سے کتاب کو قبول عام نصیب ہو جائے - قاضی نصیر الدین نے اس کتاب کی بڑی تعریف کی مگر کہا اسے نصاب میں داخل کرنے کی ضرورت نہیں ہے - ۸۱۰ھ میں وفات پائی -

ابراہیم شاہ کی علم دوستی و علماء نوازی نے جن مشاہیر اہل کمال کو بیرون ہند سے کھینچ بلایا اُن میں قاضی نظام الدین غزنوی اور اُن کے صاحبزادے قاضی ستار الدین خصوصیت سے قابل ذکر ہیں - قاضی نظام الدین سادات زینبی میں سے تھے اور غزنی میں پیدا ہوئے

---

[۱] تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۱۸۰ [۲] شیخ ابوالفتح بن عبدالحی کے شاگردوں میں شیخ محمد بن ابی البقا کرمانی لکھنوی اور شیخ محمد بن ابی محمد قدوائی دریاآبادی تھے

ہاں اپنے والد قاضی صدر الدین حسین اور دیگر علمائے غزنی سے تعلیم حاصل کی ۸۱۰ھ میں اپنے والد کی وفات پر اپنے بیٹے قاضی سناء الدین کو لے کر جونپور آئے۔ قاضی شہاب الدین کی سفارش سے ابراہیم شاہ شرقی نے اُنھیں مچھلی شہر کا قاضی مقرر کیا۔ اُن کی وفات پر اُن کے صاحبزادے قاضی سناء الدین مچھلی شہر کے قاضی ہوئے۔ قاضی سناء الدین نے باپ سے تعلیم پائی تھی اور فقہ و اُصول فقہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔

ایک اور بزرگ خضر بن الحسن البلخی تھے۔ وہ حدیث کے سید علماء میں سے تھے۔ پہلے وہ جونپور تشریف لائے مگر بعد میں لکھنؤ منتقل ہوگئے جہاں عرصہ تک طالبان علم اُن سے مستفید ہوتے رہے۔

جونپور ہی کے باشندے حکیم شہاب الدین کرمانی تھے مگر انھیں محمود شاہ خلجی بادشاہ مندو کی جود و سخا نے مندو کھینچ لایا جہاں اُنہوں نے سلاطین مالوہ کی مستند تاریخ طبقات محمود شاہی کو تصنیف کیا۔

جونپور ہی کی نواح میں ظفرآباد ہے۔ یہ قصبہ بھی اُس زمانہ میں اہل علم کا مرکز تھا۔ مشاہیر علماء میں قاضی تاج الدین، شیخ رکن الدین، مولانا قیام الدین اور مولانا نور الدین خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

قاضی تاج الدین اپنے عہد کے فقہائے مشاہیر میں سے تھے ظفرآباد میں قاضی مقرر ہوئے مگر بعد میں مستعفی ہوگئے اور شیخ اسد الدین حسینی سے بیعت کرکے باقی عمر زہد و عبادت میں گذاری ۸۳۱ھ میں وفات پائی۔

شیخ رکن الدین بھی اکابر فقہائے احناف میں سے تھے تفسیر حدیث اور فقہ و اُصول میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ ایک لاکھ احادیث کے حافظ تھے چنانچہ اُستاد محترم مولانا بدر الدین صاحب علوی سابق پروفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے اس عاجز کے نام اپنے ایک مکتوب میں لکھا تھا۔

"میرے مورث اعلیٰ ملا رکن الدین یک لکھی سمرقندی ایک لاکھ حدیثوں کے حافظ تھے جو براہ راست وطن سے ہند آئے۔ جونپور کے قریب ظفرآباد میں قبر ہے ۸۰۲ھ سال وفات۔"[1]

مولانا قیام الدین دہلی کے باشندے تھے مگر شیخ اسد الدین حسینی کے ہمراہ جونپور تشریف لے آئے اور عرصہ تک درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ آخر میں اس شغلہ کو ترک کرکے ہمہ تن مجاہدہ و ریاضت میں مشغول ہوگئے۔ ۸۱۷ھ میں وفات پائی۔

مولانا نور الدین شیخ اسد الدینؒ حسینی کے صاحبزادے تھے مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے بعد میں ہندوستان آگئے جہاں مولانا قیام الدین سے علوم ظاہری کی تکمیل کی، علوم باطنی کی تکمیل اپنے پدر بزرگوار شیخ اسد الدینؒ سے کی۔ اس کے بعد عرصہ تک درس افادہ میں مشغول رہے ۸۳۶ھ میں وفات پائی۔

نویں صدی ہجری کے مشائخ جونپور

مدرسہ کے ساتھ خانقاہ بھی اسلامی ثقافت کے امتیازی شعائر میں سے ہے چنانچہ نظام الدین ہروی نے لکھا ہے کہ فاتح بنگال نے مساجد و مدارس کے ساتھ ساتھ خانقاہیں بھی تعمیر کرائیں۔

"ملک بختیار الدین خلجی ..... برگرفت و خطبہ و سکہ بنام خود کرد و مساجد و خوانق و مدارس بجائے معابد کفار احداث نمودہ"[1]

مدارس علوم ظاہری کی تعلیم کے لئے ضروری ہیں مگر خانقاہیں بھی اصلاح نفس اور اخلاقی تربیت کے لئے ناگزیر ہیں۔ جونپور کو بھی مشائخ کرام نے اپنے قدم سے نوازا۔

شیخ اسد الدین حسینی واسطی کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ قاضی تاج الدین ظفرآبادی اور شیخ رکن الدین ظفرآبادی اُن کے مرید تھے۔

شیخ اسد الدین کے صاحبزادے شیخ نور الدین تھے جنھوں نے اپنے پدر بزرگوار سے علم طریقت اخذ کیا تھا۔

شیخ نور الدین کے صاحبزادے شیخ قطب الدین ظفرآبادی تھے وہ ۸۰۲ھ میں پیدا ہوئے، علوم ظاہری کی تکمیل قاضی شہاب الدین سے کی بعد علم طریقت اپنے پدر بزرگوار سے اخذ کیا۔ بڑے پرہیزگار و عبادت گذار تھے ۸۶۹ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

ظفرآباد کے مشائخ طریقت میں دوسرے مشہور بزرگ

[1] طبقات اکبری صفحہ ۲۳

شیخ شمس الدین تھے وہ شیخ بہاء الدین ذکریا ملتانی کی اولاد میں تھے اور شیخ بڈھن کے نام سے مشہور رہیں۔ اپنے والد بزرگوار سے ظاہری و باطنی کی تکمیل کی اور اُن کی وفات پر اُن کے سجادہ نشین ہوئے ۸۳۷ھ میں راہی ملک بقا ہوئے۔ خاص جونپور کے مشائخ عظام میں شیخ امجد بن اجمل جونپوری، شیخ جلال الدین جونپوری، شیخ رکن الدین جونپوری اور مولانا عادل ملک جونپوری مشہور رہیں۔ شیخ امجد بن اجمل جونپوری حسینی سید تھے ہرات وطن تھا۔ شیخ جلال الدین حسین بخاری سے علم طریقت حاصل کیا۔ شیخ نے اُن کے حق میں دعا کی تھی:

"پیر شوی، میر شوی، وزیر شوی"

اور یہ دعا قبول ہوئی۔ بعد میں اُنہوں نے شیخ بدیع الدین مدار سے طریقہ مداریہ حاصل کیا۔ مریدین میں شیخ مبارک بن امجد اور شیخ بڈھن خصوصیت سے قابل ذکر ہیں ۸۶۶ھ میں واصل بحق ہوئے۔

شیخ حسام الدین اصفہانی الاصل تھے۔ بعد میں جونپور آبسے تھے۔ اُنہوں نے بھی شیخ بدیع الدین مدار سے طریقہ مداریہ حاصل کیا۔ اور عرصہ تک اُن کی صحبت میں رہے۔ شیخ حسام الدین کے مرید شیخ محمد بن علاء السطاری المنیری تھے۔ شیخ حسام الدین نے ۸۴۰ھ میں وفات پائی۔

شیخ رکن الدین ہرات کے رہنے والے تھے۔ خضر خاں حاکم دہلی کے زمانہ میں اُن کے والد ما جد دہلی تشریف لائے اور وہیں بس گئے۔ اُن کے انتقال کے بعد شیخ رکن الدین جونپور چلے آئے اور شیخ تاج الدین جھونسوی سے علم طریقت حاصل کیا۔ جب شیخ جلال الدین حسینی بخاری جونپور تشریف لائے تو اُن سے استفادہ کیا آزاد مشرب تھے۔ جزئیات شرعیہ کی زیادہ پرواہ نہ کرتے تھے۔ مرید سجدہ کرتے اور وہ منع نہ کرتے۔ اسی لئے قاضی شہاب الدین کو بار بار تنبیہ کرنا پڑتی ۸۶۴ھ میں وفات پائی۔

مولانا عادل ملک کا خاندان کرام کا تھا مگر وہ جونپور میں پیدا ہوئے اور وہیں علوم ظاہری کی تکمیل کی۔ بعد ازاں پنڈوہ تشریف لے گئے جہاں شیخ علاء الدین پنڈوی سے علم طریقت حاصل کیا جب جونپور واپس آئے تو سلطان ابراہیم شاہ شرقی جیسے اُن سے

بہت زیادہ عقیدت تھی، اُنہیں رائے بریلی میں لے جاکر آباد کردیا۔ وہیں اُنہوں نے وفات پائی۔

مشائخ جونپور کا تذکرہ شیخ عبدالحق ردولوی کے ذکر کے بغیر غیر مکمل رہے گا۔ وہ ردولی شریف میں پیدا ہوئے۔ سن تمیز کو پہونچ کر دہلی اپنے برادر محترم شیخ تقی الدین کے پاس تشریف لے گئے لیکن چونکہ علوم ظاہری کی جانب طبیعت کا میلان نہ تھا لہذا پانی پت تشریف لے گئے۔ وہاں شیخ جلال الدین محمود گاذرونی کی خدمت میں علوم باطنی کی تحصیل کی اور اُن کے وصال کے بعد اُن کے سجادہ نشین ہوئے اور پچاس سال زہد و انقطاع میں گزار دیئے ۸۳۷ھ میں ردولی شریف کے اندر وصال ہوا۔

(پایان)

غزل

(از امیر دھلوی)

انجام زمانہ تو ہی بتا اے گردش دوراں کیا ہوگا
اس دور کے انسانوں کی قسم اس دور کا انساں کیا ہوگا

جس رازِ محبت کو دل میں رکھنے کی قسم کھائی ہیں نے
وہ غم کی فراوانی میں بھی آنکھوں سے نمایاں کیا ہوگا

کھلتے ہی جسے مرجھانے پر مجبور فضائیں کرتی ہوں
وہ پھول چمن زاروں کے لئے عنوان بہاراں کیا ہوگا

پابندِ وفا مایوس کرم ہوں روزِ ازل سے دنیا میں
تا عمر جگر کا داغ کوئی شمع سرِ مژگاں کیا ہوگا

کس پاس سے کوئی کشتۂ غم کہتا تھا شبِ غم رو رو کر
جینے کا تو ساماں ہو نہ سکا اب موت کا ساماں کیا ہوگا

تم خود بھی جسے فریادوں پر مجبور ستم سے کہتے ہو
وہ قلبِ امیرِ خستہ جگر مسرور غزل خواں کیا ہوگا

غزل

از حضرت شاد عارفی

سو گریباں پھاڑ ڈالے، دو گریباں سی دیئے
یہ نوازش کم نہیں لیکن "تناسب" کے لئے

مسکرا کر آپ نے کتنے غلط وعدے کئے
ذہن میں جگنوں سے چمکے چند لمحوں کے لئے

یوں نظر آتے ہیں مستقبل میں ٹوٹے آسرے
جیسے کجلاتے ستارے۔ جیسے منزل کے دیئے

مانگ لیں ہم سے ہماری زندگی کا ایک دن
عیش کی راتیں نہیں کٹتی ہیں جن۔ بن پیئے

شہسوارانِ سیاست سے یہ پوچھا چاہیئے
زین لادے پھر رہے ہیں آپ۔ گھوڑے کیا کئے

ہم سے تنظیم وطن میں فرق پڑتا ہے تو پھر
چھوڑ دیجے سب کو جیلوں میں ہمیں بھر دیجئے

اپنے سر الزام کیوں لیتے ہو پھونکیں مار کر
آپ ہی بجھ جائیں گے۔ بے نور مٹی کے دیئے

تم نے فطرت کو سمجھنے میں بڑی تاخیر کی
تم کو فطرت نے سنبھلنے کے بڑے موقع دیئے

دیکھئے نا "حال" "مستقبل" سے کھاتا ہے شکست
کل جو تھے ظلِ الٰہی آج ہیں بہروپیئے

ہل چلا دو۔ بھنگ بو دو۔ آگ دو پھونکی رہاؤ—
گلستانوں میں ہمارے آشیانوں کے لئے

شاد مجھ سے تجربے کوئی کہاں سے لائے گا
میں نہیں کہتا۔ یہ طرزِ فکر ہے میرے لئے

قطعہ

شاد۔ عارفی۔

یہ مخبرانِ کمر سواد و منکرانِ صبح نو
چراغ کی روشنی میں [illegible] وہ جہاں ہیں

زبان کے خوشامدی "یزید کو" [illegible]
کسی بھی پیر خوار کو نہیں [illegible] پسند

غزل

از سید شرف زیدی

جلووں کے نظارے عام ہوئے جلووں کے نظارے کیا کہئے
الفت کے شرارے جاگ پڑے الفت کے شرارے کیا کہئے

موجوں کے تھپیڑے سہتے ہیں منجدھار پہ اکثر رہتے ہیں
دلدار بنے غمخوار بنے وہ جب سے ہمارے کیا کہئے

اب دل سے نکلتے ہیں شعلے اب غم شب فرقت کا نہ رہا
لو سوز نہاں کی تیز ہوئی اب نوک کے دھارے کیا کہئے

اک بات ہم اُن سے پوچھیں گے لیکن نہ بُرا مانیں وہ کہیں
ہنستے ہیں بھلا کن نظروں پر جگمگ یہ ستارے کیا کہئے

چہرے سے نمایاں برق تپاں وہ ابرو و مژگاں تیر و کماں
دل سوز بھی ہیں جانسوز بھی ہیں آنکھوں کے اشارے کیا کہئے

وہ آنکھ گلابی کیا کہنا بدمست شرابی کیا کہنا
اُس آنکھ سے کروٹ صہبا کی جب دل کو پکارے کیا کہئے

ساقی سے ملی جس وقت نظر پیتے ہی رہے بے خوف و خطر
ہم کو نہ رہی کچھ اپنی خبر تھے سحر کے مارے کیا کہئے

دل کہتا ہے غم سے دُور رہوں غم کہتا ہے دل میں رہنا ہے
آفت یہ پڑے جب پر بھی شرف وہ کیسے گزارے کیا کہئے

پیشرفتهای صنعتی هند

کمک بنیا فورد به هند

بنیاد فورد اعلام داشت که در حدود نیم میلیون دلار برای کمک
صنعتی از طرح های مبتکر هند اختصاص داده است این مبلغ غیر
لی است که برای کمک به نپال و پاکستان اختصاص یافته است
قسمتی از این عبارات برای کمک به طرح های عمرانی شهرداری دهلی
می خواهد یافت و مبلغی از آن نیز برای کمک به موسسات دیگر صنعتی
لی اختصاص می یابد. از جمله ۱۳ هزار دولار برای کمک با نتشار
یادگاری تاگور در مورد توسعه روستا ها و تحولات اجتماعی پرداخت
د شد.

تشکیل یک سیمینار ملل متفق در دهلی نو

در سازمان ملل متفق پیشنهاد شده است که یک سیمینار از طرف
مان اداره امور خدماتی اجتماعی برای کشورهای آسیایی و آسیای
ب شرقی در دهلی نو تشکیل شود حکومت هند موافقت کرده است
هیلات لازم را برای پذیرائی از اعضای این سیمینار فراهم آورد.
مار ند بور در ماه نوامبر سال جاری در دهلی تشکیل خواهد شد
نظار میرود که در حدود (۷۰) نفر نمایندگان کشورهای مختلف
ن شرکت کنند.

توسعه صنایع زغال در کشمیر

حکومت ایالتی استان جمو و کشمیر طرحی آماده کرده است
بابر آن (۸۰۰۰۰) تن زغال برای فروش در بازارهای شمال
در در جمو اخراج خواهد کرد.

همچنین در حدود دو نیم میلیون تن زغال نوع لینیت در دوره
بر استخراج می شود که برای کارخانه های تولید نیرو و ساختن
های شیمیائی وغیره مصرف خواهد گشت و ارزش آن در حدود
ند میلیون روپیه خواهد بود.

توسعه صادرات اسبابهای ورزشی از هند

معاون وزارت بازرگانی هند در نخستین مجمع عمومی سالیانه
صادرات کالا های ورزشی گفت برای توسعه صادرات این کالا
های هندی امکانات فراوانی وجود دارد و برای این منظور
باید کوشش کرد.

تاسیس کارخانه شیشه های صنعتی در هند

کارخانه شیشه های صنعتی که در شهر درگاپور در استان بنگال غربی
ساخته میشود انواع شیشه های صنعتی عدسیها، عینک های پزشکی
را تهیه خواهد کرد.

طرح این کارخانه که با کمک شوروی بنیاد با استفاده از ۵۰۰ میلیون
روبل اعتبار شوروی ساخته خواهد شد آماده گردیده و ده تن عدسی
در همین ظرفیت دارد این کارخانه در هر سال ۲۰۰ تن شیشه های پزشکی
۱۵ تن عدسی استخراج خواهد نمود.

بیان وزیر دارائی هند درباره کشاورزی تعاونی

مورارجی دسائی وزیر دارائی گفت کشاورزی تعاونی
در هند تنها راهی است که میتوان بوسیله آن احتیاجات خوار بار
کشور را تامین کرد و از خارج بی نیاز گردید.

تشکیل کشاورزی تعاونی و ترویج آن موجب برقراری رژیم
توتالیتر نخواهد شد. وی متذکر گردید که برنامه حزب کنگره
برای این منظور بر اساس دموکراسی متکی میباشد و هیچ جبر و اجبار
و فشار بکار نخواهد رفت زیرا اگر در این راه اجبار بکار رود شکل
دموکراتیک حکومت هند کلا تغییر خواهد یافت.

مورارجی دسائی گفت که تشکیل سازمانهای تعاونی کشاورزی موافق
سنت های دموکراتیک کشور میباشد کسانیکه آنرا مخالف میل مردم
می شمارند میتوانند در انتظار انتخاب آینده بمانند و نتیجه آرا عمومی را
ببینند.

علمی خبرنامہ

گاندھی جی کی تقریروں اور تحریروں کے اقتباسات کی اشاعت

کولمبیا یونیورسٹی (امریکہ) کی طرف سے گاندھی جی کی تقریروں اور تحریروں میں انسانی بھائی چارے کے متعلق اقتباسات پر مشتمل ایک کتاب شائع ہو رہی ہے جس کا انتخاب کرشنا کرپلانی نے کیا ہے اور تعارف نامہ ڈاکٹر رادھا کرشنن نے لکھا ہے۔

سوویٹ یونین میں اُردو ادب کا مطالعہ

سوویٹ یونین کے ماسکو اور ازبکستان کے اسکولوں کے نصاب میں اُردو اور دوسری ہندوستانی زبانیں شامل کی گئی ہیں جس کا سہرا سوویٹ یونین کے ماہرین علم الہند کے اس تحقیقی کام کے سر ہے جو اُنھوں نے بڑی محنت سے انجام دیا ہے۔ انھوں نے یہ دریافت کر لیا ہے کہ ہندوستان میں بغیر اُردو کے عوام سے رابطہ پیدا کرنا بڑا مشکل ہے۔ اُردو ادب کا مطالعہ کئی سال سے لینن گراڈ ماسکو اور وسط ایشیا کی یونیورسٹیوں میں اور ماسکو کے مشرقی علوم کے انسٹی ٹیوٹ اور بین الاقوامی تعلقات کے انسٹی ٹیوٹ میں کیا جا رہا ہے جبکہ خود ہندوستان میں اس کا کوئی خاص اہتمام نہیں ہے۔

اُردو ادب کی روسی زبان میں اشاعت

عصر حاضر کا ہندوستانی کہکشاں، نامی انتخاب روسی نے شائع کیا ہے جس میں نظیر اکبر آبادی الطاف حسین حالی شبلی نعمانی وغیرہ کی تصانیف کے اقتباسات مع شرح اور تبصرہ کے ہیں۔ اس کے علاوہ اُردو روسی لغت کی اشاعت بہت اہم ہے، اُردو تصانیف کو روسی زبان میں ترجمہ کرنے کا کام تقریباً دس سال سے ہو رہا ہے آج میر امن کی باغ و بہار طوطا مینا کی کہانی اقبال کی نظمیں۔ احمد ندیم قاسمی اور ابراہیم جلیس کی کہانیاں کرشن چندر کے افسانے جوش ملیح آبادی کی نظمیں فراق گورکھپوری فیض احمد فیض مجاز ساحر لدھیانوی اور دوسرے شعراء کی نظموں کے ترجمے روسی زبان میں عام پڑھے جاتے ہیں۔ بیکل اردو کے عظیم شاعر میرزا غالب کی چند غزلوں کے ترجمے اور ان کی زندگی اور تخلیقی کاوش پر ایک مفصل مضمون شائع کرنے کا انتظام کیا جا رہا ہے۔

میرزا غالب روسی ادیبوں کی نظر میں

یوگینی چیرلی شیف، ایم ایس سی صدر شعبہ ہندوستانی لسانیات ادارہ علوم شرقیہ سوویٹ سائنس اکاڈمی اپنے ایک بیان میں فرماتے ہیں کہ ہندوستان کے شاعر اعظم غالب کا نام دنیائے ادب میں زندہ جاوید ہے سوویٹ عوام اُنھیں قرون وسطیٰ کے عظیم فارسی شاعروں مثلاً رودکی۔ فردوسی۔ نظامی۔ حافظ۔ رومی۔ سعدی۔ عمر خیام۔ اور جامی کی صف میں غالب کو ہم جگہ دیتے ہیں۔ غالب کے کلام میں مشرق کے ان عظیم شاعروں کے کلام کا حسن دلپذیری یعنی امیر خسرو کی نازک خیالی۔ بیدل۔ میر تقی۔ اور میرزا سودا کی شاعری کا اس عہد نو کی آواز میں اس طرح مکمل ہو گیا ہے جو گذشتہ صدی کے وسط میں ہندوستانی عوام کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے سوویت عوام اس کے کلام کو اس لئے بھی پسند کرتے ہیں کہ وہ عام انسانوں کے رنج اور ان کی خوشیوں کے گیت گاتا ہے بے حسی، ناانصافی، اور مذہبی کٹرپن کی مذمت کرتا ہے۔ دوستی اور اخوت انسان کے جذبات کو پیدا کرتا ہے۔ غالب کا شمار ہندوستان کے ان اولین میں شعراء میں کیا جاتا ہے جن کے کلام میں فکر و تخیل کے ساتھ ساتھ سماجی شعور بھی ملتا ہے جس میں نوع انسانی اور اپنی قوم کے مستقبل کی فکر رچی بسی ہوئی ہے۔

غالب کو مذہبی تعصب یا فرقہ پرستی سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اُنھوں نے اپنی تحریروں میں بلا کسی تفریق کے ہندو اور مسلمان دونوں کو بھائی بھائی کہا ہے اور میل ملاپ کی تلقین کی ہے انھیں بڑا دکھ تھا کہ ان کے ملک پر بیرونی حکومت ہے انھوں نے سامراجیوں کے ظلم و تشدد کا ذکر بڑے دردناک انداز میں کیا ہے۔

انھوں نے ۱۸۵۷ء کی بغاوت کو غرق خون کر دینے کا حال بڑے مؤثر پیرایہ میں بیان کیا ہے۔

غالب کے خطوط کی ریسرچ

تاجیک طالبہ یولا تو انے غالب کے کلام پر بڑی محنت سے کام کیا ہے۔ وہ سوویٹ سائنس اکادمی کے علوم شرقیہ ماسکو سے ہندوستان کی قوموں کے زبان و ادب پر پوسٹ گریجویٹ ریسرچ کر رہی ہیں۔ انھوں نے اپنے مقالے کے لئے غالب کے خطوط کے ترجمے اور ان پر تاریخی لسانیاتی تنقید کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ غالب کے خطوط نے اُردو نثر کے ارتقاء اور پوری اُردو زبان کی ترقی میں بڑا اہم پارٹ ادا کیا ہے۔

یولا تو غالب پر اپنا مقالہ تاجیک زبان میں لکھ رہی ہیں جس پر انھیں قدرت حاصل ہے اور اسی لئے انھیں غالب کی فارسی نگارشات اور کلام میں پڑھنے اور سمجھنے کی سہولت ہے

دانت نکلنا * پیاس ہونا * رال بہنا اور آنا

اسہال و اپھارا و بدہضمی * قبض * درد

اور

مجلهٔ ماهانهٔ آهنگ
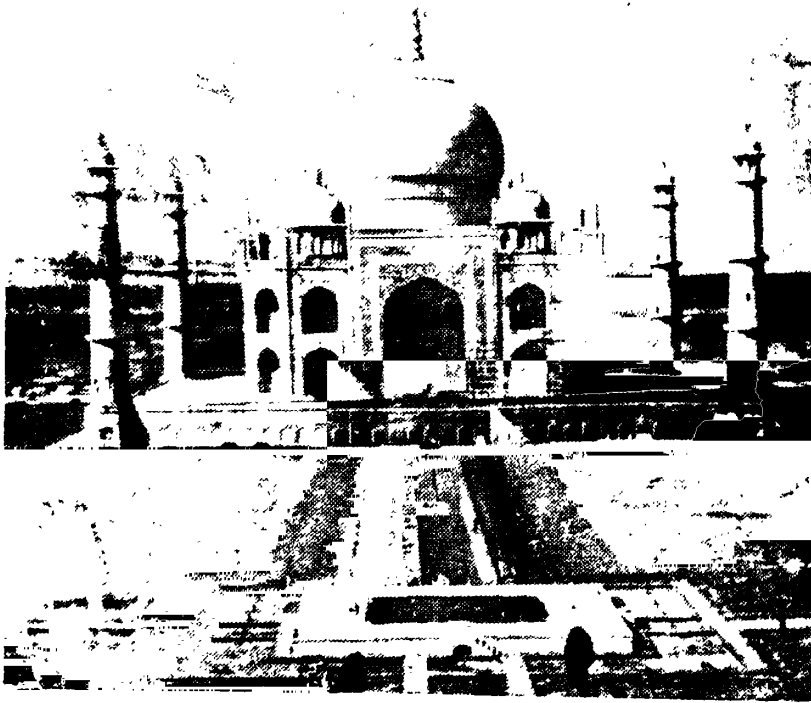
بنای زیبای تاج محل در شهر آگره

محل اداره :- ۳۱۰ چاوری بازار دهلی
اشتراک سالیانه :- پنج روپیه در تمام کشور

نگران
ڈاکٹر سید امیر حسن عابدی
ایم، اے، پی، ایچ، ڈی

مدیر مسئول
سید عظمت علی رضوی

آہنگ دہلی

جلد (۲) نمبر (۵) | بابت ماہ اکتوبر و نومبر ۵۹ء | قیمت فی کاپی [illegible]

فہرست مضامین

خلقت زن

جناب آقای دکتر علی اصغر حکمت سفیر کبیر سابق ایران در هند

گفت یکی موبد روشن روان — این سخنم از کتب هندوان
صنعت بیچون چو جهان آفرید — ساخت زمین را و زمان آفرید
مهر فروزنده و مه برنگاشت — جانور و سنگ گیه برنگاشت
گرد میان شش جهت و نه فلک — آدمی و وحشی و دیو و ملک
ز آتش و از آب و هم از باد و خاک — ساخت جهان را ز سمک تا سماک
بر زبر این کره گردون گرد — نادره ای کرد و لقب کرد مرد
لیک بگیتی سخن از زن نبود — وز رخ او خانه روشن نبود
خواست نگر کلک جهان آفرین — نقش کند صورت زن بر زمین
پیکر زن را ز جهان قدم — خواست که آرد بوجود از عدم
لیک از آن گل که جهان شد بپای — هیچ نبد در کف صانع بجای
خشت طبیعت بتقاضای خود — گشت همه صرف سرای وجود
جمله عناصر که مصالح بدند — خرج ره طالع و صالح شدند
ماند خزانه ز جواهر تهی — شد همه اعراض جهان منتهی
مایه صلصال که باقی نماند — باده دگر در خم ساقی نماند
بار دگر حکمت محض از ازل — بوالعجبی کرد ز نو در عمل
از سر هر شاخ بری برگرفت — از همه چیزی قدری برگرفت
سردی برف و تف آذر ستاند — جلوه ز مه غمزه ز اختر ستاند
هوش ز تیر و هنر از مشتری — ساز ز ناهید برامشگری
خشکی خاک آمد و تری ز آب — پرتو لرزان ز بلند آفتاب
جست ز باد آن دم ناپایدار — سستی و بدعهدی از روزگار
بهر رخ و گیسوی آن نوش لب — روشنی از روز و سیاهی ز شب
گریه ز ابر آب ز سنبل گرفت — خنده ز گل ناله ز بلبل گرفت
حیله ز روبه شد و خشم از پلنگ — ور سبکی کاه و گرانی ز سنگ
خواست هم از ببر ستمگاریش — ناخن خونین لب خونخواره اش
شیوه آن چشم ز نگاه عجب — کرد ز آهوی بیابان طلب
رسم خودآرائی و ناز و خرام — خواست هم از پیکر طاوس
گشت چو از بوقلمون بهره ور — رنگ آمیزی بهزاران
جبن ز خرگوش و نفاقی ز بط — وآن تن لغزنده ز ماهی
کرد طلب قامت رعنا ز سرو — قهقهه از کبک و نشاط از تذر
مهر دلاویزی او در بسیج — ساخت ز رزبند و ز لبلاب پیچ
خواست ز سور او بهنر پروری — صنعت گنجوری و [illegible]
بهر لبش خوان ز عسل کرد پیش — از نمکش بهره دلهای ریش
این همه را کرد بهم کردگار — ساخت از آن طلعت زن آشکار
پس بنجز امید بروی زمین — تبارک الله احسن الخالقین

سر غم عشق بوالهوس را ندهند — سوز دل پروانه مگس را ندهند
عمری باید که یار آید بکنار — این دولت سرمد همه کس را ندهند

ولی چون در آن زمان شعرای ایران بهند می آمدند سلیم هم خواست باین کشور بیاید تا خود را بیشتر بشناساند :

طوطیم هندی هوائی همچو طوق فاخته
ذوق هندوستان بگردنم افتاده است

نیست در ایران زمین سامان تحصیل کمال
تا نیامد سوی هندستان حنا رنگین نشد

کار من سبز در ایران توان شد کامیاب
هر کرا طاوس باید رنج هندستان کشد

وشاید وی از راه کابل بهند آمده باشد :

کرد تسخیر خراسان و عراق از ساحری
خیمه سحر اعجاز سلیم اکنون سوی کابل زند

هنگامیکه وی از شیراز عبور نمود میرزا ابوالحسن[1] او را همراه خویش نزد امام قلی خان[2] برد. امام قلی خان مردی عظیم الجثه بود. وقتیکه در حضور خان مزبور پیشخدمت وی که او نیز مثل اربابش عظیم الجثه بود قلیانی آورد سلیم گفت : در خانه بکدخدای ماند همه چیز.

سپس خان آزرده و میرزا خجل گردید. ولی سلیم را پنج تومان خلعت عطا شد.

سلیم در عهد شاه جهان (۱۰۳۷ — ۱۰۶۹ ه / ۱۶۲۸ — ۱۶۵۸) بهند رسید. در ابتدا اقامت وی در اینجا راضی بود و ایران خود را فراموش کرد و در توصیف این کشور شعرها میسرود.

سیاهی میزند هندوستان از حسن بر عالم
یکی از جملهٔ سبزان ته گلگون او پان است

ندیده چین بجبین از بتان هند کسی
کم است سرکه درین ملک قند بسیار است

هند شد هند روش عرش از کبریای من سلیم
جلوهٔ من عرصهٔ لاهور را لاهوت کرد

میکنم چندانکه فکر از آشنایان وطن
نیست در یادم کسی کو را توانم یاد کرد

ومعشوق خود را از میان هندیها انتخاب کرد :

یوسف هندی نژاد من مرا از برگ ریخت
دل کجا ماند بجای خویش چون دلبر گریخت

میگویند که سلیم در مدح شاه جهان قصائدی سرود و میخواست که در دربار وی مقرب گردد و شاه جهان نیز بوی توجه کرد. اما کلیم مانع گردید و بگفتهٔ مؤلف خلاصة الافکار "بسبب کلیم در دربار پادشاهی پیش رفت نیافت"[3] وقتیکه پادشاه در بارهٔ سلیم پرسید کلیم گفت : "شاعر خوبیست لیکن کم مایه است" ولی متاسفانه با تجسساتی که خودم در جستجوی سلیم بعمل آوردم هیچ قصیده ای از سلیم در مدح شاه جهان نیافتم. میگویند که سلیم در تعریف شاه جهان مثنوی سروده بود و پس از رسیدن بهند همان مثنوی را در توصیف کشمیر گردانیده و دلیل کم مایگی سلیم در نظر کلیم همین امر بوده است. سلیم از دشمنی کلیم بسیار

(۱) میرزا ابوالحسن پسر میر محمد قاسم و نوادهٔ میر ابوالعلی از سادات انجوی شیراز بوده است.
(۲) امام قلی خان پسر الله وردی خان پس از وفات پدر حاکم شیراز گردید. از آثار وی مدرسه خان و پل خان است.
(۳) [illegible] ص ۱۴۷ [illegible] الشعراء [illegible]

دیگر شده :

بریده باد از ان طعنه‌های تهمت من
که گر مدح کند کار من کلیم شوم

مؤلف نگارستان فارس می‌نویسد : "وقتیکه پس از کلیم سلیم ملک الشعراء گردید شیدا می‌گفت : خوشا نصیب شعرائی که مونس وزیر بار ملک الشعرائی سلیم نرفتند[1]" ولی این اشتباه است زیرا سلیم پیش از کلیم درگذشت. و دیگر اینکه صاحب مرآة الخیال همین الفاظ را دربارهٔ کلیم نوشته است -

سلیم از دربار شاهی در خدمت اسلام خان[2] بسر میبرد و چون در این کشور موفقیت نرسید خیلی ناراحت گردید -

فضای هند زبس تنگ عرصه بود سلیم
نشست نقش من اما بجز عاند نشست

چه گنجها که نثار سخن شهان کردند
اگر زمانه دگر شد سخن همان سخن است

بعریانی روم در هند بعد از این نمیدانم
چکار دیگر از این خاک دامن گیر می آید

و سلیس بیاد وطن افتاد و از مسافرت هندوستان براز تا راضی میکرد و میخواست بکشور خود برگردد :

در دیار هند حالم را مپرس ای همنشین
بر سر من موی سرگردان چون دود مجمر است

دل ما ز سینه ام میرقصد از حرف وطن
همچنان ز ماهیان ما چون صدای آب نیست

از غریبی دوستی باشد اگر سوی وطن
بار دیگر همچو عمر رفته نتوان بازگشت

میکشد از هند خاطر جانب ایران سلیم
همچو عنقا چند در غربت وطن خواهیم کرد

از شعر ذیل بر می آید که سلیم با مادهٔ وطن از اینجا حرکت کرد :

از هند سفر میکنم و شکر فزون است
کشتی چو برون رفت ز گرداب سلامت

و میخواست از راه کابل برود :

سرکشی در هند با ما کرد نفس از بس سلیم
سوی کابل میبرم تا باسگش سودا کنم

اما بسبب عدم مساعدت بخت و ضعف و پیری نتوانست این سرزمین را ترک کند و سپس بکشمیر رفت و گوشه گیری اختیار کرد :

گوشه گیر بکشمیر سلیم و بنشین
رفتن و آمدن آگره و لاهور بس است

و بالآخره در همانجا از این جهان فانی رخت بربست. کلیم و سلیم و قدسی و غنی هر چهار شاعر در یک مقبره مدفون هستند که آنرا قبور الشعرای نامند. قبور الشعراء در شهر سرینگر در محلهٔ (دلگیت) نزدیک در پاچهٔ دل در دامنهٔ کوه تخت سلیمان واقع است. مؤلف ریاض الشعراء می‌گوید : "در دکن فوت شد ..... در برهانپور مدفون است" و این هم در واقع اشتباه است، مؤلف ریاض الافکار می‌نویسد : "بجای که حکیم فرمود آسایش فرمای خاک لهداست مدفون گشت[3]" و این هم اشتباه است ؛

در سرو آزاد تذکرهٔ علامه تفتازانی (۲۳) در این مورد اینطور نقل شده است که گویا وقتی گرد میشود که اخذ ثانی از اول تعیین باشد و اما احکام سرقه مرتب نمیشود و از قبیل توارد خواهد شد» (۲۴) و در تذکرهٔ نصرآبادی نوشته شده است: «اگرچه شهرتی در اخذ معانی مردم دارد اما معانی غریب و لطیف هم زادهٔ طبع خود دارد» (۲۵) مؤلف ید بیضا میگوید: «آری توارد در سخن واقع میشود» (۲۶) صاحب صحف ابراهیم مینویسد: «او را سارق نوشته اند اما به تحریف ناشی از غفلت التفات ایشان است چه سلیم از شعرای عالی دستگاه است و بسیار معنی تازه و مضامین جدید در دیوان او یافته می شود» (۲۷)

سلیم یکی از شعرای بزرگ و قوی دورهٔ شاهجهان بشمار میرود و اشعار وی بطور حسن دارای مختصاتی است که در آن زمان ترویج داشت. نیز خیلی از تک بیتها که وی از لحاظ لفظ و معنی ارزش زیاد دارد. اینک نمونه های اینگونه اشعار ساده و روان و سلیس وی داده میشود که دارای خصوصیات گوناگون شاعرانه میباشد.

با اینکه صرف شد همه عمرم در انتظار
آگه نیم هنوز که چشمم براه کیست

پیش زاهد توبه کردم از شراب
ساده لوحی بین که زاهد کرده است

نشانی نیست در منزل قرارم
که تا صد بار در راه دیده بسته

تا سحر شب شراب ناب میباید گرفت
خونبهای صبح از مهتاب میباید گرفت

در مسلمانی نشد ایمن طریق کار خود
وقت کافر خوش که او سر رشتهٔ زنار داشت

نوبهار آمد که همچون شاخ گل بر خورده ام
دست بر هر جا نهی پیمانه ای پیدا شود

غبار غم ز ابر نوبهاری در جهان گم شد
قدح را بر زمین نگذار ساقی کاسمان گم شد

زاهد چه کند گر نکند روی بمسجد
از میکده کرده است برون باده فروشش

چو بلبل باعث شوریده گفتاری نمیدانم
چو گل تقریب این آشفته دستاری نمیدانم

نیم بلبل که فصل گل بگلشن آشیان گیرم
دهم صد گل که همچون شمع یک برگ خزان گیرم

نخورند در گلستان گل و لاله آب بیتو
بگلوی شیشه می نرود شراب بیتو

مثل شعرای این دوره بیشتر تک بیتهای سلیم مورد توجه میبا
د. چون او مثل معاصران خود بیشتر در پی مضمون آفرینی بو
غزلهای همدست در آثار وی کمتر پیدا می شود هنوز اشعا
دیده میشود که پشت سر هم با روانی و سلاست و عذوبت می آ
چنانکه از مثالهای ذیل بر ملا آید:

مدعی کو تا چراغ محفلم بیند ترا
غافل از ره آید و منزلم بیند ترا

از ترحم سنگ را دل خون شود هر گه چو موج
خنده زن بر گریهٔ بیجا صلم بیند ترا

صحبت ما در توای طوفان نگردد برطرف
ناخدا کو تا حریف ساحلم بیند ترا

تا چند کنی خون دل صاحب نظران را
بر سنگ زنی شیشهٔ خونین جگران را

ما را غم خود نیست ولی چند توان دید
چون رنگ روان تشنگی همسفران را

ساقی بیا که فصل بهاران غنیمت است
جامی بده که صحبت یاران غنیمت است

ابر کرم ز وادی ما شد میرود
ای سبزه سر بر آر که باران غنیمت است

خصمت گریه مرا نیست وگرنه مژه ام
خندهٔ موج گره بر لب دریا میکرد

نتوانم که کشم منت بیگانه سلیم
چارهٔ درد دلم ور نه مسیحا میکرد

شعرای سبک هندی بیشتر در پی مضمون آفرینی و دقت
[خی]ال بوده اند و چون میخواستند نسبت به بزرگان خود
[ام]تیازی داشته باشند در این زمینه هرچه بیشتر زحمت می
[ک]شیدند و در نتیجهٔ خیالبافی و پیچیدگی در اشعار سلیم مثل
[ش]عرای دیگر سبک دیده می شود :

ما گرفتاریم و غیر از ناله نبود کار ما
بیضهٔ بلبل بود هر غنچهٔ گلزار ما

از گرفتاری من خاطر آن گل جمع است
رشتهٔ مغز قلم پا بود آن[۱] بلبل را

نیز در همین آثار اشعاری است که از لحاظ فکر و خیال
با طبیعت غزل مناسبت ندارد :

چرک دنیا همه در جیب تو زاهد جمع است
از کجا یافتی این کیسهٔ دلاکی را

با اختران چه کار ترا ای غزال مست
بگذار این شمردن دندان شیر را

یکی از مختصات سلیم تضمین است و چنانکه در سرو آزاد نوشته
شده "اول کسیکه تضمین چسپان در مقطع غزل طرح انداخت
سلیم است"[۲] پس می سراید :

سلیم امشب بیا بر تربت حافظ که رحمت است
الا یا ایها الساقی ادر کاسا و ناولها

گفت حافظ دید چون کلک بیانم را سلیم
بلبلی برگ گلی خوش رنگ در منقار داشت

خصوصیت دیگر سلیم در تمثیلات اوست ، شبلی مینویسید :
"کلیم ، میرزا صائب وغنی آنرا گوئی یک فن خاص قرار دادند :
... سلیم هم ... در مثالیه ماهر است و شاید آنهم بدین سبب
باشد که سلیم هم ... کشمیری الاصل است"[۳] چون تمثیلات
در آن زمان رواج زیادی پیدا کرده بود سلیم هم
مثل شعرای معاصر از این صنعت هرچه بیشتر

(۱) ن - ل - ایضا
(۲) ص - ۶۷
(۳) ج ۳ ص ۱۸۲ -

استفاده کرده و تمثیلات خوب هم رونده است چنانکه از مثالهای ذیل بر می آید :

عاشقان را نیست بیم از فتنهٔ دور جهان
ماهیان بحر را اندیشه از سیلاب نیست

زود به کردم من بهسپر داغ خویش را
اول شب میکشد مفلس چراغ خویش را

حاصل دنیا بهمت در نیامیزد سلیم
میرود آب روان دشوار بر جوی بلند

تنک میوشد ز چشم هدقفای او سلیم
پادشاهی رفته از دنبال لشکر میرود

ولی در ضمین غزلیات نیز تمثیلاتی یافته میشود که هیچگونه حسن و خوبی ندارد و از رنگ غزل کلیتاً خالی است :

کمال اهل دنیا حاصل آب و علف آمد
خر عیسی اتاقه کرده بر سر خوشهٔ جو را

هیچکس از کار و بار خویش ناخوشنود نیست
صد صد غواره تاج سر شمارد شانه را

سلیم در پی ایجاد مضامین نو تشبیهات و استعارات تازه و جدید آورده است :

از سکه دوری ز جا خیزم برای هر نسیم
چمن صفا ما آموخت از من شیوهٔ تعظیم را

کاروان دگر از مصر هوس می آید
خرده یوسفی از بانگ جرس می آید

اجل آید بسرم هر دم دغمناک رود
چون سخن چین که بر اطراف خموشان گذرد

اما تشبیهات سست ولی مزه هم در ابیات وی دیده میشود :

بسکه گل سر زده از هر سر خار ساحل
کوچه موج بدریا چو خیابان گل است

نیز در آثار وی گاهی لغات تازه و خوب یافته میشود :

بعیش آباد هندستان غم پیری نمی باشد
که مو نتوانند از شرم کردن سفید اینجا

از دلم چون کاوکاو شوق را بیرون کنم
نیست این خار کف پا خار خار عاشقی است

دیگاه و گاه لغاتی گنجانیده شده است که نزاکت غزل را تکان میدهد :

سلیم چشم وفا داشتن ز عمر خطاست
که بیوفائی این نالونده مشهور است

در نثر سلیم "شکایت موش و استدعای گربه" نوشته است که در کلیات (۵۵۸ اندیا آفس) وی یافته میشود :

روح شاعر

روح شاعر چو غنچه ای نوخیز
در جهان خواستگار لبخند است
گر دو از شادی طبیعت شاد
که بگلهای باغ مانند است

(پژمان بختیاری)

نندلال گویا

بقلم ستیه نند جاوا
(دانشکده زبان‌های خارجی دهلی نو)

نندلال گویا در غزنی پا بعرصهٔ وجود نهاد. تاریخ تولدش محقق در دست نیست. پدرش آقای چهاجو رام در غزنه دبیر نواب محی الدین بود. مطابق آداب و سنن زمان نندلال از شش سالگی بفرا گرفتن زبان فارسی و عربی پرداخت و از آغاز نوجوانی تخلص به گویا نموده و شروع به شعر سرائیدن نمود.

چهارده سال داشت که پدرش درگذشت و نندلال گویا خواست که جانشین پدرش شود ولی بعلت کمسنی موفق نشد. از دربار غزنه نومید شده اثاثیه‌اش را بفروش رساند و عازم ملتان شد. در حومهٔ ملتان قطعه آراضی را بدست آورده خانه‌ای برای خود ساخت و در آنجا اقامت گزید. نوکرانش وی را "آقا" خطاب می‌کردند و باین مناسبت در ناحیه که زندگی می‌کرد بنام آقا معروف شد و ناحیهٔ مزبور هم که بتدریج آباد شد بنام آقاپور خوانده شد.

نندلال گویا در ملتان دختری "سیک" را به همسری برگزید و بعداً خودش مذهب "سیکها" را اختیار نمود.

در ملتان نندلال گویا تعدادی کتاب از جمله توصیف نامه، گنج نامه، زندگی نامه و دیوان گویا نوشت. بتدریج کلام گویا اهمیت بسزائی یافت و نواب ملتان وی را "میر منشی" خود منصوب کرد. در چهل سالگی گویا از ملتان به لاهور و بعد از آنجا عازم آگره شد. در آنجا بحضور بهادرشاه پسر امپراطور مغول اورنگ‌زیب شرفیاب شده امپراطور [illegible] را با کلام عرفان خود مسحور ساخت.

در اواخر عمر گویا بخدمت گورو گوبند سینگ پیشوای روحانی سیکها رسیده و کتاب بندگی نامه را بحضورش تقدیم نمود. حضرت گورو گوبند سینگ وی را پذیرائی فرمود.

شعر گویا در غزل بسبک حافظ و در مثنوی باسلوب و بحر مثنوی مولوی معنوی می‌باشد. میتوان گفت بیشتر اشعار وی بسیار لطیف و خوش مضمون و دل‌انگیز است. گاهی در غزلیات خود مضامین عارفانه بسیار بلند وارد و پیداست که مردی صوفی مشرب بوده و با افکار عرفای ایران آشنائی کامل داشته است.

اینک نمونه کلام فارسی نندلال گویا:

غزل

دین و دنیا در کمند آن پری سیما ها — هر دو عالم قیمت یک تار موی یار ما
ما نمی آریم تاب غمزه و مژگان او — یک نگاه جانفزایش بس بود درکار ما
گاه صوفی گاه زاهد گه قلندر میشود — رنگهای مختلف دارد بت عیار ما
قند لعل او بجز عاشق نداند هیچکس — قیمت یاقوت داند چشم گوهربار ما

هر نفس گویا بیاد نرگس مخمور او
باده‌های شوق می‌نوشد دل هشیار ما

غزل

هوای بندگی آورد در وجود مرا — وگرنه شوق چنین آمدن نبود مرا
خوش است عمر که بیاد بگذرد [illegible] — چه حاصل است از این گنبد کبود مرا
[illegible] که نیابی بیاد وی سیرم — بغیر یاد تو زین زیستن چه سود مرا
خدا شناسان دو عالم [illegible] پاک — [illegible] که بسوی تو ره نمود مرا
بغیر یاد تو گویا [illegible] زیست — بسوی [illegible]

انتخاب از زندگی نامهٔ نندلال گویا

در لباس بندگی شاهی تراست	دولتی از ماه تا ماهی تراست
هر که غافل شد از و نادان بود	گر گدا باشد و گر سلطان بود
شوقِ مولا از همه بالا تراست	سایهٔ او بر سر ما افراست
شوقِ مولا زندگی جان ماست	ذکر او سرمایهٔ ایمانِ ماست
روزِ جمعه مومنانِ پاک باز	گرد می آیند از بهر نماز
همچنان در مذهب ما سادهٔ سنگ	کز محبت با خدا دارند ننگ
گرد می آیند در ماهی دو بار	بهر ذکرِ خاصهٔ پروردگار
آن هجومِ خوش که بهر بندگی ست	آن هجوم خوش که محضِ زندگی ست
آن هجومِ خوش که بهر یاد اوست	آن هجومِ خوش که حق بنیاد اوست
آن هجوم بد که شیطانی بود	عاقبت از وی پشیمانی بود
این جهان و آن جهان افسانه ایست	این و آن از خرمنش یکدانه ایست
این جهان و آن جهان فرمانِ حق	اولیا و انبیاء قربانِ حق
هر که در یاد خدا قایم بود	تا خدا قایم بود دایم بود
حاصلِ دنیا همین دردِ سراست	هر که غافل شد ز حق گاو و خر است
سر برای سجده پیدا کرده اند	در دهر سر را مداوا کرده اند
مردِ عارف فارغ از چون و چراست	حاصلِ عمرش همین یادِ خداست
خواستم ترتیبِ این دُردانه را	کاشناسازد دلِ بیگانه را
تا ز آبِ حیوان پُر شده چون جامِ او	زندگی نامه شده زان نامِ او
تا کلام بوی عرفان آیدش	وز دلِ عالم گره بگشایدش
هر که خواند از ره لطف و کرم	گردد او در راه عرفان محرم

نیست در وی مدح اسپ بیخبر
غیر حرفِ بندگی حرفِ دگر

(پایان)

جلوه

(سفیر النجم)

مردم میگویند ترا نمی توان دید؟ ..... این موضوع تا چه اندازه مقرون بصحت است.

"من در امواج خروشان دریا" در فضای لایتناهی جو، هنگام طلوع و غروب آفتاب، در روشنی روز و تاریکی شب، در جلوهٔ بهار، در پژمردگی خزان، در گرمای تابستان و در سرمای زمستان، در لذتِ جوانی و الم پیری، و در همه جا و همه چیز را ترا میبینم."

در میان چمن سرسبز که بر اوراق گیاه قطرات شبنم نشسته تو بنظر من آمدی، زیبائی و دلنشینی گل جلوه ای از وجود تواست، پرتو فشانی آفتاب جهان تاب که صبح گاهان سر از افق بیرون می آورد شاهدی از وجود تواست."

زیر همین آسمان نیلگون در سایهٔ پاره های ابر سرخ و سپید ترا می توان نظاره کرد. تو بودی پیش از این که آسمانها و زمین ها بوجود میایند و باقی خواهی بود پس از آنکه اینها به اراده تو محو و فنا شوند.

نشانه های قدرت تو که در سراسر وجود عالم هویدا است مرا بران میدارد که در پیشگاه عظمت تو بخاک افتاده در حضور تو اظهار عبودیت نمایم و بندگی و قدرت تو نیایش کنم و بصدای بلند بگویم.

وفی الارض آیت للموقنین وفی انفسکم افلا تبصرون.

وارث شاه شاعر بزرگ پنجابی

(بقلم بزمی انصاری)

وارث شاه شاعر بزرگترین پنجابی و مصنف داستان عاشقانهٔ "هیر" باشندهٔ جندیاله شیرخان بود، که موضعی است در پاکستان غربی حوالی شیخوپوره.

"از تصنیفات وی روشن می شود که موصوف به خاندان معزز و معروف سادات تعلق داشت. در پایان شاه کار منظوم خود که معنون به "هیر" است راجع به نام و نشان خود چنین می نویسد:-

" وارث شاه ساکن جندیاله و تلمیذ مخدوم غلام مرتضی موضع قصور." موضع قصور از لاهور بمسافت ۳۴ میل واقع است و در یک وقتی مرکز بزرگ علمی و ادبی بود، در ایام قدیم "مخدوم" لقب اعوامی آموزگاران دینی بوده، اما مخدوم وارث شاه شخصی بود بنام "حافظ غلام مرتضی" که از احوالش هیچ معلوماتی بدست نمی آید.

گمان غالب اینست که وارث شاه در اوائل قرن هژدهم تولد شده بود، اما بعض مورخین تاریخ تولد او را سنه ۱۱۴۰ ه مطابق ۷۰۲ میلادی قرار میدهند. البته این امر مسلم است که وارث شاه در زمانیکه سرزمین پنجاب دستخوش غارتگری سیکها بود زندگانی داشت و در آثار خود حملات نادر شاه و احمد شاه ابدالی را هم ذکر کرده است.

ورود وارث شاه در پاکپتن

احتمال میرود که اوضاع نامساعد مملکت یا کدام احتیاج شخصی خودش او را بمسافرت پاکپتن وادار ساخته باشد، و یا جهت زیارت مزار بابا فرید شکرگنج و بغرض اکتساب تربیه در تصوف بر پاکپتن مجبور شده باشد.

وارث شاه پس از مراجعت از پاکپتن در مسجدی بنام "ملکه هانز" جاییکه امروز ضلع منتگمری آباد است امام شده بود. مدتها تا قیام خود بحیث امام مسجد مزبور، وارث شاه مبتلای عشق دختری گشت، که از طایفه "جت" بوده "بهاگ بهری" نام داشت.

چون وارث شاه بخاندان سادات متعلق بود و منصب امامت هم بعهدهٔ خود داشت اهالی موضع مذکور او را بنظر توقیر و احترام میدیدند، اما بمجردیکه راز عشقبازی او با دختر روستائی فاش گردید از نظر مردم افتاد، بلکه او را به توهین و بی احترامی از موضع بیرون راندند.

وارث شاه ازین ناکامی در عشق خود و اهانتیکه از دست اهالی موضع دیده بود خیلی متاثر شد و پس بوطن خود برگشت. اما این اوضاع تلخ بی احترامی مردم او را مدد داد و بالآخر بگوشه نشست و در اوقات انزوای موقتی خود، به نوشتن داستان "هیر رانجها" که بالآخر وسیلهٔ شهرت جاوید او گشت پرداخت.

تاریخ صحیح وفات وی بدست نمی آید ولی از اشعار بعد تاریخش پدیدار است که با پیری سن کهولت رسیده و زندگانی درازی کرده باشد.

وارث شاه در قریه خود مدفون است و خوابگاه او دارای کتیبه ای از اشعار خودش می باشد، اما وضع مقبره بمرور زمان خیلی مندرس و فرسوده شده است و باید اکنون ساختمان مزارش مکرراً ترمیم گردد.

رومان عشق و محبت بین دوشیزهٔ زیبا و جمیل روستائی "هیر" و جوان خوش گل "رانجها" که وارث شاه آنرا بشکل داستان عاشقانه در آورده شهرت جاودانی بخشیده است، در حقیقت داستان [illegible]

گویا عاشق ناکام و نامراد، نقش احساسات پر درد خود را در فراق "بهاگ بهری" توسط داستان "هیر" ترسیم کرده است.

این داستان رقت آور که نسلاً بعد نسل، دل هر پیر و جوان و زن و مرد و کوچک و بزرگ را متأثر میسازد، در منظومات لسان پنجابی ممتاز بوده و سزاوار است در صف داستانهای معروف غم انگیز عالم شمرده شود:

وارث شاه بحیث یک شاعر طبیعی و آرتست تخلیقی با وصف طرز بیان اثر پذیر و غم آور خود هیچ وجه از شیکسپیر شاعر انگلیسی و کالیداس شاعر معروف هندی و از حافظ شیرازی کمتر نیست. چون تصنیف وی بزبان محلی پنجابیست، ازین رو شهرت او در بین همزبانانش محدود مانده است:

داستان هیر

داستان هیر و رانجها که آنرا وارث شاه به نظم در آورده قرار ذیل است:- آورده اند ملک [illegible] چوچک که سردار قبیله جاتان و متعلق به خاندان سیالان بود دختری داشت بنام هیر که در حسن و زیبائی نظیری نداشت همچنان در عالم یک جوان رعنا و مجسمه حسن و جوانی پسر کوچک یک ملک دیگر که سردار یک قبیله جاتان بوده به خاندان رانجها تعلق داشت. این خاندان در تخت هزاره هرگوه متوطن بود.- روزی هیر رانجها را دید که یک جوان بی یار و مددگار و بی خانمانی بود، وی از زد و کوب ناروای برادران کلان خود و بخصوص از ستم زنان برادران بستوه آمده، خانه پدر مرحوم خود را یکسر ترک گفته بود. بمجرد یک نظر هیر آن جوان رعنا افتاد بجان [illegible] عشق گرمیده [illegible] کشید که [illegible] عشق و محبت ایشان [illegible] شدند و خواستند او را با پسر سردار [illegible] آنکه [illegible] مقاومت و مخالفت [illegible] و رانجهای بدبخت

و نامراد از حصول گوهر مقصود خود محروم مانده کلیهٔ علائق دنیوی را ترک گفت و "جوگی" یعنی راهب گشت و روزی در لباس قلندری خود را به قریهٔ هیر رسانیده و وسیله ای برای ملاقات بدست آورد تا آنکه هر دوی ایشان فرصتی یافته از آن قریه فراری شدند. قضارا بعد از مدتی هر دو گیر آمدند و متحمل مجازات بدنی و بالآخر محاکمه شدند. قضیهٔ ایشان بحضور قاضی قریه پیش شد اما راجای آن منطقه استماع کوائف قضیه را شخصاً نمود و بعد از استماع آن دستور فسخ عروسی را با سردار رنگپور صادر کرد و هیر را بدست رانجها سپرد. والدین هیر چون پیروان اسلام بودند خواهش کردند که عروسی هیر با رانجها باید حسب مقررات شرعی و مروج بعمل آورده شود؛ بنابرین رانجها را وادار ساختند که قرار رواج عمومی باید با جمعیت عروسی بیاید.

مسموم شدن هیر

هنگامیکه رانجها میخواست جمعیت عروسی را فراهم آورده بخانه هیر ببرد، خویشاوندان هیر بغرض اخفای رسوائی و ننگ خود، او را بیک حیله ای زهر خورانده مسموم ساختند و عاشق ناکام را از فاجعهٔ مرگ ناگهانی هیر اطلاع دادند. بمجرد شنیدن خبر اندوهناک مرگ هیر، رانجهای بی نوای دلداده روی زمین افتاده و از فرط اندوه جان داد. بدین منوال بزرگترین داستان پر درد و غم انگیز عشق هیر و رانجها بپنجابی به اتمام رسید:

اشعار منظوم وارث شاه دارای مزایای خاصی است که داستان سرائی او را ثبات و پایداری می بخشد، مثلاً اسلوب شرح مناظر [illegible] جذبات و احساسات و ترسیم تماثیل تخیلی داستان او را جنبهٔ حقیقی می بخشد که خوانندهٔ [illegible] صورت [illegible] بوقوع آمده است که [illegible] را انفراد [illegible]

یا قلب از دست رفته

سایه ها

شنیده بودم که دکتر سعید ... دیوانه شده ودلم خیلی میخواست ببینمش . هفت هشت سال پیش که هنوز دانشجوی دانشکده طب بود با او آشنا بودم ، جوان زیبائی بود اندامی باریک وقامتی کشیده وسیمائی محبوب داشت .

خدا این سعید را به قیافهٔ یک شاعر آفریده بود ولی جریان تقدیر ماهش در دبیرستان بسمت دانشکدهٔ طب کج کرد . خودش هم خوشنود بود که در آینده طبیب حاذق ولایقی از کار در آمد .

این پنج شش سال هم از عمرش در دانشگاه گذشت و دکتر سعید بنام یک طبیب جراح پا باجتماع گذاشت .

بیش وکم سه سال هم با مردم برای مردم کار کرد وناگهان از کار بازماند زیرا دیوانه شده بود . دیوانه ... اما دیوانه ای که عربده بکشد و زنجیر بگسلاند و با این وآن گلاویز شود .

سعید دیوانه ای نبود که بمردم آزار برساند . آزارش فقط بخودش میرسید . شب وروز فکر می کرد غصه میخورد و اشک میریخت و آنروز که من در آسایشگاه . بسراغش رفتم چشمانش درشتش از اشک غم تر بود .

پنجه های تج کرده اش را دوستانه فشردم وگفتم :-

" آقای دکتر "

تکان سختی خورد ، حرفم را برید ، ابروهایش را با هیئت
آلودی بهم کشید وآهسته گفت " من دیگر دکتر نیستم " دکتر نیستم
خاموش ماندم . چند لحظه پردهٔ سکوت میان ما فا صا
انداخته بود . بالآخره خودش این پرده را برداشت :
" از من نترسید مغزم درست کار می کند . اعتراف می کن
دیوانه ام اما برای هیچکس خطر ندارم پرت وپلا هم نمی گویم .
وبعد خندید !
(دیوانه دوستی) هم فنی از دیوانگی است مگر نیست که م
می گویند (جنون فنون دارد) شعر ایرج میرزا در عارفنامه شا

من است.

یکی عارفت اترا دیوانه گوید — یکی هم مثل من دیوانه جوید

بنابراین شما هم در جنون پای کمی از من ندارید.

دوباره ابروهایش را بهم انداخت و پیشانی صاف.

مهتاب‌ها [illegible] بهم کشید و گفت.

ولی از این بهتر: از تیتر (دکترا) بدم می آید بدم می آید؟ چه می گویم. من از این عنوان می ترسم. من از این عنوان بیزارم. من هر چه کشیده ام و هر چه دارم می کشم از تیتر (دکترا) می کشم... ای خدا. اگر من طبیب نبودم امروز بجائے خودم آدمی بودم. دیگر کسی مرا دیوانه نمی نامید. در این هنگام سعید نگاهی به پنجره [?] انداخت. شیب هائے سبز و شاداب باغ در فروغ آفتاب مهرماه چون ساتن آبی برق میزدند. سرخ گلهائے پائیزه هنوز خون در چهره و خنده برلب داشتند.

سعید آهے کشید و گفت اگر برای تو تعریف نکنم چه کنم چه از کسی (تو دیوانه جو) شایسته تر است که به ماجرای زندگانی یک دیوانه گوش بدهد. وقتی که دانشگاه را با دیپلم و عنوان دکترا ترک گفتم تا چند ماه مطب ام خلوت بود ولی یواش یواش کارم رونق گرفت با دو سه تا جراحی (دهوا نداز) خیابان کاخ را شلوغ کردم سر و صدای مطب من به چند تا خیابان دیگر هم رسیده و داشتم یک شبه ره صد ساله می پیمودم که یک روز مرا به بالین دختر بیماری دعوت کردند.

زن متشخصی که مادر بیمار بود خودش بدنبال من آمده بود. [illegible] و بساط [illegible] را بهم داشتم و به عیادت بیمار رفتم. دختر جوان بود [illegible] نوزده سالش بود. روی تختخوابش [illegible] فرشته ای بهشتی دراز کشیده بود... شاید هم خیلی قشنگی بود اما برای من که طبیب بودم یک مریض بیش نبود فقط یک مریض آنهم مریض قلب.

باید [illegible] گوشی را بروی قلبش گذاشتم. در نخستین جنبش های این پارهٔ گوشت که شما اسمش را قلب گذاشته اید و ده ها داستانها نوشته اید به ناراحتی و فرسودگیش پی بردم. این دیگر قلب نبود. فضائی از هم پاشیده و بهم ریخته ای بود که می بایست تا دختر جوانی را در شور انگیزترین فصل های زندگانیش از دنیا و دنیا عشق و آرزوی و بخاک گور بسپارد. این درد برای طبیب درد بی درمانیست که به بیند مریضش بدرد بی درمانی دچار است.

معهذا لبخندی زدم و گفتم نگران نباشید یک عارضهٔ سادهٔ قلبی است که ناراحتیش تاکنون معالجه شده و انهم [illegible] اش... انهم معالجه خواهد شد و بعد قلم را برداشتم که نسخه اش را بنویسم. چه بنویسم این قلب خراب آباد شدنی نیست..... کو مسیح بن مریم که به گریبان از یاسمن سپیدتر این دختر دم خدائی بدمد و نفس الهی بکشد و مردهٔ مردم را زنده کند.

اما تکلیف من اینست که نسخه اش را تنظیم کنم برای صدمین بار باز هم از کافور و کرامین، قطره ها و امپولهای بدنبال هم قطار کنم و تا جایش بلب نیامده از تسلای این قلب پریشان مضایقه نکنم. نسخه های من نسخه های بیهودهٔ من تکرار [illegible] و فرح اسمش فرح بود.

فرح همچون شمعی که میان گریه بخندد و با همه [illegible] بازهم گرم و روشن باشد به مدرسه میرفت. هم خودش امیدوار بود که بهبودی خواهد یافت و هم مادرش... مادرش که میخواست در پیش پای من بسجده بیفتد زیرا عقیده داشت اعجاز من دختر [illegible] را از مرض مرگ نجات خواهم بخشید ولی من [illegible] روزم در نگرانی می گذشت.

تا آنجا که دیگر نمی توانستم [illegible] هر روز که بسراغ بیمار [illegible] انتظار داشتم از آن خانهٔ قشنگ شیون ماتم بشنوم. این [illegible]

افعی کاهم با هم می گزید.

گفتم: بیمار عزیزم! بلا این بیمار دیگر برای من عزیز شده بود فرح قشنگ بجای آنکه در دست من معالجه شود خودم را مریض کرده بود عادت کرده بودم که همه روز روزی یک بر دیدارش بروم و بهای آن یک ساعت که در کنارش باید بنشینم بیست و سه ساعت دیگرم با اضطراب و هیجانی جنون آمیز می گذشت. از خواب و خوراکم وامانده بودم. فرح هم لیلای نازنین من بود که دلی از مجنون شوریده تر داشت. او هم بیست و سه ساعت در تب و تاب می گذرانید.

تا ساعت مطلوب را دریابد و مرا در برابرش به بیند.

خدایا اگر فرح از دستم برود من از دست خواهم رفت، اگر قلب فرح این قلب نازنین این قلب مالامال از عشق و التهاب از کار بایستد قلب من بکار چه خواهد خورد،

فرح. این دختر مدرسه ... این فرح قلب گرم و زنده من است، منبع حیات و مایه امید و کانون آرزوها و اشتیاق های من است!!

خدای من هنوز فرح از پای درنیامده مرا در پیش پایش فدا کن تا من دنیا را بی فرح نه بینم. خدای من فرح من.

ساعت مچی من از کار مانده بود ساعت ساز کوچه نگاهی بمن گفت آقای دکتر پاندول ساعت شما خراب شده و باید عوضش کنید تا دوباره ساعت شما بکار بیفتد". پاندول قلب ساعت است؟

یارب اگر قلب گرم تر و زنده تری در سینه فرح بکار بگذارم آیا زندگانی خود را از سر نخواهد گرفت. آیا فرح من از خطر مرگ نجات نخواهد یافت قلب دیگر یک قلب گرم یک قلب زنده.

از آن روز در بدر بدنبال. موش و گربه و سگ و خرگوش افتادم سینه ها شگافتم و قلب ها از سینه ها بدر آوردم ولی این قلب ها بدرد فرح من نمی خوردند.

تو قلب هائی که غرق در موج الکل بود فرو رفته بودم در عقب قلب فرح قلبی که شایسته سینه فرح باشد می گشتم ناگهان در اتاقم واشد واحمد سراسیمه بسراغم آمد،

دکتر بفریادم برس زنم دارد میمیرد طفلک تازه عروسی کرده بود".

تازه عروس بدرد بدی دچار شده بود به (التهاب ریوی) بیک خطر عظیم که جز پنجه مرگ در فرهنگ طب نام دیگری ندارد.

جز عمل جراحی چاره نبود.

بید رنگ عروس را بر روی تخت عمل خوابانیدم و سینه دردمندش را شگافتم.

سعی فراوانی بکار بردم بلکه از چنگال مرگ بدرش بیاورم ولی افسوس سعی من بیهوده ماند. هنوز بکار ریه های نهیب کشیده اش نرسیده بودم که نبضش از ضربان وا ماند.

زن احمد بر تخت عمل جان سپرد این عروس جوان که پیراهن زفافش هنوز به "اتوی" دوم نرسیده بود کفن پوشید و بخاک رفت.

از عزاخانه اش به محکمه ام برگشتم ناگهان چشمم بقلب عروس افتاد که گرم و زنده در پیش من بجا مانده است. این قلب را من طی عمل جراحی از سینه عروس در آورده بودم.

فکری مثل برق مغزم را روشن کرد سر از پا نشناخته بسراغ فرح رفتم و بی گفتگو سینه بلورینش را چاک زدم.

دست و بال تجربه کرده ام این عمل حیرت انگیز را همچون معجزه بپایان رسانید. فرح من پس از یک هفته خندان و شادمان بیمارستان را ترک گفت و بجای هر پاداش لبهای آتشینش را برلبم گذاشت.

نمیتوانم بخدا نمیتوانم بگویم که با چه ذوق نشاط آنشب را

به روز رسانیدیم. فرح من یعنی قلب نازنین من دیگر نخواهد مرد. این شمع جمع افروز برای همیشه چراغ عشق و آرزوی من خواهد بود.

عمر من با همسری که اسمش فرح است. با این دختر که عضو وجود من یعنی محبوب ترین اعضای وجود من است با کامیابی و سعادت بسر خواهد رسید.

انتظار داشتم که فردا روشن ... و خوشنود ترا از امروز ببینمش ولی فردا آن فردا دیگر در زندگی من پدیدار نشد آن فردا را دیگر ندیدم ... !

هفتهٔ دیگر با یک دنیا تشویش و اضطراب بخانه شان رفتم بهمان خانه که یک سال از کار تبلوا آمده بودیم بود با آنجا رفتم

تا مادر فرح مرا فراموش کرده خودش در خانه را بروی من گشود و لی گریه کنان گفت.

میداند چه گفت؟ گفت "دکتر من دیگر ترا دوست نمی دارم" "قلب من جز عشق احمد عشق هیچ مرد دیگری را نخواهد پذیرفت" "این قلب که در سینه ام می طپید، کنار احمد در کنار هیچکس آرام نخواهد گرفت."

سعید ناگهان گریه را سر داد. توی گریه اش مثل بچه ها سکسکه میزد و می گفت

"فرح قلب من بود که از دستم رفته بود."

وفا

دکتر سینا

نگاهی آتشین مستانه کردی — نگه چون شمع بر پروانه کردی

نگه کردی که جانم برفروزی — بنای هستیم ویرانه کردی

تهی دیدی ز می پیمانهٔ من — پر از خون دل این پیمانه کردی

من اول عاقلی فرزانه بودم — کنونم عاشقی دیوانه کردی

بدانائی اگر افسانه بودم — بشیدای مرا افسانه کردی

جفاهائیکه کردی با من ای دوست — کجا هرگز تو با بیگانه کردی

تو میگفتی وفا دارم بیاری

وفا را ... جفا ... کردی

زحمت خار

یکی در سایهٔ شاخ صنوبر نغمه ها بر زد
که برگ گل، بقدر زحمت صد خار می ارزد
کسی داند بوقت صبح بر هر قطرهٔ شبنم
شعاع مهر عالمتاب می رقصد که می لرزد

شیخ طریقت

سرشکی چشم چکیده چکیده — شراب محبت مگر ناکشیده
الهی! چه سازم به شیخ طریقت — غم نارسیده، الم ناچشیده

حدیث عشق

غریب عشق سامانی ندارد — جنون دارد بیابانی ندارد
محبت فارغ از رسم و تکلف — اسیر عشق زندانی ندارد
بهار او گلستان در گلستان — بهار من گلستانی ندارد
نه غمخوار و غمگساری را نه جوید — خوش آن دل که درمانی ندارد

آقای دکتر باقر شریعت

هند را بشناسید

تاج محل

پس از مشاهده آن جشن بزرگ ملی هند که جشن جمهوری بود و بعد از دیدن نمایشگاه عظیمی که صنعت و هنر و فرهنگ هند ترقیات اخیر آن را نشان میداد نوبت به برنامه‌ای رسید که گمان میکنم در هر موقع سال هر کس به هند برود باید آن برنامه را دنبال کند و آن دیدن دو اثر مهم بود که یکی کاملا تاریخی است و دیگری تاریخی خواهد شد.

آنکه تاریخی است شهر کهنه و قدیمی و در عین حال باستانی آگرا است که سه هزار سال قبل از مسیح بوجود آمده و در سال ۱۵۰۳ پایه تخت هندوستان گردید بهر حال از زمان پادشاهان مغول عظمت دیگری بخود گرفت تا آنجا که شاه جهان پادشاه مغول بود برای مقبره زنی که باو نهایت علاقه را داشت بنای تاج محل را ظرف ۱۷ سال ساخت که امروز جزء زیبائیهای تاریخی و زیبای جهان است و کمتر کسی است که بهندوستان برود و تاج محل مقبره شاه جهان و زن وی را نبیند.

امروز بیش از سه قرن از سال ۱۶۳۰ که شاه جهان دستور تهیه نقشه تاج محل را داده میگذرد و این اثر تاریخی معنوی نیست چقدر مردم جهان و هند را بتماشای خود کشیده و چقدر برای تاریخ این ساختمان عجیب مردم شهر آگرا و هندوستان پول ریخته شده است.

تاج محل برای هر طبقه از مردم مفهوم مخصوصی دارد برای عشاق مظهر عشق است زیرا در تواریخ چنین نوشته‌اند که شاه جهان آنقدر ارجمند بانو بیگم [illegible] خود را دوست داشت که پس از مرگ وی در ارتش از موسیقی و جشن و محل جواهرات و مردم پرهیز کرد و ظرف دو سال کلیه موهایش سفید شد و حتی پس از مرگ وی در نظر داشت از سلطنت کناره گیری کند.

تاج محل در کنار رود (جمنا) با یک گنبد مرمر و چند مناره و چند ساختمان از سنگ قرمز در چهار طرف آن ساخته شده که رویهمرفته منظره غیر قابل وصفی بوجود می‌آورد و براستی نمونه ذوق و سلیقه و عشق است و کمتر کسی است که با دیدن آن مناظر بیاد عشقهای خود نیفتد.

در عین حال مفهوم مخالف عشق و محبت که در بیننده ایجاد میشود خودخواهی و استبداد پادشاه مغول است که آنهمه خرج و زحمت ۱۷ سال کار را بخاطر انجام وصیت زن خود که ساختمان بینظیری بر سر قبرش کرده بود تحمل کرده است.

مخارج ساختمان تاج محل عبارت از عوائدی قریب بوده که در عرض ۱۷ سال سر به میلیونها روپیه زده است.

مفهوم سوم را اگر در بیننده ایجاد میکند مفهوم هنری است زیرا گلهائی که از سنگهای قیمتی الوان در داخل سنگها و پنجره‌های مرمر کنده شده از شاهکارهای جهان است که هر بیننده‌ای را دچار حیرت و ناگزیر به تحسین میکند. شاید قسمت مهمی از آن کار هنرمندان ایرانی باشد زیرا برای ساختن تاج محل از هنرمندان ایرانی و عرب و ترک دعوت شده بود ولی چون ابیات و اشعار ایرانی بر سنگ قبر شاه جهان و بیگم و در گنبد و غیره با سنگهای قیمتی و زیبا نقش شده بنابراین میتوان گفت قسمت عمده این شاهکار بدست آرتیستهای ایرانی انجام شده است.

شب مهتاب آگرا بقدری قشنگ است که دولت هند [illegible] مخصوصی برای دیدن آن ترتیب داده بود زیرا عصر وارد شهر آگرا شدیم و بلافاصله بدیدن تاج محل رفتیم سپس بهتل آگرا شام خوردیم و پس از شام دوباره در مهتاب آن منظره شاد و زیبائی را دیدیم ولی با اینکه تا پاسی از نیمه شب گذشته آنجا بودیم روز بعد هم قبل از مراجعت

مکتوب نمبر (۱)

مکتوبات منظوم

(از ابوالقاسم لاہوتی)

ای یار عزیز و جانِ شیرین ای دلبر مہربان دیرین
یادِ تو دوای روحِ غمگین از دل بتو صد سلام و تحسین!

آمد خطِ تو، گشادم آنرا بر دیدۂ تر نہادم آنرا
قاصد که بپا فتادم آنرا جان مژدہ بہا بدادم آنرا

تو در خطِ خود چہا نوشتی بر نسبتِ ناروا نوشتی
در بارۂ من خطا نوشتی این خطِ خطا چرا نوشتی؟

من عہد تو را کجا شکستم با کی بجز از تو عہد بستم
کی رشتۂ مہرِ تو گسستم بی یادِ تو کی دمی نشستم؟

پیوستہ در آرزوی رویت بنشستہ نظر کنم بسویت
شاید که وزد نسیم کویت دل زندہ کند مرا ز بویت

صد مرتبہ من، ز پای تا فرق در بحرِ امید و آرزو غرق
از ناحیۂ شمال، تا شرق سوی تو شدم روانہ چون برق

اما تو به من نظر نہ کردی بر کشورِ من سفر نہ کردی
از کوچۂ من گذر نہ کردی یا کردہ ئی و خبر نہ کردی

ہر چند دلم شکستہ ئی تو پیوند وفا گسستہ ئی تو
پیوستہ بجان نشستہ ئی تو زان در بہ جہان بستہ ئی تو

خواہی تو اگر ز مہربانی احوالِ دلِ مرا بدانی
این خط، بزبانِ بی زبانی از دل بتو میدہد نشانی

کردی تو جفا و جور چندین در حقِ من و نرنجم از این
از دل بتو صد سلام و تحسین عمرِ تو دراز باد؛ آمین

پاکستانی بہن کے نام

مکتوب نمبر ۲

(منجانب علیا حضرت نواب رفعت زمانی بیگم صاحبہ آف رامپور)

خوش سخن فخرِ فاخرہ بیگم خرم و شادماں رہو ہر دم
ای مری لاڈلی جہاں آرا تم سے جذباں ہو دل کا گہوارا

بارے مجھ کو ملا تمہارا کارڈ گل بداماں وہ پیارا پیارا کارڈ
دیکھ کر اپ اُلب گشا نامہ لکھتا اس کا جواب کیا خامہ

بسکہ نکلے تھے دل کی راہوں سے
چوما ہر شعر کو نگاہوں سے

خط لکھا ہے کہ شاعری کی ہے
خوب سالانہ تہنیت دی ہے

گو کہ نام خدا جوان ہو میں
پر لڑکپن کی شوخیاں نہ گئیں

کس نے سکھلا دیا یہ چھل دینا
بیٹھ کر دل میں چٹکیاں لینا

حسب عادت ستا رہی ہو بہت
آج تم یاد آ رہی ہو بہت

کیا مناؤں اب ایسی سالگرہ
تم نہیں جب تو کیسی سالگرہ

کاش اللہ خوش نصیب کرے
جلد مجھ سے تمہیں قریب کرے

چاہا خالق نے گر بلطف حبیب
ہو گی چوبیس کو یہی تقریب

اب سنو! اک نئی سناتی ہوں
آپ بیتی زباں پہ لاتی ہوں

تندرستی سے کچھ خفا تھی میں
دل کے دوروں میں مبتلا تھی میں

چین پاتی نہ تھی جو دم بھر کو
پھر تو چھبیسویں نومبر کو

صبح دم رامپور سے ناچار
مجھے لے آئے لکھنؤ سرکار

آج کے کاروبار سے مجبور
انھیں جانا تھا بمبئی بھی ضرور

تیس تاریخ کو بصد شفقت
دے کے تسکین ہو گئے رخصت

پھر بھی رکتی نہیں ملاقاتیں
رہتی ہیں روز و شب بہم باتیں

یاں سے سب عرض حال جاتی ہے
واں سے بھی روز کال آتی ہے

تیرہ کو ہم یہاں سے جائیں گے
اسی دن وہ بھی لوٹ آئیں گے

زندگی حسب مدعا دے دی
مجھے اللہ نے شفا دے دی

اب بتاریخ اختلاج نہیں
کل جو تکلیف تھی وہ آج نہیں

رو بہ اصلاح ہو چلا ہے مزاج
ڈاکٹر بھاٹیا کے زیر علاج

کارفرما انھیں کے ہاتھ رہے
شوکت اللہ خاں بھی ساتھ رہے

اب تو اللہ کی امان میں ہوں
اپنی ناہید کے مکان میں ہوں

دیدنی ہے یہ ناز طفلانہ
وہ مجھے دے رہی ہیں عمرانہ

آج باہم منا رہے ہیں خوشی
احمد و واسع و ہما، نبی

شیما پٹنہ سے آ گئیں دل شاد
اور مہر النساء، زفیق آباد

دو دن ہوئے، حسن کی طلعت
ہیں یہیں سب بخیر و عافیت

اور در خانۂ جمیل چچا
ٹھہرے ہیں رافع و جلیل چچا

دوسری بھی نئی خبر سن لو
ہے تو اک ماہ کی مگر سن لو

دس نومبر کے دن ہوئی پیدا
جگہن کے گھر اک اور ماہ لقا

نام جس کا کنیز کلثوم اور
یہیں ہے عرفیت کرو گر غور

اور مہتاب رامپور میں ہے
انتظار طلوع نور میں ہے

سب بے قلم رد کے اب نجات نہیں
قابل ذکر کوئی بات نہیں

تمہیں حسب نسبت بھی ملیں یعقوب
پیار کرنا مری طرف سے خوب

پھر یہ کہنا کہ اے برادر من
کب تک آخر رہو گے بے دلہن

حسرتیں خواہروں کی بر لاؤ
گھر میں بھابی بیاہ کر لاؤ

گل عشرت یہیں سے چن لونگی
دور ہی سے میں سہرا سن لوں گی

طاہرہ کو یہ خط سنا دینا
میری جانب سے تم دعا دینا

اور گینی آسد کے رخسارے
سرخ کر دینا پیار کے مارے

یہ بھی تاکید جانو میری جاں
پہنچو جس دم بخیر انگلستاں

ہی نوشابہ کا بھی حال کرو
بوسے لے لے کے گال لال کرو

پھر نبیرہ کو گود میں لے کر
اچھی اچھی دعائیں دے دیکر

کہنا خالہ بلا ہیں لیتی ہے
دیکھوں تو کیا جواب دیتی ہے

ہاں رہو ہوشیار اشاعت سے
کیونکہ واقف ہو ہر شرارت سے

تم مگر شاد کام ہی رکھنا
ایسے وحشی کو رام ہی رکھنا

بن کے صیاد صید ہی رکھو
اپنے یوسف کو قید ہی رکھو

اور مضموں کشادہ کیا لکھوں
تمہیں اس سے زیادہ کیا لکھوں

بس یہ ہر روز و شب ہے بازوئے دعا
دونوں کو تندرست رکھے خدا

یوں ہی آپس میں التفات رہے
عید دن، رات شب برات رہے

اچھا اے گلبدن! خدا حافظ
میری پیاری بہن خدا حافظ

راقمہ کی اگر نہ ہو پہچان
میں ہوں رفعت تمہاری آپا جان

پتہ:۔
جہاں آرائے بیگم ذی جاہ
شیخ اشاعت بن حبیب اللہ
ساکن رشک راہ گلشن روڈ
گیارھویں کوٹھی بر کلفٹن روڈ
برسد این خط گہر افشان
در کراچی بملک پاکستان

مکتوب نمبر ۳

مولانا عبدالباری آسی لکھنوی کا خط

(اپنی سالی کے نام)

نیک اطوار و زاہدہ بیگم — تم ہمیشہ رہو خوش و خرم
عیش سارے زمانے کے ہوں نصیب — غم تمہارے کبھی نہ آئے قریب
دوست ہوں سب خوشی سے مالامال — اور دشمن سدا رہیں پامال
تم نے دو خط لکھے وہ دونوں آئے — ساتھ اپنے خوشی کے دفتر لائے
آپکی پہلے خط میں تھی جو خبر — اُس سے دل میں تھا اک خوشی کا اثر
دل کو جس سے قرار رہتا تھا — رات دن انتظار رہتا تھا
آنکھوں میں روشنی نرالی تھی — جیسے ہر جانب اک دوالی تھی
دوسرے خط سے یہ ہوا معلوم — کہ تھی بیکار آنے کی سب دھوم
ابھی دہلی گئے ہیں خانصاحب — پھر نہ آئیں گے چند روز ہم اب
خیر ڈر کیا ہے کچھ دنوں میں سہی — ہے وہی ٹھیک جو ہو انکی خوشی
خیریت خط سے ہو گئی معلوم — اور ہر بات ہو گئی مفہوم
پہلے بیمار تھیں تمہاری بہن — اس کا سب حال تم پہ ہے روشن
ہلکا ہلکا بخار رہتا تھا — اور دل بیقرار رہتا تھا
اس مرض کا کیا جو لوگ نے علاج — تو درستی پہ آگیا تھا مزاج
ہو گئیں تھیں شکایتیں کافور — اور رہنے لگی تھیں وہ مسرور
اب کے اتوار کا سنو قصہ — اچھا خاصا تھا حال سب انکا
دو بجے دن کے میں گیا تھا اس — پھر جب آیا تو پایا انکو اداس
تھی حرارت بھی اور چہرہ زرد — ہاتھ اور پاؤں میں نہایت درد
میں نے پوچھا کہ حال کیسا ہے — سچ بتاؤ یہ حال کیسا ہے
آج پھر کیوں یہ [illegible] آیا — سبب اسکا کہو ہوا ہے کیا
تو وہ بولیں کہ بات اتنی ہے — [illegible] بانی ہے

بس اُسی وقت سے یہ حال ہوا — نہیں معلوم کیا وبال ہوا
بعد اس کے جو اور درد بڑھا — اور بہت تیز پھر بخار چڑھا
رات بھر سخت بیقراری تھی — کرب تھا غم تھا آہ و زاری تھی
رات میں کوئی بن نہ آئی بات — یوں ہی گذری غرض وہ ساری رات
خوب جس وقت دن نکل آیا — ڈاکٹر سے ہی پھر دوا لایا
الغرض پھر دوا پلائی انھیں — کل نہ لیکن ذرا بھی آئی انھیں
کچھ نہ کھایا رہی وہ دن بھر صاف — اور پڑی ہی رہیں وہ اوڑھے لحاف
رات کو کچھ بخار ہلکا یا — اور ذرا ان کو ہوش سا آیا
چونکہ وہ دن سے کچھ نہ کھایا تھا — پیا اس وقت دودھ تھوڑا سا
شدت درد بھی ہوئی کچھ کم — اور کم ہو گیا بخار کا غم
رفتہ رفتہ بخار پھر اُترا — اور جو بگڑا تھا حال وہ سدھرا
ہو گئیں اچھی خدا خدا کر کے — سو گئیں پھر دودھ سے غذا کر کے
دو بجے رات تک وہ بستر پر — سوئیں خراٹے خوب لے لے کر
چین سے میں بھی خوب سوتا تھا — اور کسی بات کا نہ تھا کھٹکا
سوتے سوتے جگا دیا مجھ کو — اور یہ مژدہ سنا دیا مجھ کو
کہا اس وقت خواب دیکھا ہے — جیسے پانی بہت برستا ہے
صحن میں جا کے تم ذرا دیکھو — کہیں سچ مچ نہ مینہ برستا ہو
جلد بائی پڑی ہے جو باہر — ہے اسی پر رضائی اور بستر
بھیگ جائیں نہ سب پانی میں — ہر گرانی ہو سب گرانی میں
آسماں پر نظر جو کی بارے — دیکھتا کیا ہوں نکلے ہیں تارے
پھر بھی میں صحن میں چلا آیا — کیا بتاؤں کہ آکے کیا دیکھا

ننھی ننھی سی پڑ رہی تھی پھوار گرچہ بارش کے تھے نہ کچھ آثار
ایک پلنگ لا بچھایا پھر اندر پھر اٹھایا لحاف اور بستر
نہ کہوں گا اب آدمی اُن کو سمجھوں گا آج سے ولی اُنکو
سو گئیں اس کے بعد وہ یوں ہی اور پھر نیند اُچٹ گئی میری
کروٹیں بدلیں گرچہ بستر پر نیند آئی مگر نہ ذرہ بھر
جی میں آیا کتاب ہی لکھوں صبح تک اپنے وقت کو کاٹوں
لے کے بیٹھا کتاب لکھنے کو لکھوں جب جبکہ مجھ کو ہوش تو ہو
ایک بھی حرف کر سکا نہ رقم دیکھتا تھا کتاب لے کے قلم
لئے بیٹھا تھا میں یونہی خامہ کہ نظر آیا آپ کا نامہ
سوچا اس کا جواب لکھنا ہے اور نہایت شتاب لکھنا ہے
یوں ہی لکھنے لگا میں اسکا جواب بند آنکھیں تھیں اور حال خراب
یوں تو لکھنے کو کچھ نہ تھا مضمون کچھ طبیعت جو ہو گئی موزوں
بیٹھے بیٹھے یہ میں نے کام کیا چار بجے تک ہی خط تمام کیا
تم سمجھ گئی کہ غلط یہ کیا تھا خط جو یوں آدھی رات کو لکھا
ہنسنے کی بات کچھ نہیں نہ ہنسو میں کہوں تم سے ایک بات سنو
ہوتے ہیں شاعر اور سڑی یکساں ہیں عجب طرح کے یہ سب انساں
ہوتے ہیں سب کے سب یہ دیوانے ایسے ہی ہیں سب انکے افسانے
اور اس کے سوا لکھوں اب کیا صرف باقی ہے ذکر چٹکی کا
خط لکھا تھا بنام خانصاحب ایک ہفتہ جسے ہوا ہے اب
اُس کا اب تک نہیں جواب آیا نہیں معلوم اس کا باعث کیا
تھے جو اُس وقت صاحب الاقام اس میں لکھے تھے وہ مزدوری کا
ایک تکلیف تم کو دیتا ہوں کام تھوڑا سا تم سے لیتا ہوں
پورا اناس کے مجھے بھیجو جسطرح بھی ہو اور جیسے ہو
اس سے گو فائدہ ہے مجھکو کیا کیا ہے ایک دوست سے وعدا

(آسی)

تلاشِ حق

سفیر انجم

صدای که از وزش باد پائیزی به برگهای خشک درختان در آن سکوت عمیم شب ایجاد شده و از دور بگوش میرسید بس دلنشین و مطبوع بود چقدر مایلم که این صدا هزاران بار دیگر تکرار شود و در عقب این کوه های سر بفلک کشیده با قطعات رنگارنگ ابر مشغول گفتگو بوند و بر فضای بیکران آسمان ستارگانی چند از فاصله های دور و دراز چشمک میزدند همه جا و همه چیز را حجاب تاریک شب فراگرفته بود. تنها قلب مضطرب من بود که در این تاریکی محض در جستجوی روشنی نوید فنا ناپذیر بود. لحظی ماه دزدیده دزدیده از پشت ابر ها گاهی هر و بقعه های نور خود را باطراف پراگنده نموده و چیزها از پرتو نور خود منور نمود. در این سکوت عمیق شاخسار درختان که از وزش باد به جنبش در آمده بودند اشعه نورانی ماه را در آغوش با خود جای میداد و در آن پرتو نور جلوه دوست را مشاهده نموده محو تماشای او بودم لحظه ای بخود آمده و این موجود ناچیز را در مقابل عظمت و جبروت او که به پیشگاهش بخاک در افتاده و اظهار عبودیت نموده محو تماشای جلوه او شدم که :

صِبْغَةَ اللهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللهِ صِبْغَةً ۔

غزل
از حضرت یکتا بهوپالی مرحوم

نازت بجان ماست تغافل برای چیست
آخر نیاز مندیٔ ما مقتضای چیست

ای ترک شوخ این همه ناز و ادای چیست
بر دل شکستگان، ستم ناروای چیست

ایمان و جان و دل بادای گرفته
آخر دگر ز طرز ستم تدعای چیست

زلف سیاه و کاکل پرپیچ و خال رخ
در حیرتم هنوز دلم در بلای چیست

هر ذره از جمال تو صد جلوه گاه ناز
دیوانه را هدایت هوش از برای چیست

جان حاضر است دل چه کفایت نمی کند
دیگر بگو که بوسهٔ لب را بهای چیست

رفتم بدیر و کعبه و جستم نیافتم
قربان شوم حکایت آن ماسوای چیست

صد آرزوی خون شده صد گونه درد و غم
جز این همه بهجر تو دل آشنای چیست

جز شکر نعمتش نتوان دم زدن بعمر
عمر عزیز ما همه صرف دعای چیست

ساقی حدیث باده خدا را بگو بگو
بینی بذوق بر لب مینا صدای چیست

چون مظهر جمال تو این جمله عالمست
اظهار بی نیازی خود از برای چیست

لطف سخن چو قدر سخن از جهان گذشت
یکتا بیاد رفتگان این وای وای چیست

غزل
از مولوی عبد الرحمٰن صاحب شایق حسان بوم مرحوم

بگذر ز جرم ما و پر از فتنه کار ما
یارب وفا زشت و جفا ها شعار ما

پوشیم از تو تا بکجا جرم های خویش
پنهان ماست پیش تو چون آشکار ما

گرچه بدهر نیست چو من پر عیوب کس
پروای نیست زین که توی پرده دار ما

ای نوبهار بی گل رویت هزار وار
ناله کشیدن است سرانجام کار ما

یارب چسان رهای ازین بند ممکن است
زندان بی بسی است غم گیرو دار ما

کس نیست جز تو کو بنواز د غریب را
پس چشم لطف سوی من ای شهریار ما

در آتش فراق چو سیماب بوده ایم
بنگر به اضطرابی و صد اضطرار ما

ما بهر سیر روی چمن چشم داشتیم
دردا که دستبرد خزان شد بهار ما

ای مایهٔ غرور و تکبر ز راه ناز
بنگر به عجز و بی خودی و انکسار ما

ایمن ز بیم زار بوار و گشته نمود
ما را نوید رحمت پروردگار ما

راز درون شایق بدمست فاش شد
صد الغیاث از می و جام و خمار ما

چندر پرتاب سنگھ جیوری نظمی
بلند شہر

تم اک بادِ سحر جو گلستان در گلستاں گذرے
محم محبوب پر یہ طنز کرنے والے کیا جانیں
مری نظروں نے دامانِ اُفق بھی چاک کر ڈالا
جنھوں نے خونِ دل دیکر چمن کو زندگی بخشی
تمنا تھی کہ وہ ملتے تو کچھ لمحے گلہ کرتے

ہیں اک پھیکی ہنسی جو آنسوؤں کے درمیاں گذرے
اسی منزل سے ادراک وخرد کے کارواں گذرے
میری تخئیل کی راہوں سے کتنے آسماں گذرے
انھیں پر اور فضائے گلستاں بار گراں گذرے؟
ملے وہ تو خدا جانے وہ لمحے کب کہاں گذرے!

مرے نزدیک بس وہ زندگی جینے کے قابل ہے
نظر جو بردو غم کی کشمکش کے درمیاں گذرے

مقاماتِ زندگی

خاص برائے بریدۂ آہنگ

از رشحات قلم مولانا میر فطرت کاشمیری

درجہانِ بےکسی غمناک زی
با دلِ سیپارہ و صد چاک زی
از غمِ دل دیدۂ نمناک زی
چون گہر پاکیزہ جان و پاک زی
با خودی چون طبع می دراک زی
سایہ گستر چون سناکِ تاک زی
ہمچو گل با خاک سازو خاک زی
در چمن چون بلبلِ چالاک زی
ہمچو آتش با خس و خاشاک زی
فطرت آسا عاشقِ بےباک زی
"با غلامانِ شہِ لولاک زی"

مقاماتِ عاشقی

میر فطرت کاشمیری

در جہانِ عاشقی فرہاد زی
[illegible] آہن زی و حداد زی
بیگ زی، [illegible] زی
ہمچو قمری [illegible] آزاد زی
[illegible] نالہ زی، فریاد زی
بلبل آسا [illegible] غم دل شاد زی
ہمچو گل با [illegible] می آباد زی
چون حباب [illegible] سر دوزی [illegible] زی
در چمن چون سرو [illegible] آزاد زی
فطرت آسا [illegible] بندہ زی
"با غلامانِ شہِ بغداد زی"

۱ حضرت شیخ سید عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ

یہ بات شہرت دوام حاصل کر چکی ہے کہ قبلِ مسیح اہلِ یونان فلسفہ اور طب میں مہارت تامہ رکھتے تھے ، اور یونان ہی سے یہ فن روما (اٹلی) یورپین ممالک ، ایشیائے کوچک ، ملکِ شام ، مصر اور ایران پہنچا ۔ اور ان ممالک کی زبانوں میں منتقل کیا گیا ۔ ان ممالک میں طویل مدت تک یہ فن رائج رہا اور کافی شہرت حاصل کی ۔ اس کے بعد یہ فن زوال پذیر ہونے لگا اور اس کی قدر و قیمت اس حد تک کم ہو گئی کہ قریب تھا کہ فنِ طب کا نام و نشان صفحۂ ہستی سے نابود ہو جائے کہ اسی زمانہ میں ایک قوم عرب سے اٹھی اور دنیا پر چھا گئی ۔ یہ قوم دنیائے معلوم کے نصف حصہ پر قابض ہو گئی ۔ یہ قوم مسلمان عرب قوم تھی جس نے بغیر کسی تعصب اور تنگ نظری کے دنیا کے تمام مفید علوم و فنون کی سرپرستی اور اشاعت کی اور بہت سے علوم کو جو گردشِ زمانہ کے باعث فنا ہو رہے تھے زندہ کر کے ترقی دی ۔ اس قوم نے فنِ طب کو بھی جس کے خراب و خستہ آثار ابھی باقی تھے سینہ سے لگایا ۔ عربوں نے طب یونانی کو نہ صرف زندہ کیا بلکہ پوری جدوجہد سے اسے ترقی دی اور یونانی کتابیں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر جمع کیں ۔ اور ایک دار الترجمہ قائم کیا جس میں فنِ طب کی کتابیں یونانی اور سریانی سے عربی میں منتقل کی جاتی تھیں ۔ جب ان کتابوں کے تراجم ہو گئے اور علمِ طب کے سمجھنے میں سہولت ہو گئی تب انہوں نے پوری توجہ اور لگن سے یہ علم سیکھنا شروع کیا ۔ یہاں تک کہ انہوں نے علم طب اور اس کے اصول میں مہارت تامہ حاصل کر لی اور علم طب و فلسفہ میں رازی اور ان کے استاد ابن ربان ، یحییٰ ، علی عباس اور ابن سینا وغیرہ جیسے ائمہ فن پیدا کئے جنہوں نے قدیم طبی کتب کی شرحیں کیں ان پر حواشی لکھے ۔ ان کے خلاصے بنائے ، ان کی تفصیل ، تبویب اور تنقیح کی اور اس سلسلے میں نہایت شاندار خدمات انجام دیں ۔ عرب اطباء نے یونانی طب سے استفادہ کیا اور یونانی طب کی قدیم بنیاد پر قائم رہے لیکن انہوں نے اس سلسلہ میں کورانہ تقلید نہیں کی ۔ بلکہ مسائل و نظریات فن میں مجتہدانہ شان اختیار کی ۔ چنانچہ ابو سہل مسیحی نے متقدمین کے مسائل پر کافی رد و قدح کی ۔ اور شیخ ابن سینا نے بقراط اور جالینوس کے آراء اور معتقدات پر جا بجا گرفت کی ۔ عربوں نے اس فن میں بہت سے جدید انکشافات اور نئی نئی تحقیقیں کیں اور طب یونانی کو اپنے گرانقدر خیالات و افکار عطا کئے ۔ اور اپنی فکری اور اجتہادی قوتوں سے طریقۂ علاج اور اعمالِ فن میں بھی بے شمار تبدیلیاں کیں ۔ مشرق میں فنِ طب کی کتابوں پر ریسرچ اور دار الترجمہ کا قیام ، اور طب یونانی کی سرپرستی و احیاء ، غرض کہ طب یونانی کے سلسلے میں تمام کوششیں بنی عباس کے عہد میں ہوئیں اور انہیں کے عہد میں یہ فن غایتِ کمال کو پہنچا ۔ لیکن مغرب یعنی اسپین میں فن طب کی طرف توجہ اور اس کا

عیاد بنی امیہ کے عہد میں ہوا۔ خلفائے بنی امیہ کے عہد میں
اسلامی سلطنت انتہائی وسعت کو پہنچ گئی تھی۔ یورپ میں ہسپانیہ
عرب قابض تھے۔ اس لئے ہسپانیہ علوم و فنون کا مرکز بنا ہوا
تھا۔ اسی قدر میں وہاں فن طب کی طرف خصوصی توجہ کی گئی
اور یہ فن انتہائی کمال کو پہنچ گیا۔ اور ہسپانیہ کے باشندوں
"مسلمان عربوں" میں سے زہراوی، ابن رشد، ابن زہر،
موسیٰ بن میمون، ابن وافد، ابن بیطار جیسے فلاسفروں اور ماہرین
اطبہ کی ایک جماعت جس کو فن طب و جراحت میں دستگاہ کامل
حاصل تھی افق عالم پر نمودار ہوئی۔

اس زمانہ میں یورپین ممالک ترقی یافتہ نہ تھے۔ یورپ
میں تاریکی اور جہالت چھائی ہوئی تھی اور اہل یورپ اکثر و بیشتر
علوم و فنون سے نابلد تھے لیکن چند صدیوں کے بعد ہی یورپ
میں بیداری پیدا ہوئی۔ اور یورپ خواب غفلت سے جاگ گیا
اور یورپین ممالک کے باشندوں میں بھی علوم و فنون سیکھنے کا
شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ یورپ کے طلبائے ہسپانیہ (یورپ
کا ایک اسلامی ملک) جس کی درخشاں تہذیب کافی شہرت
حاصل کر چکی تھی، کا سفر شروع کیا۔ اور اسپین کے مدارس مراکز
علمیہ میں علوم عقلیہ خصوصاً فن طب و جراحت SURGERY
سیکھنے شروع کئے اور ان علوم و فنون کی تحصیل و تکمیل کے بعد یہ
لوگ واپس چلے گئے اور وہاں پہنچ کر انہوں نے عربی کتابوں
کا اپنی زبانوں میں ترجمہ کیا اور اپنے وطنوں میں ان علوم کی
اشاعت کی۔ اس سے معلوم ہوا کہ عربی نظام طب کو "جس کی بنیاد
یونانی طب پر تھی" یورپ میں پہنچانے میں ہسپانیہ نے نمایاں حصہ
لیا۔ اس کے علاوہ ان علوم کے مشرق سے یورپ منتقل ہونے کا بڑا
سبب صلیبی جنگیں بھی ہیں۔ عیسائیوں نے مشرق میں جب اطباء عرب
کا فضل و کمال اور شہرت وعزت اور تعظیم و تکریم دیکھی تو انہوں
نے بھی ان اطباء کے علوم و فنون حاصل کرنے میں سبقت کی

اور ان علوم و فنون کی تحصیل و تکمیل کے بعد علم طب کے مسائل میں
تحقیق و تفتیش اور رد و قدح شروع کی۔ انہوں نے بھی ان مسائل
و معتقدات پر جو ان کے پیش رو حاصل کر چکے تھے، اکتفا نہیں کیا
بلکہ اس فن میں مجتہدانہ بصیرت حاصل کی اور پچھلوں کی کورانہ تقلید
سے انکار کر دیا۔ انہوں نے ایک نئی طب وضع کی جس کی بنیاد طب
یونانی پر ہی رکھی۔ طب جدید کے لئے بہت سے اصول، دوائیں
اور طریقہائے علاج طب یونانی سے لئے اور بہت سے مسائل اور
طریقہائے علاج اور دواؤں کا اپنی طرف سے اضافہ کیا اور تدریجی
طور پر طب یونانی کو بالکل پلٹ دیا یہاں تک کہ ان کی مخترع طب مستقل
طور پر ایک علیحدہ طب ہو گئی۔ جس طرح اہل عرب نے طب یونانی
کو بدلا تھا۔ اسی طرح عیسائیوں نے بھی اس فن میں تبدیلی کی، لیکن
عربوں نے طب یونانی کا نام بدل کر طب عرب نہیں رکھا تھا بلکہ
انہوں نے ہر وہ چیز جو اہل یونان کی طرف منسوب تھی جوں
کی توں باقی رہنے دی تھی، لیکن اہل یورپ نے طب یونانی کا نام
بھی بدل دیا اور ایلوپیتھک رکھا۔ اس سے پہلے مشرق و مغرب کے
اکثر ممالک میں طب یونانی ہی رائج تھی اور اسی کا اثر و غلبہ تھا لیکن
اس تغیر کے بعد یہ رو بہ انحطاط ہونے لگی اور طب جدید ایلوپیتھک
ترقی کرنے لگی۔ آخر کار طب جدید ایلوپیتھک کو قدیم یونانی پر تقدم
حاصل ہو گیا اور اس نے وہ مقام حاصل کر لیا جو طب قدیم کو حاصل
تھا۔ پہلے یورپ سے اور دوسرے مشرقی ممالک سے طب یونانی مفقود
ہونے لگی۔ اور عراق، شام، ایران، مصر، الشیائے کوچک،
افریقہ، ترکستان اور اسپین وغیرہ ممالک میں "جو طب یونانی کے
بڑے مراکز تھے" اجنبی ہو گئی۔ البتہ حجاز میں طب یونانی باقی رہی اور
ابھی تک باقی ہے۔

طب کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ بغداد کی تباہی کے بعد علوم
طبیہ دنیا کے دو خطوں کی طرف رخ کرنے لگے۔ ایک طرف وہ مصر
الجزائر اور اسپین کے راستے یورپ میں داخل ہونے لگے اور دوسری

وقت ان کا رُخ ایران اور اس کے ساتھ ہندوستان کی طرف ہو گیا۔ ہندوستان کی جانب طب قدیم کا رُخ اور اثر و نفوذ ایک دلچسپ داستان ہے۔ ہندوستان میں ایک خاص طب رائج تھی جس کا نام آیور ویدک تھا۔ اس طریقۂ علاج کی شہرت ہندوستان تک ہی محدود نہ تھی بلکہ قریبی ممالک میں بھی یہ ایک کامیاب طریقۂ علاج سمجھا جاتا تھا اور یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ عرب و ہندوستان و ایران کے درمیان زمانۂ قدیم ہی سے گہرے اور مضبوط روابط قائم تھے۔ چنانچہ ہمیں تاریخ طب میں ملتا ہے کہ خلفائے بنی عباس نے جب یونانی کے احیا، اور تدوین کا ارادہ کیا تو انہوں نے پادشاہان ہند سے خواہش کی کہ وہ انہیں ہندوستان کی عظیم المرتبت اطباء روانہ کریں تاکہ وہ ان کے اس عظیم الشان کام میں معاونت کریں۔ پادشاہانِ ہند نے ان کی خواہش پوری کی اور چند رفیع المرتبت اور یگانۂ روزگار طبیب ان کے ہاں روانہ کر دئے۔

خلفاء نے ہندوستانی اطباء کی نہایت تعظیم و تکریم کی اور بغداد میں ان کی رہائش کا عمدہ انتظام کیا اور ان کے لیے بڑے بڑے وظائف مقرر کئے۔ اطباء ہند کی قابلیت و مہارت اور طریقہائے علاج کو خلفائے بنی عباس نے کافی پسند کیا اور ان حکماء کی کتابوں کا جو ہندوستانی طب آیور ویدک پر لکھی گئی تھیں" عربی میں ترجمہ کرایا۔ ان ہندوستانی اطباء کے نام احوال اور طریقہائے علاج "عیون الانباء فی طبقات الاطباء" (جو طب یونانی اور اطبائے یونان کے بارے میں ایک مشہور اور مستند کتاب ہے) میں تحریر ہیں اور ان اطبائے ہند نے بھی طب یونانی کا گہرا مطالعہ کیا۔ طب یونانی چونکہ اہل ہند کے مزاج کے موافق تھی۔ نیز اس میں بعض ایسے مسائل اور دوائیں پائی جاتی تھیں جو بڑی حد تک آیور ویدک کے مسائل اور دواؤں سے مشابہ تھیں۔ اسی طرح آیور ویدک اکثر و بیشتر امور میں طب یونانی سے مشابہ تھی۔ لہٰذا اطباءِ ہند طب یونانی سے بہت مانوس ہو گئے اور طب یونانی بھی ان کے لئے ایسی ہی ہو گئی جیسے دیسی طب آیور ویدک تھی۔ ان اطباء کے ذریعہ جب طب یونانی ہندوستان پہنچی تو یہاں کی دیسی طب آیور ویدک نے اپنی اس پردیسی بہن کی خوب آؤ بھگت کی اور اس کو اپنی مفید مسائل و اذکار عطا کئے اور اس سے نافع طریقہائے علاج اور مفید مسائل اخذ کئے۔ اسی طرح یونانی طب نے بھی کسی بخل کو روا نہ رکھا۔ ان دونوں میں سے کوئی بھی علم حاصل کرنے میں نہ تو جھجکی اور نہ شرمائی۔ اور یہ دونوں بہنیں بہت جلد شیر و شکر کی طرح گھلی ملی نظر آنے لگیں۔ اس امتزاج کی بدولت دونوں نے کثیر فوائد حاصل کئے اور شاید یہ طریق علاج کی برتری کا اثر تھا کہ آیور ویدک نے باہمہ عظمت یونانی طب کے لئے صدر کی جگہ خالی کر دی اور ہندوستانی طب کی قدر و منزلت ہندوستان سے شہرت میں بہت زیادہ ہو گئی اور اس کا دائرۂ اثر اتنا وسیع ہو گیا اور پادشاہانِ ہند اور امرائے ہند بھی اس کی کافی حوصلہ افزائی اور سرپرستی کرنے لگے ان امور کے باعث طب یونانی اپنے انتہائی مرتبہ کو پہنچ گئی۔ لہٰذا اس نے کمال کا آخری درجہ حاصل کر لیا۔ جب ایرانی اطباء نے ہندوستان میں اپنی جماعت اور اپنی طب (طب یونانی) کی قدر و منزلت کا چرچا سنا تو یہ لوگ ترک وطن کر کے ہندوستان آگئے اور یہیں رہ پڑے۔ یہ اطباء ایک وقت علوم طبیہ کا درس دیتے تھے اور دوسرے وقت اپنے شفاخانوں میں مریضوں کو دیکھا کرتے تھے۔ یہ لوگ امراض کی تشخیص اور معالجات میں ماہر و حاذق تھے اور ان کے شفاخانے چھوٹے بڑوں سب کے لئے یکساں طور پر کھلے ہوئے تھے۔ اہل ہند میں سے ان کے کثیر التعداد شاگرد ہو گئے یہ تلامذہ بھی اپنے اساتذہ کی طرح علوم طبیہ اور اعمال طبیہ دونوں میں ماہر تھے۔ اطباء اور ان کے ہنری شاگرد تمام اطراف ملک میں پھیل گئے اور انہوں نے ملک کے ہر حصہ میں طب یونانی کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ اس زمانہ میں باقاعدہ کالج یا اسکول اور مدرسے نہ تھے اور نہ باقاعدہ امتحانات ہوتے تھے۔ اور نہ ڈگریوں کا ہی کوئی انتظام تھا۔ بلکہ طالبعلم ایک معین مدت تک جو چند سالوں

پر مشتمل ہوتی تھی علم حاصل کیا کرتے تھے۔ جب اساتذہ کو بخوبی اندازہ ہوجاتا تھا کہ اب یہ علوم واعمال میں کمال کو پہنچ گئے تب انہیں سندیں، (ڈگریاں) لکھ دیا کرتے تھے۔ اور طبابت وعلاج کی اجازت دیدیا کرتے تھے۔ مغلوں کے عہد میں خاص طور پر طب یونانی کو فروغ ہوا۔ اس عہد میں دیسی طب (آیورویدک) اور یونانی طب دونوں کی آمیزش وآویزش نظر آتی ہے۔ مغلوں کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ طریقۂ علاج کی برتری اور دوسری بہت سی خصوصیات کے باعث یونانی طب کو دیسی طب پر قبولیت خاص وعام اور تفوق وبرتری حاصل تھی۔ مغل عہد کے اطبا میں حکیم علی گیلانی شارحِ قانون کا مرتبہ نہایت بلند تھا۔

ان کے بعد حکیم مصری، حکیم گیلانی، حکیم الملک گیلانی۔ حکیم لطف اللہ، مسیح الملک شیرازی، مسیح الزماں میر ہاشم، حکیم ارزانی حکیم شریف خاں۔ حکیم علوی خاں اور حکیم اعظم خاں مغل عہد کے نامور اور یگانۂ روزگار اطباء تھے۔

حکیم شریف خاں صاحب محمد شاہ رنگیلے بادشاہ کے عہد نہایت فاضل اور حاذق طبیب تھے۔ آپ خاندانِ شریفی کے بانی ہیں۔ اور آپ کے سلسلے میں دہلی کے بڑے بڑے نامور اور مشاہیر اطباء ہو علم وعمل طب میں یگانۂ روزگار تھے ہوئے ہیں۔ ان اکابر فن میں رئیس الطب حکیم محمود خاں، حکیم واصل خاں حکیم صادق علی خاں۔ حاذق الملک حکیم عبدالمجید خاں اور مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب آسمانِ طب کے شمس وقمر تھے۔ یہ اطبائے کرام دہلی کے تھے اور علوم طبیہ کا مرکز بھی ہندوستان کی راجدھانی دہلی تھی۔ آخری زمانہ میں مغلیہ حکومت کا زوال شروع ہوا تو لکھنؤ جس "جو کہ علوم وفنون کا دوسرا عظیم مرکز تھا" فن طب کو فروغ ہونے لگا اور وہ علوم طبیہ کا دوسرا مرکز بن گیا۔ دہلی اور ہندوستان کے دوسرے شہروں کے بڑے بڑے اطبا یہاں جمع ہوگئے جن کی شہرت سن کر دور دور سے طلباء آنے لگے اور ان اطباء کے گرد طلبائے طب کا ایک جم غفیر رہنے لگا۔

ان طلباء کے ذریعہ فن طب کی ترویج واشاعت لکھنؤ سے دوسرے شہروں میں ہوئی۔ لکھنؤ کے مشاہیر اطباء میں حکیم مرزا علیخاں، حکیم محمد علیخاں، حکیم عماد الدین۔ حکیم مرتعش۔ اور حکیم محمد یعقوب کشمیری نہایت عظیم المرتبت اور رفیع المنزلت اطباء تھے۔ حکیم محمد یعقوب کشمیری کے سلسلے میں بہت سے ممتاز حکما ہوئے ہیں جن کے نام خاص تعظیم وتوقیر کے مستحق ہیں۔ حکیم عبدالعزیز جنہوں نے لکھنؤ میں طب قدیم کی ایک مہتم بالشان درسگاہ تکمیل الطب کے نام سے ۱۹۰۲ء میں لکھنؤ میں قائم کی اور جن کے نام سے لکھنؤ میں خاندان عزیزی مشہور ہے۔ اسی خاندان کے چشم وچراغ تھے اس وقت تک ہندوستان میں فن طب کی صرف ایک ہی درسگاہ "طبیہ کالج دہلی" تھی۔ جسے حاذق الملک حکیم عبدالمجید خاں دہلوی نے ۱۸۹۲ء میں قائم کیا تھا۔ ہندوستان میں علوم طبیہ کی ترویج واشاعت میں ان دو طبی کالجوں کا بہت بڑا حصہ ہے۔ ان کے بعد حیدرآباد نظامیہ طبیہ کالج اور علی گڑھ میں طبیہ کالج کھولے گئے۔ ان کے علاوہ دوسرے شہروں میں بھی درسگاہیں قائم کی گئیں جو انگریزی دورِ حکومت میں فن طب قدیم کی حفاظت اور اشاعت کی ذمہ دار رہیں۔ ہندوستان میں انگریزی حکومت کے قیام کے بعد یورپین طب "ایلوپیتھک" کا غلبہ ہوا ایلوپیتھک کے اثر ونفوذ کا سبب انگریزی حکومت کی اپنی طب (ایلوپیتھک) کی اشاعت وحمایت اور حفاظت وسرپرستی تھی۔

انگریزی حکومت نے طب یونانی اور آیورویدک کی طرف توجہ نہیں کی اور ان کی ترقی کے لئے کوئی کوشش اور مدد کی، انگریزی حکومت کے اس رویے سے ان دونوں قدیم طبوں میں کافی کمزوری آجانا چاہیئے تھی بلکہ ان دونوں کو ختم ہو جانا چاہیئے تھا۔ لیکن اس رویہ کے باوجود ان دونوں پہلوانوں کی پیٹھ زمین سے نہیں لگی۔ اور یہ دونوں حیرت انگیز طریقہ پر ہندوستان میں ابھی تک باقی ہیں۔ ان کے ابھی تک باقی رہنے کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ …

[illegible] سے بہت زیادہ مانوس تھے اور کثیر فائدے اٹھاتے
تھے [illegible] قدیم طبوں میں کچھ ایسی خصوصیات تھیں جن سے
[illegible] طب جدید محروم تھی مثلاً یہ دونوں باعتبارِ علاج سہل
تھیں۔ ان کی دوائیں ارزاں تھیں اور ہندوستان ہی میں پائی
جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ یہ دونوں قدیم طبیں بہ نسبت جدید ایلوپیتھک
کے اہلِ ہند کے مزاج اور طبائع کے زیادہ موافق ہیں۔ اسی وجہ
سے اس گرم ملک کے باشندوں نے طب قدیم کا استعمال ترک نہیں
کیا اور اسی پر اعتماد کرتے رہے۔ آخر میں ایک نہایت دلچسپ اور
حیرت انگیز بات یہ ہے کہ طب یونانی یونان میں پیدا ہوئی اور وہاں
سے دوسرے ممالک میں اس کی اشاعت ہوئی لیکن اس کا اثر و
نفوذ ہندوستان کے سوا اور کہیں باقی نہیں رہا اور اہلِ ہند کے سوا
کسی نے اس کی حمایت و حفاظت نہیں کی۔ اس کی حفاظت و سرپرستی
کا حق ہندوستان ہی کو حاصل ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہندوستان میں
طب یونانی پھر اپنا پچھلا مقام حاصل کر لے۔

قدیم ہندوستان میں تجارت صفحہ ۵۵ سے آگے۔

جو ان تجارتی کاروانوں کی چوروں اور ڈاکوؤں سے حفاظت کے لئے
وقتی طور پر رکھ لی جاتی تھی۔

میگستھنیز کہتا ہے: "راجہ نے تمام راستوں کو ایک دوسرے
سے ایک بہت بڑی سڑک کے ذریعہ ملا دیا ہے جو گاندھارا میں پشاور سے
چل کر ٹکشیلا، کابھنج، ہستناپور، اندرپراگ ہوتی ہوئی پاٹلی پتر تک جاتی
ہے اور وہاں سے بنگال کے مشہور و معروف بندرگاہ "تامرلپتی" کو چلی
جاتی ہے۔ اس بڑی سڑک کی ایک شاخ متھرا سے اجین کو جاتی
تھی اور وہاں سے دریائے سندھ کے دہانے پر بھاروکچھ اور پٹالہ تک پہونچتی تھی
ایک دوسری شاخ بھاروکچھ سے شروع ہو کر مغربی گھاٹیوں میں ہوتی ہوئی دوآبے
کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور وہاں ایک دلکو کنڈا اور دوسری بند یعنی مسولی پٹم کو
چلی جاتی تھی۔ ایک تیسری شاخ کادیوی پٹم سے مری رنگم تک چلی جاتی تھی اور
دریائے کاویری کو پار کر کے یہ بھی دوراہے میں تبدیل ہو جاتی تھی جس میں سے ایک شاخ مدورا
اور دوسرے چیرا بندرگاہوں کو اور دوسری پانڈیہ بندرگاہوں کو دم طور پر
مدورائی کو چلی جاتی تھی۔ اس کے بعد بہت سی چھوٹی چھوٹی سڑکیں بھی تھیں۔

ایمان غزل ہو

از امیر الدین صاحب امیر دہلوی

سرتا بہ قدم حسن کا عنوان غزل ہو
تم میرے لئے مطلعِ دیوانِ غزل ہو

پُرنور جبیں چاند سے عارض پہ نمایاں
انسان ہو یا حور بداماں غزل ہو

ہونٹوں کے تبسم سے چمن کھلتے ہیں لاکھوں
مجموعۂ فیضانِ گلستانِ غزل ہو

ہوتا ہے نہیں دیکھ کے بیدار تخیل
شاعر کے لئے حاصلِ سامانِ غزل ہو

ہر ایک ادا مصرعِ موزونِ غزل ہے
تم روحِ غزل شکرِ غزل جانِ غزل ہو

خلدِ نگہ عشق نگاہیں ہیں تمہاری
رنگین و دل آویز بہر شانِ غزل ہو

میں کیوں نہ امیر ان کو کہوں کعبۂ ہستی
جب ان کا تصور مرا ایمانِ غزل ہو

(خاص آہنگ کے لئے)

بہارِ توبہ شکن

(فرحت گیلانی)

دُرست ہے وہ عذاب و ثواب کا قصہ بجا ہے تیری یہ گفتارِ طاعت و عصیاں
مگر مرے ناصح "قصور میرا نہیں حسنِ کائنات کا ہے"
بھلائے بھرے کوئی دل پہ کتنی دیر، کہ جب
دیارِ لالہ و گل ہیں نگارِ حسنِ بہار بعد نوازشِ پیہم ہو جام لالہ بدست
"گرا رہی ہو تبسم کی بجلیاں ہر سو"
کہ جب حیات کے نازِ آفریں جبین عارض گلاب بن کے گلستاں میں لہلہاتے ہوں
نوائے شاعرِ آتش بیاں کی لے پر جب طیور باغ کے گوشوں میں چہچہاتے ہوں
حیات کا نظر افروز ریشمی آنچل،
فلک کے دوش پہ لہرائے جب ہوا بن کر
قدم قدم پہ بہاروں کی جلوہ سامانی
"اُڑا دے ہوش خرد کے جنوں نوازی سے"
فلک پہ مہوشِ سیمیں بدن و برق ادا . . . . نگارِ حیات
اور . . . . صدائے عام دے رندوں کو میگساری کی
فلک پہ چاند کی ضو پاشیوں کی تابانی
یہ نغمے قمریِ رنگیں بیاں کے، عورتِ ہزار
شرابِ حسن سے بھرپور کنولوں کے ایاغ
یہ حسنِ فطرت و ہنگامِ شامِ شالامار
زبانِ حال سے کہتے ہیں اے مرے ناصح
یہ وقت زہد و ریاضت نہیں خدا کی قسم گھڑی ہے خود کو، خدائی کو بھول جانے کی
"یہ جام تھام لے اور خود کو لازوال بنا"

آلھا

عوامی رزمیہ

حسن عباس فطرت

برسات کے موسم کا وہ وقت جب ساون کا مہینہ اپنی بھرپور جوانی پر ہوتا ہے گھنے گھنے بادلوں کے قافلے ہر وقت آسمان پر دوڑتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ دن رات کی موسلا دھار بارش بادلوں کی گھن گرج ماحول کو ڈراؤنا بنائے رہتی ہے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی اور رسیلی ہوا اُمنگ اور ترنگ کے خزانوں کا مُنہ کھول دیتی ہے۔ انھیں دنوں میں اکثر ہوا تیز سائیں سائیں کے ساتھ جوش و خروش سے بھری ہوئی کچھ لہردار آوازیں فضا کو چیرتی ہوئی سنائی دیتی ہیں۔ لیکن کبھی آپ نے آگے بڑھ کے دیکھا بھی کہ یہ ہے کیا۔ اگر انھیں دیکھا تو آئیے میں آپ کو بتاؤں یہ بھارت کے مشہور عوامی رزمیہ آلھا کھنڈ کی گنجار اور للکار ہے جسے شمالی ہند کے ہر چھوٹے بڑے دیہات و شہر میں آپ بچے بچے کی زبان سے سُن سکتے ہیں اور اگر کہیں آپ ان کی محفل میں جا بیٹھیں جہاں ننگے بدن اور میلی دھوتی باندھے ہوئے کسانوں اور مزدوروں کے مجمع میں آلھا گایا جا رہا ہو تو میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان کی مستی اور جھنکار کو دیکھ کر آپ بھی چند منٹ کے لئے اپنے خون کے دوران میں تیزی محسوس کرنے لگیں گے۔

آلھا کھنڈ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے بھارت کے وہ مشہور جیالے سورما آلھا اودل کے کارناموں کی طویل و دلچسپ داستان ہے۔ اگرچہ اس کی تصنیف کو لگ بھگ آٹھ سو برس سے زائد بیت چکے ہیں پھر بھی ہزاروں شعر کا یہ طویل منظومہ آج بھی اتنا ہی زندہ اور مقبول ہے جتنا شروع عہد میں رہا ہوگا۔ اگرچہ ابتدا میں وہ بندیلی زبان میں لکھا گیا تھا لیکن عوام میں اس کی بے پناہ مقبولیت جس نے اس میں بہت کچھ مقامی حالات و رسم و رواج کے مطابق تبدیلیاں بھی کر ڈالی ہیں اور اب اس کی موجودہ زبان اتنی سہل و سادہ ہے جسے بس ہندوستانی کہا جا سکتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آلھا کھنڈ کے نسخے اُردو رسم الخط میں بھی اتنے ہی ہیں جتنے ہندی میں اور ساتھ ہی یہ بات بھی لائق ذکر ہے کہ اس کا ترجمہ انگریزی میں بھی ہو چکا ہے لیکن پھر بھی اصل آلھا وہی مستند مانا جاتا ہے جو پشت ہا پشت سے سینہ بسینہ چلا آتا ہے اور جس کی کتاب ہماری جنتا کا مضبوط حافظہ ہے اسی لئے آپ دیکھیں گے کہ ہر علاقے اور ہر صوبے کے آلھا میں باوجود بنیادی واقعات کی یکسانیت کے طرزِ اظہار و تشبیہات وغیرہ میں کافی فرق ہے اور وہاں پر وہی آلھا مستند مانا جاتا ہے یہی ایک وحدت مکان کی خامی اگر نہ ہوتی تو بلاشبہ

آلھا دُنیا کی مشہور ایپک نظموں کے مقابل میں رکھا جا سکتا تھا۔ خیر یہ بات توضیح میں آ گئی مجھے کہنا یہ تھا کہ وہ آلھا جو نہ جانے کتنی بار کہاں کہاں اور کتنی بار کتابی صورت میں چھپ چکا ہے جس سے کہیں زیادہ تعداد ان کتابوں کی ہے جسے میں نے عوام کا حافظہ کہا ہے۔ اس طرح اگر قبولیت عامہ اور دوامیت کسی تخلیق کی خوبی پر دلیل و سند بن سکتی ہے تو میں آج صدیوں بعد بھی آلھا کی جیتی جاگتی اور ہمہ گیر مقبولیت کو دیکھ کر بآسانی کہہ سکتا ہوں کہ آلھا کھنڈ ہندوستانی عوام کا "شاہنامہ" ہے۔ یہ نظم جس کا ظاہری ہیکل شاید مثنوی کا سا ہے اور جیسا کہ میں نے بتایا کہ ہزارہا ہزار اور اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کے پڑھنے اور گانے کی بھی ایک مخصوص البیلی اور انوکھی لے ہے جس میں عجیب ناقابل بیان گرفتگی اور گہرائی ہے۔ آپ اس کے گانے کی لے وادا کو دیکھیں ان کا جوش وطنطنا اور بانکی طرز ادا دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ گانے والا آلھا کے کارنامے نہیں بیان کر رہا بلکہ بجائے خود آپ ہی آلھا بنا ہوا پاگل ہو کر میدان جنگ میں دشمن کی کاٹ میں مصروف ہے آخر یہ ولولہ یہ مستی یہ اُبال کہاں سے آجاتا ہے۔ یہ آلھا کھنڈ کے الفاظ کا زیر وبم اصوات کی ہم آہنگی لفظ ومعنی کا حسین رچاؤ اور پُر تاثیر موسیقیت کا چلتا پھرتا جادو ہے جو دھیرے دھیرے سر پر چڑھتا ہی چلا آتا ہے اور دم کے دم میں پڑھنے اور سننے والوں کو مدہوش و سرشار کر دیتا ہے۔ آلھا کھنڈ میں یہی ایک صوتی خصوصیت مرکزی حیثیت رکھتی ہے اور یہی چیز دراصل اس نظم کا محور ہے جس کی گردش اتنی تیز ہے کہ دیگر خصوصیات شعری اس کے ارد گرد ناچتے نظر آتے ہیں۔ اس کے الفاظ اور ان کی آواز، واقعات کی تصویر کشی اور جذبات وخیالات کے بے باکانہ اظہار میں ایسا بھر ملان اور گھلاوٹ ہے

جب کارس کانوں سے اُترتے ہی اپنا جادو بھرا عمل شروع کر دیتا ہے مگر بد مستی کی حد تک نہیں بلکہ رگوں میں خون کی روانی تیز کر دینے اور ولولہ کو شکن بھر دینے تک اس کا آنکھوں دیکھا ثبوت آپ کو روہیل کھنڈ وگوالیار کے علاقہ میں مل سکتا ہے جہاں آلھا گاتے گاتے یکبارگی گوجر اور بھاٹ تلواریں جھکا کر اور بعض وقت تان کر غرّا اُٹھتے ہیں ان کی آنکھیں سُرخ ہو جاتی ہیں، نتھنے پھول جاتے ہیں اور منہ سے جھاگ بہہ نکلتا ہے۔ یہ ہے آلھا کی دین اور چمتکار، وہی آلھا جس کی گونج دار تان فضاؤں کو چیرتی ہوئی آکاش اور پاتال سے ٹکراتی ہے۔ ہمارے شاندار ماضی کی یاد دلاتی اور مستقبل کے لئے مہمیز کا کام دیتی ہے اور ہمارے جذبۂ عقیدت کو جگاتی اور جھنجھوڑتی ہے۔ ہمارے لئے حرارت عمل اور جرأت اقدام کی معلم بنتی ہے۔ شاید یہی اسباب ہیں کہ اتنا طویل رزمیہ ہمارے عوام کی زبان پر ہمہ وقت رقصاں ومتحرک رہتا ہے۔ بظاہر یہ ایک اعجاز بھی ہے اور عظیم مصنف جگنائک کے زبردست ماہر صوتیات وموسیقیت ہونے کا نشان اور زندہ ثبوت بھی کہ اس نے ان اشعار کو ڈھالتے وقت اس کا خاص دھیان اور التزام رکھا کہ اس کی حقیقی حلاوت صحیح تاثر بیان ادا پر موقوف رہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا۔ یہ خزانہ ہمیشہ متحرک رہے گا اور سامنے آتا رہیگا اور پھر اس فسوں کاری کی داد دینا بھی محال ہے کہ اس قدر برقی سرعت کے ساتھ اتنا طویل منظومہ حافظ اور دماغ میں کیسے اپنی مستقل اور اَن مٹ جگہ بنا لیتا ہے اور عموماً لوگ اسے نسلاً بعد نسلٍ ایک دوسرے کو گاتے ہوئے سن کر ہی یاد کر لیتے ہیں۔ اس فلسفہ کے تحت میں نہیں سمجھ پاتا کہ اس نظم کی تحریر، حوالہ واقتباس ناظرین کے سامنے پیش کرنا میرے لئے جائز بھی ہے یا نہیں جب

کہ مزید دشواری یہ بھی ہے کہ اتنی لمبی نظم میں سے جس کا ہر ایک حصہ ایک دوسرے پر فوقیت رکھتا ہے کتنا اور کون سا جز پیش کیا جائے مگر صرف اس خوف سے کہ آپ مجھ پر خلا میں باتیں کرنے کا الزام نہ لگا دیں چند اشعار پیش کرتا ہوں جس سے آلھا کی مخصوص صوتی صنعت کا کچھ اندازہ ہو سکے گا۔ میدانِ حرب و ضرب کا ایک سماں ملاحظہ کیجئے جس میں الفاظ کے تناسب ٹکراؤ اور ترتیب کی ہنرکاری کے ذریعے یوں نقشہ کھینچا گیا ہے

کٹ کٹ سر دھرتی پر گر گئے سب کا چھوٹ گیا ابھیمان
کھٹ کھٹ کھٹ ٹیکا بولے رن مان چھپک چھپک ترواٗ
سَن سَن سَن گولے برسے ٹھن ٹھن بھالن کی جھنکار
کٹ بیچ ونڈ گئی چھترن کی جو جھے بڑے بڑے سردار
چلے سکیلا پانی بن کے جہ پر دو انگل کی باڑھ
چلے جنوبی اور گجراتی رونا چلے ولایت کبار

آلھا کھنڈ کا موضوع حب وطن، کلچرل یک رنگی، ایثار و قربانی، ایکتا اور بھائی چارا، اخلاق و محبت اور خدا پرستی ہے۔ اس نظم میں جگہ جگہ "رام بنائیں تو بن جیہیں بگڑی بنت بنت بن جائے" یہ ٹیپ کے بند کی طرح آتا ہے اور ہندوازم کے گہرے مابعد الطبیعاتی فلسفہ کو دوہراتا ہے اور مافوق الفطرت طاقت کی یاد دہانی اور اس پر اعتماد کی تلقین کرتا رہتا ہے اس کے علاوہ اس میں بے شمار امثال و حکیم محاورات و ضرب المثل کے استعمال کے ساتھ اجتماعی و انفرادی زندگی کے لئے لائحہ عمل پیش کیا گیا ہے اور زندگی کی مشکلات کا حل بتایا گیا ہے۔ ہمت و جرأت اور خود اعتمادانہ زندگی کی تلقین و تبلیغ کے لئے حکیمانہ طریق کار استعمال کیا گیا ہے۔ اس رزمیہ کی ایک اور لائق توجہ خصوصیت تفصیل جزئیات بھی ہے۔ ایک جگہ دو شعروں میں عوامی مثالوں کے ساتھ یہ بتا کر کہ دنیا کی ہر شے کی طرح انسان بھی فانی ہے۔

بہادرانہ موت اس کی جنت ہے اور بستر کی موت ذلت و عذاب، اس طرح جذبۂ مردانگی کو بیدار کیا جاتا ہے۔

سدا تریان نا بن پھولین یار سدا نہ ساون ہوئے
سدا نہ مانا جنے بیٹ سے یار و سدا نہ جیون ہوئے
کھٹیا پر جو تم مر جیہو تمرا اس کاگ نہیں کھائے
جو مر جیہو سمر بھوم ماں تم کا اندر پر ہی لے جائے

میں نے کہیں پر آلھا کھنڈ کو ہندوستانی عوام کا شاہنامہ کہا ہے وہ محض جوش عقیدت مندی یا استعارہ نہیں بلکہ بہت کچھ حقیقت پر مبنی ہے۔ آپ اگر دوسری زبانوں میں آلھا کی ہمہ جہت مثال ڈھونڈیں گے تو کوئی ایک چیز مستقل طور سے آلھا کے ہم پلہ یا ہم مثال نہیں ملے گی ویسے تو یورپ کے اکثر و بیشتر رزمیہ منظومات میں آپ آلھا کی جھلکیاں دیکھ سکتے ہیں مگر فردوسی کا شاہنامہ اور خصوصاً بہرام و شنگھل کی داستان بہت کچھ آلھا کھنڈ سے میل کھاتی ہے اور ہر اعتبار سے شنگھل نامے کی منظر کشی مکالمات کا زور بے باکانہ اور رزم و بزم کی مصوری میں لفظ و معنی کی گھلاوٹ اور صوتیت و موسیقیت کا خاص التزام جو آلھا کھنڈ کی مخصوص و نمایاں صفت ہے کافی حد تک یکساں و ہم رنگ نظر آتی ہے۔ افسوس یہ ہے کہ شنگھل نامے کی خالص پہلوی زبان اتنی سخت و مشکل ہے کہ باوجود سمجھ لینے اور حل کر لینے کے اس کی صحیح لذت و کیفیت ہمیں نہیں آتی ورنہ اس سلسلہ میں لسانیات اور افادہ و استعارہ کے نقطۂ نظر سے مطلب خیز بحث کی جا سکتی ہے۔

آلھا کھنڈ کی ایک اور خصوصیت انگلستان کے مشہور شاعر کولرج کی نظموں کا بھی عنصر مشترک ہے اور وہ پڑھنے اور سننے والوں کی طے شدہ بے اعتقادی کا بہ رضا و رغبت

تھوڑی دیر کے لئے معرض التوا میں پڑ جاتا۔ جس طرح کولرج کی اکثر نظمیں مافوق العادت واقعات اور مافوق البشر ہستیوں کے ذکر سے بھری ہیں مگر اس نے انھیں کچھ ایسے نفسیاتی، جذباتی اور احساسی تاثرات کی رنگ آمیزی کے ذریعہ پیش کیا ہے کہ تھوڑی ہی دیر میں پڑھنے والوں کے سامنے وہ حقیقی پیکر صورت میں آجاتا ہے اور وہ اس کے یقین پر مجبور ہو جاتا ہے۔ بعینہ یہی بات آلہا کھنڈ میں بھی پائی جاتی ہے کیونکہ ہم نے اکثر لوگوں کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ آلہا تو مبالغہ کی پوٹ ہے مگر انھیں کو اس محفل میں ایسا کھویا ہوا مسحور پایا ہے جیسے ان کے تمام یقینی غلط واقعات و قصص کو زبردستی کسی جادوگر نے اپنی لکڑی پھیر کر سچ منوالیا اور وہ یقین کرنے پر مجبور ہو کر رہ گئے ہوں۔

اردو میں رزمیہ شاعری کے وہ بعض مخصوص شعر جو ہنگام کارزار کی عکاسی سے متعلق ہیں بجا طور پر آلہا کا جواب ہو سکتے ہیں۔ البتہ فرق صرف مزاج اور ماحول کا پڑتا ہے مگر لائق لحاظ و توجہ بات تو یہ ہے ہندی شاعری بھی سولہویں صدی تک اس کا نمونہ پیش کر پائی البتہ سترھویں اور اٹھارہویں صدی کے مشہور رزمیہ شاعر بھوشن اور لال کوی کی نظمیں اس کا اثر قبول کئے ہوئے ملتی ہیں۔ بھوشن کی مشہور رزمیہ نظم "شیوراج بھوشن" اور وہ نظمیں جن میں اس نے شیواجی کی بہادری ان کی جنگ ان کے لشکر اور جاہ و جلال کی عکاسی کی ہے اس کا الفاظ کی نشست و ترتیب اور تکرار سے ہیبت ناک ماحول پیدا کرنے کا انداز اور نظم کی آن بان اور تیور صاف بتاتے ہیں کہ بھوشن نے آلہا کھنڈ سے کافی اثر قبول کیا ہے۔

آخر میں مجھے آلہا کھنڈ کی کردار نگاری کے بارے میں بھی کچھ کہنا ہے۔ آلہا کا ہر کردار اپنی جگہ پر مضبوط اور اٹل ہے اور شروع سے آخر تک اپنے مخصوص معیار پر قائم رہتا ہے پھر کردار جتنے ہیں ان میں کوئی بھی الغیاس نہیں سب ایسے جنھیں ہم اپنی عام زندگی میں دیکھتے اور سنتے رہتے ہیں۔ وفا اور اخلاص جانثار و لاوری کا غازہ، عورت، مرد، بچہ، بوڑھے ہر زمانے کے چہرے پر ملا ہوا ملتا ہے اور یہی ایک رزمیہ نظم کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ سب سے زیادہ اہم اور قابل ذکر کردار سید ہے جن کی حیثیت ایک مفکر اور آلہا کے صلاح کار و قوت بازو کی ہے سید کا کردار، حب وطن، جاں فروشی اور ثبات و استقلال کا ایک ایسا عظیم و مکمل خاکہ ہے جس کی فوری تاثیر یہ ہوتی ہے کہ ہمیں اپنی قدیم تہذیب کلچر اتحاد و ایثار حق پرستی وغیرہ پر بے پایاں فخر و مسرت ہونے لگتی ہے اور اس کے تحت تمام ایسے سچے کردار جیسے مہٹوں کا ابراہیم گاردی، رانی جھانسی کا جوش وغیرہ نظروں کے سامنے گردش کرنے لگتے ہیں سب کا کردار باوجود سخت ترین مصائب و آفات کے مرتے دم تک . . . . بے میل اور بے لچک نظر آتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آج بھی آلہا گانے والے عوام روزانہ کی عام زندگی میں بھی سید کا نام بڑے احترام سے لیتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے سید کے کردار نے ان پر انمٹ چھاپ لگا دی ہے۔ جسے وہ کسی وقت بھی فراموش نہیں کر پاتے آج ہم اپنے ماضی کی کھوج میں اٹھے ہیں اور ہمیں موقع ملا ہے تو ضرورت ہے آلہا کھنڈ اور اس کے پس منظر و پیش منظر کا گہرا جائزہ لیا جائے اس سے بہت سے مفید و بامقصد نتائج نکلیں گے اور آلہا اور اودل کی حقیقی عظمت و منزلت بھی متعین ہو سکے گی۔ آلہا جو ہمارے عوام کے دلوں میں رچ بسا ہے آلہا جو ہے نہ مرے گا کیونکہ وہی تو ہمارے جنگل، میدانوں اور بستیوں کا دیوتا ہے اور پرستش کا سلسلہ نہیں جا سکتا ہے

غزل

از فاروق نازکی کاشمیری

میں تھا شریک بزم مئے ناب رات بھر
دل انفعال سے رہا پایاب رات بھر

ایک کرب متنقل تھا ترے انتظار میں
بے کیف سی تھی محفل ارباب رات بھر

دن تو شب وصال کی امید میں کٹا
اور انتظار میں رہا بے خواب رات بھر

دل رعب حسن دوست سے یوں تھرتھرا اٹھا
لرزاں ہو جیسے قطرۂ سیماب رات بھر

کچھ اب تمہاری یاد پہ ہی منحصر نہیں
عادت سی ہے رہتے ہیں بے خواب رات بھر

تھے اضطراب و درد و الم یاس و بے کسی
لیکن بس اک سکون تھا نایاب رات بھر

بہار قفس

از جاوید رامپوری

بہکائے پھر رہے ہیں انھیں بوالہوس ابھی
سمجھے نہیں ہیں عشق کا وہ پیش و پس ابھی

آہ و فغاں پہ ہے یہ مجھے دسترس ابھی
صیاد تو کہے تو جلا دوں قفس ابھی

گو بجلیوں نے گر کے چمن تک جلا دیا
ملتے ہیں آشیاں کے لئے خار و خس ابھی

منزل پہ قافلے تو پہنچ بھی گئے مگر
کانوں میں آ رہی ہے صدائے جرس ابھی

جلوہ ملے گا آئینۂ دل میں طور کا
ٹھہری رہے ذرا نگہ دور رس ابھی

ہوں خواب مرگ میں انھیں جینے کا ہے خیال
زندہ سمجھ رہے ہیں مجھے ہم نفس ابھی

اقرار تو یہی ہے کہ آئیں گے تیرے گھر
لیکن وفائے وعدہ میں ہے پیش و پس ابھی

ناصح شروع عشق میں توبہ بھلی کہی
قابو نہ دل پہ ہے نہ طبیعت پہ بس ابھی

سیر چمن سے خاک تسلی ہو چھوٹ کر
آنکھوں میں پھر رہی ہے بہار قفس ابھی

کیجے نہ آپ فکر مریضان عشق کی
بدبخت ہیں جئیں گے برس دو برس ابھی

واقف ہے اے دل اگلے جواب و سوال سے
اک لفظ بھی کہا تو سنائیں گے دس ابھی

بہر عیادت آج وہ آئے تو یہ کہا
ہے نامراد جینے کی تجھ کو ہوس ابھی

صیاد بعد کرم تو مجھے چھوڑنا نہ تھا
باقی ہے دل میں لذت قید قفس ابھی

اک جام دیکھیے جام کو ساقی نہ ہاتھ روک

غزل

ازمحمد حسن جذبی۔ جوائنٹ سکریٹری ادارۂ فروغ اردو امپھول

دل جو اگر نگاہیں چُراؤ
بات بگڑے گی لیکن بناؤ

انجمن کچھ کھٹکنے لگی ہے
احتیاطِ محبت بڑھاؤ

روشنی میں اضافہ نہ ہوگا
"دن میں کتنی ہی شمعیں جلاؤ"

دل کی دنیا میں رکھا ہی کیا ہے
"آشیانوں پہ بجلی گراؤ"

عقل پر کر رہے ہو بھروسہ
"ہوش میں آؤ اے ناخداؤ"

کیا کہے "بن" پلا دو گے ہم کو
یا یہ کہنا پڑے گا "پلاؤ"

اور ہوتا ہے افشا وہ جذبی
"رازِ اُلفت جہاں تک چھپاؤ"

غزل

(ازمحمد حمیداللہ خان زخمی باغپتی)

پھر تیری یاد شب و روز رُلایا کرتی
ہجر کی بات ستاروں کو سنایا کرتی

یوں تو انسان کی ہوتیں نہ اُمیدیں برباد
کاش تدبیر بھی تقدیر بنایا کرتی

روز ہو جاتا ہے ہر چیز پہ دھوکا تیرا
یوں تری یاد نہ دیوانہ بنایا کرتی

کام کس طرح سے بگڑے ہوئے بن جاتے ہیں؟
کوئی تدبیر بھی یہ راز بتایا کرتی

شاعری کھیل نہیں۔ فن ہے جنابِ زخمی
یہ سکھانے سے بھی اکثر نہیں آیا کرتی

MEERA
ہر ماں
گھر میں رکھنا
میرا اے بی ٹانک اس لئے پسند کرتی ہے
★ مُنہ آنا اور رال بہنا ★ پیاس ہونا ★ دانت نکلنا۔
★ دُودھ ڈالنا ★ قبض ★ بدہضمی و اپھارا و اسہال۔
اور
★ عام جسمانی کمزوری ★ سُوکھا پن ★ ہڈیوں کی کمزوری۔
★ مسوڑھوں کی سُوجن ★ جگر و تلی کا بڑھنا ★ مرض کھجد کی کمزوری
(بچّوں کی عام بیماریوں سے بچاؤ اور پرورش کے لئے)
جوہرِ شفاء ہے اور خوش ذائقہ بھی، جسے بچے ہنسی خوشی پیتے ہیں۔
یہ ہندوستانی دواخانہ پروڈکٹ ہے۔ جو آپ کی قومی ملکیت ہے

ترجمہ عسکری امام

موجیں، ذرّے اور کوانٹم

سنہ ۱۹۱۰ء تک جوہری ساخت کی تحقیق کے سلسلہ میں جو
تجربے اور مشاہدے کئے گئے تھے ان سے اہم معلومات کا ایک
ذخیرہ حاصل ہو گیا تھا اور ان معلومات کی بنا پر جوہر کی ساخت
کا ایک نامکمل سا خاکہ بھی بنایا جا چکا تھا۔ طیف پیمائی کے سہارے
مرکزہ کے برقیاتی کہر کی مکمل چھان بین کی جا چکی تھی۔ اور چند سال
کے اندر اندر مادہ کی ساخت سے متعلق انسان کے بنیادی تصورات
بدل گئے تھے، اور ان کی جگہ اس حقیقت نے لے لی تھی کہ مادہ کی
حالت میں تسلسل نہیں بلکہ وہ بے شمار جواہر پر مشتمل ہے۔ جن کے
مرکزہ کے گرد برقیوں کا طواف جاری ہے لیکن مرکزہ اور برقیوں
کے درمیان ایک خلا حائل ہے۔ جوہری ساخت کی اس نئی دریافت
نے رنگ و نور برق و مقناطیس کو ایک نیا مفہوم عطا کر دیا تھا۔

لیکن ان تحقیقی ترقیوں کے باوجود کچھ دنوں تک یہ جوہری
ساخت کی دھندلی تصویر اجاگر نہ کی جا سکی، بلکہ یہ محسوس کیا گیا کہ
کہ جوہری ساخت کی مکمل اور تشفی بخش تشریح کے لیے چند قوانین
کی پابندی ضروری ہے۔ سائنس طبیعیات والوں کو اپنے اس
پہ جا سکی اور کچھ ہی [illegible] کا پتہ بھی چل گیا کہ ان کے بعض مشاہدوں
کی توجیہہ نہیں کی جا سکتی اور رفتہ رفتہ ایسے ز

اور رفتہ رفتہ ایسے مشاہدوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا اس
میں کسی کو کوئی شک نہ تھا کہ ردرفورڈ اور بوہر نے جوہری ساخت
کی جو تصویر پیش کی تھی وہ درست تھی لیکن پھر بھی ایک وجہ تک
اس کی دھندلاہٹ نہ مٹ سکی اور ردرفورڈ اور بوہر کے نظریہ کا صحیح
مفہوم سمجھا نہ جا سکا۔

سائنس کی تاریخ میں ایسے واقعات بار بار پیش آتے رہتے ہیں
جب کبھی سائنسداں کوئی اہم دریافت کرتے ہیں تو فوراً ہی بعد یہ پتہ
چلتا ہے کہ اس نئی دریافت، نئے تصور کو زندگی بخشنے کے لئے کسی
دوسری حقیقت کی تلاش ضروری ہے۔

کاپرنیکس نے جب زمین کو کائنات کے مرکز سے نکال کر ایک سیارے
مدار پر رکھ دیا جس پر حرکت کرتی ہوئی وہ سورج کے گرد ایک سال میں
ایک گردش مکمل کر لیتی ہے تو اس نے ایک ایسی دنیا کی تشکیل کا [illegible]
سیاروں کی پیچیدہ نقل و حرکت کو ہم مرکز دائرہ [illegible]
اعتبار سے شمسی نظام کا یہ نیا تصور ایک عظیم کامرانی کہے جانے کا مستحق
ہے۔ گیلیلیو نے یہ بتایا کہ مشتری کے گرد چند قمر (SATELLITES) اسی
طرح طواف کرتے ہیں جیسے سورج کے گرد سیارے۔ کیپلر نے یہ معلوم کیا
کہ سیارے ایک گردش کتنی مدت میں کرتے ہیں اور [illegible]
کیا ہے۔ کاپرنیکس، گیلیلیو اور کیپلر نے اپنے مشاہدوں کے [illegible]
کر دیا تھا کہ شمسی نظام میں ایک مرکزی جسم کے گرد [illegible]
کس طرح حکومت کرتے ہیں۔ چاند زمین کے گرد کیوں چکر [illegible]
سوالوں کا ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ لیکن جب نیوٹن نے [illegible]
فلک کی تمام نقل و حرکت کو ایک غیر مرئی قوت تجاذب سے وابستہ کر دیا
تو یہ گتھی بھی سلجھ گئی۔ اس نے یہ ثابت کر دکھایا کہ سورج کی [illegible]

کی گردش کا باعث ہے اور اسی طرح اس نے کاپرنیکس کے نظریہ میں جان ڈال دی۔

انیسویں صدی کے آخری دور میں جب پیکرے نے تابکاری کی دریافت تو اگرچہ ایک عرصہ تک اس مظہر کے اسباب معلوم نہ کئے جا سکے لیکن بیشتر سائنس دان طبیعیات کے مسلمہ اصولوں کی صداقت سے مشکوک ہو گئے۔ جرمن طبیعیات داں پلانک نے جب تابکار عناصر کی شعاع بیزی کی تشریح طبیعیات کے عام قانون کے مطابق کرنا چاہا تو اسے ایک انتہائی پریشان کن صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔ ۱۹۰۰ء میں اس نے یہ اعلان کیا کہ اس نے ایک ضابطہ معلوم کیا ہے جس کے مطابق کسی شعاع بیز جسم سے توانائی مسلسل دھاروں میں خارج نہیں ہوتی۔ بلکہ چھوٹے چھوٹے غیر مرئی اجزا میں۔ پلانک نے توانائی کے ان انتہائی چھوٹے اجزا کو "کوانٹم" کے نام سے موسوم کیا۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ پلانک کے نظریہ کے مطابق سورج کی کرنیں یا کسی شعاع بیز جسم کی کرنیں توانائی کے جواہر پر مشتمل ہیں جو اس قدر چھوٹے ہیں کہ نور اور حرارت کے بہاؤ میں بظاہر ایک تسلسل پیدا ہو جاتا ہے۔ جس طرح ہمارے حواس جوہروں کو انفرادی طور پر دیکھنے اور پہچاننے کے قابل نہیں بلکہ ان کے ایک بہت بڑے مجموعہ کی شناخت کر سکتے ہیں۔ اسی طرح جب ہم توانائی کے منفرد کوانٹم کی تمیز کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں ناکامیابی ہوتی ہے۔

پلانک نے یہ بھی بتایا تھا کہ توانائی کے تمام کوانٹم جسامت میں مساوی نہیں ہوتے بلکہ اشعاعی امواج کے طول کے مطابق ان کی جسامت بدلتی رہتی ہے۔ اگر طول موج کم ہو تو کوانٹم کی جسامت زیادہ ہوتی ہے۔ چنانچہ سرخ شعاؤں کے کوانٹم نیلی اور بنفشی شعاؤں کے کوانٹم سے چھوٹے ہوتے ہیں لیکن بالا بنفشی اور لا شعاؤں کے کوانٹم ان سبھوں سے بڑے ہوتے ہیں۔ یعنی توانائی کے وہ ذرے جو لا شعاؤں سے خارج ہوتے ہیں وہ سورج کی کرنوں کے کوانٹم سے بڑے ہوتے ہیں مگر شمسی توانائی کے کوانٹم سے زیادہ جسامت رکھتے ہیں۔ پلانک کا نظریہ اس تجربہ مشاہدہ کی توضیح بھی کرتا ہے کہ کوئی دھات جتنا زیادہ حرارت زا ہو اس کی چکا چوند اسی قدر نیلی ہوگی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی تعامل میں جتنی حرارت پیدا ہوتی ہے وہ خارج شدہ توانائی کی مقدار کو ظاہر کرتی ہے اور جب کبھی کسی جسم کی توانائی میں وسیع تغیر ہوتا ہے تو بڑے کوانٹم کی تخلیق ہوتی ہے۔

پلانک کے اس کوانٹم نظریہ نے طبیعیات کے تسلیم شدہ اصولوں کی خلاف ورزی کی تھی اور سائنسی دنیا میں اس کا پہلا ردعمل یہ ہوا کہ سائنسدانوں نے کوانٹم نظریہ کو ایک بے بنیاد سا تخیل سمجھ کر نظر انداز کرنے کی کوشش کی لیکن جب اسے تجربے وضع کئے گئے جن سے نہایت کامیابی کے ساتھ کوانٹم وجود کا عملی ثبوت مل گیا تو معترضین کو پلانک کے نظریہ کی صداقت کا معترف ہونا پڑا اور گذشتہ تیس چالیس سال میں صرف طبیعیات ہی نہیں بلکہ کیمیا اور حیاتیات کے شعبوں میں بھی نظریہ کوانٹم کی اہمیت اور افادیت تسلیم کی جا چکی ہے۔

بوہر نے جو جوہری نمونہ پیش کیا تھا اس کا اصل مقصد یہ تھا اس کا اصل مقصد یہ تھا کہ شعاع بیزی کے کوانٹمی نظریہ اور مادہ کے خواص کے متعلق انسان کے عام تصور میں ایک رابطہ پیدا ہو جائے۔ یہ بات بہت قبل سے معلوم تھی کہ گرم گیسوں میں جواہر ایک خاص طول موج کی روشنی یعنی مخصوص جسامت کے کوانٹم خارج کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر کسی گیسی شعلہ میں تھوڑا معمولی نمک رکھ دیا جائے تو زرد روشنی خارج ہوگی کیونکہ سوڈیم کے جواہر صرف ایسے کوانٹم کی تخلیق کرتے ہیں جن کی جسامت زرد روشنی کے طول موج کے مطابق ہوتی ہے۔ بوہر کے خیال کے مطابق اس مظہر کا انحصار ان مداروں کی جسامت پر ہے جن میں برقیے مرکزہ کا طواف کرتے ہیں۔ گویا برقیے اپنا مدار تبدیل کر سکتے ہیں مثلاً اگر ایک جوہر دوسرے جوہر سے شدت کے ساتھ ٹکرا جائے،

جیسا کہ گرم گیسوں میں ہوتا ہوا کرتا ہے تو اس جوہر کے بعید ترین برقیوں میں سے ایک اپنا مدار چھوڑ کر کوئی دوسرا مدار جس کا قطر پہلے سے بڑا ہو اختیار کر سکتا ہے۔ لیکن اس برقیا کی یہ نئی حالت قیام پذیر نہ ہوگی بلکہ فوراً ہی وہ برقیہ اپنی اصل حالت کو لوٹ آئے گا۔ اور اس طرح اس سے نور کا ایک کوانٹم خارج ہوگا۔ یہ حقیقت کہ اس عمل میں ہمیشہ ایک ہی طول موج کی روشنی (یعنی یکساں جسامت کے کوانٹم) ہوتی ہے اس بات کی دلیل ہے کہ برقیوں کی یہ چھلانگ بے قاعدہ اور من مانی نہیں ہوتی بلکہ برقیے ایک مخصوص مدار کو چھوڑ کر کسی دوسرے مخصوص مدار میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہائیڈروجن کے جوہر کو لیجئے۔ اس کے مرکزہ کے گرد صرف ایک برقیہ رقص کرتا ہے۔ یہ برقیہ مرکز کے قریب ترین مدار سے اچھل کر دوسرے، تیسرے، چوتھے وغیرہ مداروں میں داخل ہو سکتا ہے۔ یا اس کے برعکس بعید ترین مدار سے کسی قریب تر مدار کو لوٹ سکتا ہے لیکن دوسرے یا تیسرے یا تیسرے اور چوتھے مدار کی درمیانی جگہ میں اگر یہ برقیہ گردش کرنا چاہے تو یہ ممکن نہیں۔ یہ ان ہی مخصوص مداروں میں گردش کرنے پر مجبور ہے جن کی وسعت پلانک کے "مستقل" سے محسوب کی جا سکتی ہے۔ یہ مستقل پلانک کے ضابطۂ شعاع ریزی کا اہم جزو ہے۔

اس جگہ ہمیں بوہر کے جوہری نمونہ اور شمسی نظام میں ایک بہت اہم فرق نظر آتا ہے۔ اگر زمین کی رفتار یعنی اس کی توانائی میں اضافہ یا کمی کر دیا جائے تو مدار ارضی بھی اسی مطابق بڑا یا چھوٹا ہو جائے گا اور اس طرح زمین اپنی توانائی کے اعتبار سے کسی مدار پر بھی گامزن ہو سکتی ہے۔ اس کے برعکس ایک برقیہ مخصوص جسامت کے مداروں میں متحرک رہنے پر مجبور ہے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب جوہر کے مرکزہ کی قوت کشش جس کے زیر اثر برقیہ اس کا طواف کرتا ہے، سورج کی قوت کشش سے مختلف نوعیت کی ہو۔

اس اختلاف کو آسانی سمجھنے کے لئے فرض کر لیجئے کہ جوہری توانائی کے ایک ظرف میں مرکزہ کے گرد برقیے [illegible] جا رہی ہے۔ اگر اس ظرف کی دیوار ہموار ہوتی تو برقیے اپنی [illegible] کے مطابق ہر ممکن مدار اختیار کر لینے کے قابل ہو جاتے لیکن اس کے برعکس اس ظرف کی دیوار نا ہموار اور بل کھائی ہوئی ہے کہ جب کوئی برقیہ اس کی تہہ سے ابھرنا چاہتا ہے یا بالائی حصہ سے زیریں تہہ کو لوٹنا چاہتا ہے تو اسے مخصوص زینوں سے اچھلتے ہوئے گزرنا پڑتا ہے۔ ان زینوں یا توانائی کی سطحوں کو برقیائی مدار کہتے ہیں۔ جب کسی برقیہ کی توانائی میں کمی یا زیادتی کرنا مطلوب ہو تو اسے ایک سطح یا مدار سے دوسرے مدار میں منتقل کر دینا ضروری ہے لیکن یہ ممکن نہیں کہ وہ دو سطحوں کے درمیانی فاصلہ کا نصف یا چوتھائی حصہ طے کر کے رہ جائے۔ گویا مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ جوہری توانائی میں جب کبھی کوئی تغیر ہوتا ہے تو اس میں شریک ہونے والے کوانٹم کی تعداد کا کسروں میں نہیں بلکہ صحیح اعداد میں ہونا لازمی ہے۔

بوہر کا یہ جوہری تصور کچھ حد تک کاپرنیکس کے نظریہ سے ملتا جلتا ہے۔ بوہر کا نظریہ اس بات کی تشریح کرتا ہے کہ جوہر کے اندر برقیے کس طرح حرکت کرتے ہیں اور ایسا کرنے کے لئے انہیں کس کلیہ کی پابندی کرنی چاہئے لیکن بوہر یہ بتلانے سے قاصر تھا کہ یہ پابندی کیوں ضروری ہے۔ یہ درست ہے کہ بوہر کا جوہری نمونہ پلانک کے کوانٹم نظریہ سے مطابقت رکھتا ہے لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ یہ نظریہ خود بھی ان حقائق پر مبنی ہے جن کا مشاہدہ شعاع ریزی کے تحقیقی تجربوں کے دوران کیا گیا تھا۔ بوہر کے جوہری نمونہ میں بعض دوسرے پریشان کن اور قابل اعتراض نکات بھی تھے جن کی وضاحت طبیعیات کے تسلیم شدہ کلیات کے ذریعہ نہیں کی جا سکتی تھی۔ بوہر نے خود ہی اس دشواری کو بخوبی محسوس کیا تھا۔ مداروں میں گھومتے ہوئے برقیوں کو طبیعیات کے کلیات کے مطابق شعا

بیزہونا چاہیئے لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہوتا کیوں کہ نور کی پیدائش اسی وقت ممکن ہے جب کوئی برقیہ ایک مدار سے اچھل کر دوسرے مدار میں داخل ہو جائے تو پھر طبیعیات کے مستند اصول اور مشاہدوں میں یہ اختلاف یہ غیر ہم آہنگی کیوں ؟

پلانک نے جب اس "کیوں" کا جواب نظریۂ کوانٹم کی شکل میں دیا تو کلاسیکی طبیعیات میں ایک زلزلہ سا آگیا لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد سائنسدانوں نے یہ محسوس کیا کہ نظریۂ کوانٹم سائنس کا حرف آخر نہیں بلکہ نئے اور نامعلوم قوانین اور اصولوں کی ایک انجانی دنیا ــ کوانٹم کی دنیا ــ کا داخلی دروازہ ہے۔ رفتہ رفتہ طبیعیات دانوں کو یقین ہو گیا کہ وہ طبیعیات کے اس نظام سے ناواقف ہیں جس میں نظریہ کوانٹم کی ایک ممتاز حیثیت ہے اور جو ہر کے پیش کردہ عجیب وغریب کلیے جس کا لازمی نتیجہ ہیں لیکن اس نظام کی دریافت کے لئے یہ ضروری تھا کہ کلاسیکی طبیعیات کی خامیوں کا پتہ لگایا جائے۔ طبیعیات کے بنیادی اصول اور قوانین کی تعبیر میں کہیں نہ کہیں طبیعیات دانوں سے ایسی غلطی سرزد ہو گئی تھی جس کے باعث ان قوانین اور مشاہدوں میں کوئی رشتہ نظر نہ آتا تھا۔

لیکن ان مشاہدوں نے خود ہی ان خامیوں کی طرف اشارہ کیا جنہیں نظرانداز کر دیا گیا تھا۔ یہ بات واضح تھی کہ کلاسیکی طبیعیات کا اطلاق بہت ہی چھوٹے ابعاد کی اشیاء پر کامیابی کے ساتھ کیا جا سکتا تھا لیکن ان ہی اصولوں کے سہارے جب سائنسدانوں نے جوہر اور سالمات کی حرکت کو بیان کرنا چاہا تو انہیں ناکامیابی ہوئی۔

جس زمانہ میں نظریۂ کوانٹم نے کلاسیکی طبیعیات کے ایوان میں ایک قیامت برپا کر دی تھی اسی وقت ایک دوسرا خطرہ بھی پیدا ہو گیا تھا۔ آئنسٹائن نے اپنے نظریہ اضافیت سے یہ ثابت کر دکھایا تھا کہ نیوٹن کے میکانی قوانین جو ہماری جانی پہچانی دنیا کے تمام واقعات کی توجیہہ کرتے ہیں، اس دم بیکار ہو جاتے ہیں جب بہت ہی تیز رفتار اور وسیع ابعاد کے اجسام سے بحث کی جائے۔ اس نے یہ بتایا کہ میکانیات کے اصولوں کی بنیاد ہمارے ان مشاہدوں پر ہے جو انسانی دنیا کی پابندیوں کے دست نگر ہیں اور جن کا واسطہ ایسے سست رفتار متحرک اجسام سے ہے جن کی حرکت کو ہم محسوس نہیں کر سکتے ہیں۔ ایسے اجسام پر میکانی اصولوں کا اطلاق ہو سکتا ہے لیکن ان حالات میں جو انسانی تجربہ سے بعید تو ہوں ہمیں ان اصولوں کے کارآمد ہونے کی امید نہیں کرنی چاہیئے۔ آئنسٹائن نے اضافیت کی دنیا کے لئے جو نئے قوانین حرکت مرتب کئے تھے۔ وہ نیوٹن کے حرکی کلیات سے اس وقت مشابہ ہو جاتے ہیں جب ان کا اطلاق محدود رفتار کے متحرک اجسام پر کیا جائے۔

جوہری دنیا میں طبیعیات دانوں نے جوہروں اور برقیوں کو مادی ذروں کی حیثیت بخشی تھی۔ انہیں اس کا یقین تھا کہ الکٹران اور پروٹون جسامت اس حد تک قلیل ہے البرٹ آئنسٹائن سے کہ وہ ہمارے تصور سے بھی بعید ہے۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ اتنی قلیل جسامت کے ساتھ ساتھ وہ برقی بار کے حامل بھی ہیں لیکن پھر بھی ان کے لاشعور میں جوہر، برقیہ اور پروٹون کے متعلق مادی ذروں کا جو تصور رچا گزیں ہو گیا تھا وہ نہ مٹ سکا۔ یہ ان کا قصور نہیں بلکہ انسانی ذہن کی مجبوری تھی۔ انہوں نے جب کبھی جوہر یا پروٹون جیسی قلیل جسامت کی شئے کا تصور کرنا چاہا تو ان کا پابند ذہن سنگ ریزوں یا مادی ذروں تک پہنچ کر رک گیا۔ اس طرح جب انہوں نے نور کی موجوں کے متعلق سوچا تو انہیں کسی جھیل یا تالاب کی سطح پر بل کھاتی، پھیلتی، بڑھتی ہوئی لہر یاد آگئی۔ میکسول کے دور سے یہ احساس پیدا ہو گیا تھا کہ نور کی تخلیق برقی ارتعاش سے ہوتی ہے لیکن انسان کسی برقناطیسی میدان کو اپنے حواس خمسہ کے ذریعہ نہیں پہچان سکتا۔ اس لئے اس نے جب کبھی اس مسئلہ پر غور کیا تو اس کے ذہن نے سطح آب پر مچلتی

ہوئی لہروں کی تصویر پیش کر دی لیکن موجودہ زمانہ میں سائنسی حقیقتوں کے پیش نظر وہی انسان یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہے کہ وہ ان اشیا کا تصور نہیں کر سکتا جو خود اس کی محسوساتی دنیا سے باہر ہیں سمجھنے اور سمجھانے کی خاطر یہ نامناسب نہیں کہ جوہری ساخت کا ایک ایسا نظام وضع کر لیا جائے جو شمسی نظام کے مانند ہو جیسا کہ بوہر اور ردر فورڈ نے کیا تھا لیکن یہ بھی سمجھئے نہ تو سنگ ریزے ہیں اور نہ سیارے ۔ اسی لئے یہ کچھ بہت تعجب کی بات نہیں اگر وہ ان قوانین کی پابندی نہیں کرتے جو بڑے اجسام کے لئے درست تسلیم کئے جا چکے ہیں۔

جوہری طبیعیات کے انتہائی پیچیدہ مسائل میں سے ایک توانائی کے کوانٹم کا مسئلہ ہے کلاسیکی طبیعیات میں نور کی موجوں کو برقناطیسی لہروں کی حیثیت دی گئی ہے۔ یہ لہریں جیسے جیسے فضا کی وسعتوں میں پھیلتی جاتی ہیں ان کا جوش و خروش اسی قدر کم ہوتا چلا جاتا ہے۔ اگر ہم نور کے اس نظریۂ تموج کو پلانک کے کوانٹمی تصورات سے منطبق کریں تو ہم ایک عجیب نتیجہ پر پہنچتے ہیں اگر ہم کسی مخصوص رقبہ مثلاً ایک مربع گز کے پردہ (SCREEN) کو کسی نور کے مبداء سے رفتہ رفتہ دور ہٹاتے جائیں تو اس پردہ پر پڑنے والی روشنی کی مقدار بتدریج گھٹتی جائے گی اور آخرکار بہت فاصلہ پر اس پردہ تک بیک وقت صرف ایک کوانٹم پہنچ سکے گا جو سارے رقبہ پر مساوی طور سے پھیل جائے گا۔ دوسری طرف ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ نور کی موجیں دھاتی سطح سے برقیوں کو خارج کر سکتی ہیں۔ اسی اصول کے مطابق ضیائی خانے (PHOTO CELLS) بنائے گئے ہیں۔ اب اگر دھاتی سطح سے برقیوں کے خارج ہونے پر کیا جائے تو یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ ایسا کرنے کے لئے ایک کوانٹم کو ایک ہی برقیہ سے وابستہ ہونا چاہیئے۔ اگر اس کے بجائے ایک کوانٹم دھاتی سطح کے ایک بڑے رقبہ پر پھیل جائے تو پھر اس سطح سے برقیوں کے خارج ہونے کی امید نہیں کی جا سکتی۔

دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ مدھم روشنی میں ضیائی خانے کا عمل بند ہو جائے گا لیکن حقیقتاً ایسا نہیں ہوتا مدھم روشنی میں بھی برقیوں کا یہ عمل جاری رہتا ہے اس مشاہدہ سے جو ناقابل تردید نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے وہ یہی ہے کہ نور کے کوانٹم فضا میں موجوں کی طرح نہیں پھیلتے اور روشنی کی کرن بجائے کوانٹم کی مسلسل بارش کا نتیجہ ہوتی ہے۔ یہ کوانٹم مادی ذرات سے بھی مشابہت رکھتے ہیں کہ ان کی جسامت ہمیشہ برقرار رہتی ہے اس لئے شعاع ریزی کے مظہر کو سہولت کی خاطر یوں بھی بیان کیا جاتا ہے کہ توانائی کے ذروں کا سیل ہے توانائی کے ان ذروں کو "ضیاء" (PHOTONS) کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر نور کیا ہے؟ ذرہ ہے یا امواج؟ یہی سوال نیوٹن کے عہد میں بھی پیدا ہوا تھا لیکن اس وقت ایسے ثبوت بہم ہو گئے تھے جنہوں نے نظریہ تموج کے حق میں فیصلہ دے دیا تھا۔ وہ ثبوت آج بھی موجود ہیں لیکن وہ ان حقیقتوں سے ٹکرا رہے ہیں جو ضیاریہ کی نظریاتی کی حمایت کرتی ہیں۔ گویا نور کا کوانٹم کبھی ذروں کا بھیس بدلتا ہے اور کبھی موجوں کا روپ بھر لیتا ہے۔

ضیاریہ کی اس دو رخی زندگی نے طبیعیات دانوں کو ایک اور حیرت انگیز بات سوچنے پر مجبور کر دیا۔ چونکہ نور کی … کی خصوصیت بھی رکھتی ہیں اس لئے انہوں نے سوچا کیا یہ ممکن ہے کہ ذرے بھی موجوں کا روپ بھر سکتے ہوں؟ ۱۹۲۴ء میں لوئی ڈے بروگلی نے اپنا یہ نظریہ پیش کیا کہ بہت تیز رفتار ذرات خط مستقیم میں حرکت نہیں کرتے بلکہ ان کی رفتار … کی طرح بل کھاتی ہوئی ہوتی ہے۔ اگرچہ ان "مادی امواج" کا صحیح مفہوم ایک عرصہ تک غلطاں اور مبہم رہا لیکن اس نظریہ نے جدید طبیعیات کو عروج و کمال کی انتہا تک پہنچا دیا۔ ڈے بروگلی کے نظریہ کی اشاعت …

ہو ایک کامیاب تجربہ کیا گیا جس سے یہ ظاہر ہو گیا کہ اگر ذرات
کی مسلسل بارش ہو تو وہ موجوں کا رویہ اختیار کر لیتے ہیں۔
اس نئی اور تعجب خیز حقیقت کی دریافت تقریباً ایک وقت
برطانیہ میں جی پی تھامسن اور امریکہ میں ڈیویسن اور جرمر
(GERMER) نے کی تھی۔ انہوں نے اپنے تجربوں میں برقیوں
کو ایک نہایت ہی باریک جالی سے گذار کر مشاہدہ کیا تھا۔ ان
تجربوں سے حاصل شدہ نتائج بہت عجیب و غریب ہیں اور
ان کو سمجھنے کے لئے ہمیں خود ہی اس کی جانچ کرنی چاہیئے کہ
ایسے عمل سے کن نتائج کی امید کی جا سکتی ہے۔ اگر سنگ ریزوں
کی ایک باریک دھار کسی چھلنی پر گرائی جائے تو بعض ذرے جالی
کے تاروں کے چھوئے بغیر براہ راست گذر جائیں گے مگر بعض
ذرے تاروں سے ٹکرا کر منتشر ہو جائیں گے جس کا انحصار ان ذرات
اور جالی کے سوراخوں کی اضافی جسامت پر ہوگا۔ سوراخ جتنا
باریک ہوگا۔ سنگ ریزے اسی قدر زیادہ منتشر ہوں گے بہر حال
اس جالی کے سوراخ باریک ہوں یا نہ ہوں ان سے گذرنے
نے بعد تمام ذروں کی حالت تقریباً یکساں ہوگی۔ بیشتر ذرات جالی
کے زیریں مقام کے مرکزی حصہ پر گر کر جمع ہو جائیں گے اور جیسے
جیسے اس مرکز سے فاصلہ بڑھتا جائے گا۔ ذروں کی تعداد کم ہوتی
چلی جائے گی۔ اگر اس جالی کے نیچے ایک بھیگا ہوا سیاہ کپڑا رکھ
دیا جائے تو اس کے مرکزی حصہ پر ایک سفید دھبہ پڑ جائے گا جو
کناروں کی جانب بتدریج دھندلا ہوتا جائے گا۔ اب اگر
ذروں کے بجائے برقیوں کی موجوں کو جالی سے گذارنے کا تجربہ کیا
جائے تو صورت حال بالکل بدل جاتی ہے۔ بتدریج گھٹتے ہوئے
سفید دھبوں کے بجائے بالترتیب روشن اور تاریک حلقے
دکھائی دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب نورانی موجیں جالی سے
گذرتی ہیں تو وہ منتشر ہو کر ایک نئی راہ اختیار کر لیتی ہیں اور اس
طرح ایک موج دوسری موج سے ٹکرا جاتی ہے۔ لیکن جس طرح
مادی ذروں کے یکجا ہو جانے سے ان کی مجموعی تعداد میں اضافہ
ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ان موجوں کے ملاپ سے ان کے تموج
میں ہمیشہ زیادتی نہیں ہوتی بلکہ جب ایک موج کا فراز (CREST)
دوسری موج کے فراز سے ملتا ہے تو ان دونوں کے امتزاج
سے ایک قوی تر موج پیدا ہوتی ہے اور یہیں ایک روشن حلقہ
دکھائی دیتا ہے لیکن جب ایک موج کے فراز اور دوسری موج کے
نشیب (TROUGH) میں ٹکرار ہوتی ہے تو دونوں موجوں
کا اثر زائل ہو جاتا ہے۔ اور جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس جگہ مکمل
تاریکی ہو جاتی ہے۔ اسی لئے ہمیں نوری امواج کے انکساری نقشہ
(DIFFRACTION PATTERN) میں متواتر
روشن اور تاریک حلقے دکھائی دیتے ہیں۔ پانی کی سطح پر دو
تداخلی موجیں (INTERFERING WAVES) پیدا
کر کے اس بات کا مظاہرہ کیا جا سکتا ہے کہ نوری امواج کا
انکساری نقشہ کس طرح بن جاتا ہے۔ مندرجہ بالا بیان سے
یہ صاف ظاہر ہے کہ جالی یا چھلنی سے گذر کر موجوں کا رویہ ذرات
سے مختلف ہوتا ہے۔ دراصل یہی تجربہ ینگ اور فرینل نے
نور کے نظریہ تموج کو ثابت کرنے کے لئے کیا تھا۔ اور اس
طرح نیوٹن کا یہ نظریہ کا نور جسیموں (CORPUSCLES)
پر مشتمل ہے غلط قرار دیا گیا تھا۔ لوئی ڈی بروگلی کی "مادی
امواج" کے وجود کو ثابت کرنے کے لئے بھی یہی تجربہ مناسب
تھا کہ مادہ کے بنیادی جزو برقیہ کو بہت ہی باریک جالی سے
گذارا جائے۔ خوش قسمتی سے ہمیں قدرت نے قلموں
(CRYSTALS) کی شکل میں بہت ہی عمدہ اور باریک
چھلنی یا جالی عطا کی ہے جس میں جوہروں کی منظم ترتیب سے ایک
ایسا جال بن جاتا ہے جس سے برقئے بآسانی گذر سکتے ہیں۔ لاؤ
نے اس سے بہت قبل یہ تجویز پیش کی تھی کہ لا شعاعوں کے لئے
قلموں کو جالی (GRATING) کی حیثیت سے استعمال

لیا جا سکتا ہے اور اس کے بعد ہی اس بیان کی تصدیق بھی
ہو گئی تھی لیکن جب برقیوں کو ایک قلم سے گذار کر ان کی عکسی
تصویر لی گئی تو ایک انتہائی حیرتناک مشاہدہ کیا گیا۔ وہ تصویر
نور کی موجوں اور لاشعاعوں کے انکساری نقشہ سے مکمل
مشابہت رکھتی تھی

ڈے بروگلی کا نظریہ جسے ابتدا میں بہت ہی مشکوک
اور حقارت آمیز نگاہوں سے دیکھا گیا تھا۔ آخر کار ایک تابندہ
حقیقت بن کر جگمگا اٹھا اور اس اجالے میں سائنسدانوں
نے یہ مشاہدہ کیا کہ نور کی موجوں کی طرح برقیاتی موجوں کو
بھی مقناطیسی یا برقی میدان کے زیر اثر موڑا جا سکتا ہے جہاں
تک جوہری نمونے سے سروکار ہے ڈے بروگلی کے نظریہ
کی تصدیق سے بالکل ہی نئے اور پریشان کن حالات پیدا
ہو گئے تھے۔ توانائی کے کوانٹم کی دورخی زندگی نے جوہری
ساخت کی پہیلی کو مزید الجھا دیا تھا۔ کیونکہ مادہ کے عنصری اندرون
میں کوانٹم جیسا دھوا پن تلاش کرنا سب سے زیادہ مشکل امر
تھا لیکن ڈے بروگلی کے نظریہ نے اس جوہری تصور کو ہمیشہ
کے لئے مٹا دیا جس میں جوہری ساخت کو شمسی نظام سے مشابہ
سمجھا گیا تھا۔ مگر اس کے باوجود سائنسدانوں پر اس وقت ایک
عجیب اضطرابی کیفیت چھائی تھی۔ بڑے بڑے معزز صنوبروں اور
حیرت انگیز تجربوں نے کوانٹمی دنیا کے در کھول دیئے تھے۔
لیکن جلووں کی اس فراوانی میں خود اہل ذوق کا کوئی منظور
نظر نہ تھا۔ ان کے خیالات الجھے الجھے سے تھے اور وہ کبھی
نظریہ تموج کی حمایت کرتے تھے۔ کبھی جسیموں کے نظریہ کو
درست مانتے تھے۔ چنانچہ اس وقت طبیعیات دانوں کی جو
بے نظیر حالت تھی۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے سر ولیم بیگ (مرحوم)
نے یہ کہا تھا۔

"ہم پیر، بدھ، اور جمعہ کو نظریۂ موج کا درس دیتے

ہیں اور سنیچر کو جسیمی نظریہ کا سبق پڑھاتے ہیں۔

اس کشمکش کو دور کرنے کے لئے طبیعی مظاہر کی تشریح
کا ایک بالکل ہی نیا طریقہ اختیار کیا گیا۔ لیکن کوانٹمی طبیعیات کی
طلسمی دنیا میں قدم رکھنے سے قبل ہمیں ڈیراک (DIRAC) کے
اس عجیب وغریب نظریہ کا جائزہ لینا چاہیئے جس سے اشعاعی
توانائی اور مادہ کی وابستگی میں ایک انوکھا رنگ پیدا ہو گیا ہے۔

انسان نے کائنات کی پہیلی کو سمجھنے کے لئے اپنی دنیا کے
مختلف النوع مسائل کو رفتہ رفتہ سادہ اور عمومی تصورات
میں بدل رہا ہے۔ سب سے پہلے یہ بات ثابت کی گئی کہ ہمارے
گرد وپیش میں بے شمار اور مختلف رنگ وروپ کی جو نامیاتی
اور غیر نامیاتی اشیا بکھری پڑی ہیں وہ صرف ۹۲ مختلف جواہر
کے باہمی امتزاج کا نتیجہ ہیں۔ جو کبھی ناقابل تقسیم سمجھا جاتا تھا
مگر ایک دن وہ بھی آیا جب سے توڑ کر اس کے تین ترکیبی اجزا
الکٹرون، پروٹون، اور نیوٹرون۔ دریافت کر لئے گئے۔ اسی
زمانہ میں یہ بھی تسلیم کر لیا گیا کہ نور، حرارت بالا بنفشی شعاعیں
لاشعاعیں اور جیم شعاعیں برقناطیسی موجوں کی مختلف شکلیں
ہیں اور یہ سب ایک دوسرے سے اسی حد تک مختلف ہیں کہ
ان کا طول موج مختلف لیکن اس کے بعد ضیائی اثر، برقیاتی
انکسار اور بیشتر دوسری دریافتوں نے ایسے حالات پیدا کر دیئے
جن سے مادہ اور توانائی کا ظاہری اختلاف مٹتا چلا گیا۔

مادہ اور شعاعی بیزی کی وابستگی کی آخری کڑی ڈیراک نے
۱۹۳۰ء میں جوڑی جب کہ اس نے فضا اور مادہ کی ترکیب
کا ایک ایسا نظریہ پیش کیا جس نے اعتراضات، بے اعتقادی
اور شکوک وشبہات کا ایک طوفان برپا کر دیا۔

اضافیت کے اصولوں کے سہارے ڈیراک نے اپنے
نظریۂ کوانٹم مساوات میں ایسی مساواتیں وضع کی تھیں جو
برقیوں کے رویہ کو صحیح طور سے ظاہر کرتی ہیں لیکن ڈیراک

نظریہ کی سب سے تعجب خیز اور انوکھی بات یہ ہے کہ اس
ان مادی ذرات، جنہیں ہم جانتے پہچانتے ہیں کے علاوہ
ذرات سے بھی بحث کی گئی جن کا ہماری محسوساتی دنیا میں
کوئی وجود نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ڈیراک نے کاغذ
ریاضیاتی بنیاد کی تخلیق کی ہے، اس میں مناسب اور یکسانیت
ن ہے۔

مادی اشیاء کی مثبت کمیت (جسے ہم دیکھنے اور محسوس
نے کے اہل ہیں) کے ساتھ ساتھ وہاں "منفی کمیت" بھی موجود
لیکن اس منفی کمیت کا اصل مفہوم کیا ہے یہ بتانا آسان نہیں
جب ہم محض سامانی اور ریاضی کے ایک ایسے دور سے گذر رہے
ب یہ منفی فیثوں اور نفی کے نشان کو پچھلی صدیوں سے
ذر پر سمجھا گیا ہے۔ منفی مکان، منفی رقم، منفی غذا جیسے
ی مراد وہ اشیاء ہوتی ہیں جو باقی نہیں رہیں۔ چنانچہ
ک کی تصویر دنیا منفی مادہ یعنی خلا سے بھری ہوئی ہے۔ اس
نظریہ کے مطابق وہ خلا جو کائنات کے ستاروں اور
یموں (NEBULAE) کو علیحدہ کرتا ہے۔ منفی کمیت
رقیوں سے بھرا ہوا ہے۔ وہ مادی برقئے جن کا مشاہدہ
اپنے حواس یا آلات کے ذریعے کرتے ہیں۔ انہی منفی برقیوں
تی مانند اجزا ہیں لیکن ان کی قسمت میں بھی ایک دن منفی
کے بحر بیکراں میں ڈوب کر فنا ہو جانا لکھا ہے۔

ڈیراک کا یہ تصور کتنا عجیب اور بھیانک ہے۔ آپ اسے
پاگل کی بک سمجھ رہے ہوں گے۔ یا ایک طبیعیات داں
با اڑاؤ نا خواب جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے۔ سائنسدانوں
ڈیراک کی فراست اور لطافت بیان کی داد دینے کے باوجود
کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ان میں سے بہتوں
سوس کیا کہ ڈیراک نے ایسی اشیاء سے بحث کی ہے جو اصولی طور
ین موجود نہیں ہو سکتیں اور پھر انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ
کائنات کا ایسا نظریہ جس کی حقیقت کو آزمایا نہ جا سکے۔ سائنس
میں کوئی مقام نہیں پا سکتا ہے لیکن دو سال کے اندر ہی ان کا فیصلہ
غلط ثابت ہو گیا۔

اگرچہ یہ درست ہے کہ ڈیراک کی تخلیق کردہ دنیا منفی مادہ
سے مکمل طور پر بھری ہے جسے دیکھا یا محسوس کیا نہیں جا سکتا۔ لیکن
پھر بھی قرین قیاس یہ ہے کہ ابھی اس میں مزید گنجائش ہوگی کیونکہ
ہماری دنیا کا جو ترکیبی مثبت مادہ ہے اسے منفی کمیت
کے بحر بے پایاں میں ڈوب کر فنا ہو جانا باقی ہے۔ اس کیفیت
کا اندازہ کرنے کے لئے سینما ہال کی مثال کو لیجیے۔ فرض
کیجئے کہ فلم شروع ہونے میں چند منٹ کی دیر ہے اور بیشتر
نشستیں تماشائیوں سے بھر چکی ہیں۔ اپنی اپنی نشستوں پر
بیٹھے ان تماشائیوں کو منفی کمیت کے ان برقیوں سے
کائنات کا گوشہ گوشہ بھر گیا ہے اور جو ہماری محسوساتی
دنیا سے معدوم ہو گئے ہیں سینما ہال میں تاخیر سے داخل
ہونے والے کچھ ایسے افراد بھی ہیں جو اپنے لئے نشستوں
کی تلاش میں ادھر ادھر چکر لگا رہے ہیں۔ ان کی مثال ان
برقیوں کی سی ہے جو اپنی مثبت کمیت کے باعث انسانی
مشاہدہ کے قابل ہیں۔ یہی اس مادہ کے تعمیری اجزا ہیں
جن سے سورج زمین، ستاروں اور ان صفات کی تخلیق
ہوتی ہے۔ اب اگر سینما ہال کا ایک جائزہ لیا جائے تو بعض
نشستیں خالی نظر آئیں گی جیسے تاخیر سے آنے والوں کا
انتظار کر رہی ہوں۔ ہماری کائنات میں اگر ایسی ہی خالی
نشستیں موجود ہیں جن پر برقیوں نے اب تک اپنا قبضہ نہیں
جمایا تو انہیں خلا میں "سوراخوں" کی طرح ظاہر ہونا چاہیئے
خلا میں یہ "سوراخ" واضح طور پر کوئی ایسا مقام ہوگا جسے
خلا سے متمیز کیا جا سکے اور اسی لئے ڈیراک نے یہ خیال ظاہر
کیا کہ ان سوراخ کا مشاہدہ ممکن ہوگا۔ خالی فضا میں

یہ سوراخ جن میں برقیے مکمل طور پر سما سکتے ہیں۔ خود برقیوں کے روپ میں ظاہر ہوں گے لیکن ان پر مثبت برقی بار ہوگا جب کائنات کے کسی گوشہ میں ایک معمولی برقیہ ایسے کسی "سوراخ" میں سما جائے گا تو دونوں کے اتصال سے ان کی جگہ ایک خلا پیدا ہو جائے گا۔ گویا مادہ فنا ہو جائے گا۔ سینما ہال کی مثال کے مطابق اس کا مطلب یہ ہے کہ تاخیر سے آنے والے نے اپنے لئے ایک نشست حاصل کر لی اور ہال میں بیٹھے ہوئے تماشائیوں کے ہجوم میں کھو گیا۔

لیکن مثبت اور منفی کمیت کی یہ تصویر ابھی تک نا تمام ہے جب ایک عام برقیہ خلا کے کسی "سوراخ" میں سما جاتا ہے تو اس طرح کمیت فنا ہو جاتی ہے اور اپنا ایک نشان چھوڑ جاتی ہے مثبت اور منفی کمیت کے اتصال سے اشعاعی توانائی کی لہریں فضا کی وسعتوں میں پھیل جاتی ہیں جیسے مادہ کے فنا ہونے کا اعلان کر رہی ہوں۔ اب لازمی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کا برعکس عمل یعنی توانائی کی فنا اور مادہ کی تخلیق بھی ممکن ہے یا نہیں؟ کیا نور کا ایک کوانٹم فنا کر دو برقیوں کو جنم دے سکتا ہے جن میں ایک عام برقیہ ہو اور دوسرا مثبت بار کا حامل ہو۔ اگر ایسا ممکن ہے تو مثبت برقیوں کا مشاہدہ بھی ممکن ہوگا۔

اس سوال کا تشفی بخش جواب ۱۹۳۲ء میں دیا جا سکا جب امریکہ میں اینڈرسن اور اس کے فوراً ہی بعد انگلینڈ میں بلیکٹ نے مثبت برقیوں کی دریافت۔ یہ مثبت برقیے اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب کونی شعاعیں (COSMIC RAYS) کسی مادی شے سے ٹکرا جاتی ہیں۔ نور کا ایک کوانٹم فنا ہو جاتا ہے اور اس کے عوض برقیوں کے ایک جوڑے کی تخلیق ہوتی ہے جن میں ایک پر مثبت برقی بار دوسرے پر منفی برقی بار ہوتا ہے۔ اس مثبت برقیہ کا دوسرا نام پوزیٹرون (POSITRONS) ہے۔ یہ اپنی پیدائش کے تھوڑی دیر بعد ہی کسی منفی برقیہ سے متصل ہو جاتا ہے اور ان دونوں کے اس ملاپ سے نور کے کوانٹم کا ایک جوڑا بن جاتا ہے۔

اس طرح ڈیراک کے بظاہر بے بنیاد نظریہ نے قیاسی دنیا سے نکل کر حقیقت کی وادی میں قدم رکھ دیا۔ تجربہ طبیعیات والوں نے اپنی آنکھوں سے مادہ کو پیدا اور فنا ہوتے دیکھ لیا تھا۔ چنانچہ اب یہ کہنا بھی نہ مناسب نہ ہوگا کہ وہ گوشہ جس میں ہم آباد ہیں منفی بار کے برقیوں سے بھرا ہوا ہے لیکن یہ ممکن ہے کہ اس کائنات کے دوسرے نامعلوم اور بعید ترین گوشوں میں مادہ ایسے جواہر پر مشتمل ہو جن کے مرکزے منفی برقائے ہوں اور جن کے گرد مثبت برقیے ناچ رہے ہوں لیکن اب تک منفی برقئے پروٹون کا مشاہدہ نہیں کیا گیا ہے اور ڈیراک کے نظریہ سے ان کا وجود لازمی ثابت نہیں ہوتا۔

ڈیراک کے نظریہ کا سب سے حیرت انگیز پہلو مادہ کی تخلیق اور فنا ہے تقریباً پچاس سال قبل نظریہ اضافیت پیش کرتے ہوئے آئن شٹائن نے یہ بتایا تھا۔ کہ مادہ اور توانائی مساوی ہیں اور اس طرح بقائے مادہ اور بقائے توانائی کے کلیوں کو متحد کر دینے کی ضرورت محسوس کی گئی تھی۔ مادہ اور توانائی کو غیر فانی تسلیم کرنے کے عوض آئن شٹائن نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ انہیں ایک دوسرے میں تبدیل کیا جا سکتا ہے اور کائنات میں صرف ان دو کی مجموعی مقدار مستقل رہتی ہے۔ مادہ اور توانائی کی اس تبدیلی کی صورت کیا ہوگی اور کیا ایسا کبھی ممکن ہوگا کہ مادہ فنا ہو کر توانائی کا روپ دھار لے یا توانائی خود فنا کر مادہ کو جنم دے، ان سوالوں کا جواب اس وقت نہ دیا جا سکا جب تک کہ مثبت و منفی برقیوں اور جوہری مرکزہ سے مت[illegible]

دوسری دریافتوں کے ذریعہ اس کی شہادت مل گئی۔

مادہ اور توانائی کی اس باہمی تبدیلی کو سمجھنے کا ایک دوسرا طریقہ یہ ہے کہ مادہ کو توانائی کی ایک مخصوص شکل تسلیم کر لیا جائے۔ ہم قبل ہی اس کا مشاہدہ کر چکے ہیں کہ توانائی کے ایک کوانٹم اور ایک عام بقیہ میں بہت کچھ مشابہت ہے۔ دونوں ہی کبھی موج اور کبھی ذرہ کے بھیس میں ظاہر ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ ہم دو برقیوں کے انفصال سے نور کی شعاع کے ظہور کو دو مادی موجوں کے ملاپ کا نتیجہ کہہ سکتے ہیں۔ اس تبدیلی کو یوں بیان کرنا بھی درست ہوگا کہ دو مادی ذروں کی ترکیب سے ضیا کا ایک جوڑا تخلیق پاتا ہے۔

بہرحال ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنے حواس خمسہ کی فریب کاریوں کا شکار ہو کر انسان اب تک اس طبیعی کائنات کی دل آویز سادگی کو نہیں سمجھ سکا ہے۔ طبیعی کائنات میں توانائی کبھی مادہ اور کبھی شعاعوں کا روپ بھر کر انسان سے آنکھ مچولی کھیل رہی ہے لیکن موجوں اور ذروں میں یگانگت پیدا کر کے اور مادہ و توانائی کو مساوی قرار دے کر طبیعیات دانوں نے مظاہر قدرت میں ایک رابطہ اور ہم آہنگی پیدا کرنے کا بہت ہی اہم اور ضروری قدم اٹھا

غزل

طاہرہ کاظمی

نہ غمخوار ہے ذوقِ بادہ پرستی، نہ یادِ کرم حاصلِ زندگی ہے
تلاشِ سکوں شورشِ قلبِ مضطر، نگاہوں کا غم حاصلِ زندگی ہے

ترے غم نے بخشی امیدوں کی دولت، نظر کی بلندی تخیل کی عظمت
نہ لوں جس کے بدلے زمانے کی راحت، وہ معراجِ غم حاصلِ زندگی ہے

سلامت رہیں تشنگیں آرزو کی مجھے اس تغافل کا شکوہ نہیں ہے
ہے وردِ وفا جس کے محور پہ قائم، وہ قول و قسم حاصلِ زندگی ہے

شبوں کے اندھیرے میں بھٹکی ہیں برسوں نگاہیں تری رہگزر پر رکی ہیں
جہاں پر جھکے چاند تاروں کی رفعت، وہ نقشِ قدم حاصلِ زندگی ہے

جفائے مسلسل کا شائق ہے یہ دل اب اس کے لیے آرزوئے کرم کیا
جو خاروں کی سوزش گلوں میں بدل دے، وہ مشقِ ستم حاصلِ زندگی ہے

کہیں تابشِ آرزو نور زا ہے، کہیں ہیں تصور میں جلوے فروزاں
یہ ہستی ہے جس سے چراغاں چراغاں، وہ دردِ الم حاصلِ زندگی ہے

(سید احسن)

قدیم ہندوستان میں تجارت

ہندوستان کے خارجی ممالک سے تجارتی تعلقات بہت قدیم زمانے سے چلے آ رہے ہیں جدید تحقیق نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وادیٔ سندھ کے رہنے والے تین ہزار سال قبل مسیح میں بیرونی ممالک سے تعلقات رکھتے تھے۔ توریت میں اہل ہند اور ... ... اہل شام کے درمیان تجارتی تعلقات کا حوالہ ملتا ہے۔ محکمہ آثار قدیمہ نے جو انکشافات کئے ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ آٹھویں صدی قبل مسیح میں ایک طرف ہندوستان سے اور دوسری طرف شام عرب فینقا اور مصر سے تجارتی لین دین ہوا کرتا تھا۔ چوتھی صدی قبل مسیح میں ان تعلقات کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی بحری سرگرمیوں میں کافی ترقی ہو گئی۔ اور موریہ راجاؤں نے جہاز رانی کی تنظیم کے لئے باقاعدہ محکمے قائم کئے۔

عہد قدیم میں سمندر پر ہندوستان کا اقتدار تھا اسی اقتدار کے باعث ہندوستانیوں نے ہندی مجمع الجزائر میں نوآبادیاں قائم کیں۔ اس کے فوراً بعد ہندوستان اور چین کے درمیان، سمندر کے ذریعہ اور خشکی کے ذریعہ مستقل آمد و رفت کا سلسلہ قائم ہو گیا۔ ۳۲۷ تا ۳۲۵ ق م سکندر اعظم کا حملہ ہوا، جس کے نتیجہ میں ہندوستان کا یونانی دنیا سے رابطہ پیدا ہوا۔ مصر و شام کے یونانی فرمانرواؤں نے موریہ دربار میں سفیر بھیجے، اور اس کے جواب میں اشوک نے پانچ یونانی سلطنتوں میں اپنے مبلغ بھیجے۔ سکندر کی موت کے بعد اس کی سلطنت میں طوائف الملوکی پھیل گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پارتھیا میں ایک اور سلطنت وجود میں آئی۔ مصر کے حکمراں بطلیموس فلاڈلفس (۲۸۵-۲۴۶ ق م) نے ان حالات سے فائدہ اٹھا کر بحر احمر کے ذریعہ مصری تجارت کو خوب فروغ دیا۔ بہت سے بندرگاہ بنوائے۔ تمام تجارتی راستے ان بندرگاہوں پر آ کر ملتے تھے، ان میں ایک بندرگاہ ہرمز تھا جو ہندوستان سے تجارت کا مرکز تھا۔ بطلیموس فلاڈلفس کے جلوسوں میں "ہندوستانی شکاری کتے ہندوستانی گائیں، اور ہندوستانی مصالحے اونٹوں پر لدے ہوئے نکلتے تھے"۔ مصر کی اس یونانی فرمانروا کے شاہی جہاز میں ایک بڑا کمرہ تھا جس میں ہندوستانی ہیرے جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ مصر کے بطلیموسی بادشاہوں نے، اور اس کے بعد رومن شہنشاہوں نے ہندوستان کے ساتھ براہ راست تجارت کو کافی فروغ دیا۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے، کہ عیسوی سن کے شروع ہونے سے بہت پہلے ہندستان اور مغربی ممالک کے درمیان ساحل افریقہ تک بڑی کثرت کے ساتھ بحری تجارت کا سلسلہ جاری تھا۔ سکندریہ اس زمانہ میں بھی عظیم تجارتی مرکز کی حیثیت رکھتا تھا۔

غیر ملکی تجارت کو فروغ دینے کے لئے۔ ہندوستانی راجاؤں نے اشیاء درآمد پر ہر قسم کا محصول معاف کر رکھا تھا۔ جہازرانی کے افسر اعلیٰ (ناواَدھیکش) کو ہدایت تھی۔ کہ وہ بندرگاہ پر آنے والے تمام ان جہازوں کے ساتھ جو راستہ میں کچھ نقصان اٹھائیں۔ یا جن کا مال راستہ میں پانی کے اثر سے کچھ خراب ہو جائے، مربیانہ شفقت سے پیش آئیں اور ان سے مہربانی اور ہمدردی کا سلوک کریں۔

عیسوی سن کے شروع ہونے سے کئی صدی پہلے شمالی اور جنوبی ہندوستان سے ہندی چین تک تاجروں اور سوداگروں کی آمدورفت کا سلسلہ جاری تھا۔ اور انھوں نے وہاں تجارتی مرکز اور نو آبادیاں قائم کر رکھی تھیں[1]۔ اس زمانے میں ہندستان کی سیاہ مرچ اور خوشبودار چیزوں کی چین میں بڑی مانگ تھی جس کے عوض وہاں سے ریشم اور شکر یہاں لائی جاتی تھی چین کا ریشمی سامان تبت کے پلیٹو کو پار کر کے ساساؤ سکم کے ذریعہ دریائے گنگا تک لایا جاتا تھا۔ جہاں سے کشتی کے ذریعہ تامرلپتی پہونچایا جاتا تھا جو اس وقت بنگال کا مشہور ترین بندرگاہ ہے۔ یہاں سے خشکی کے ذریعہ جہازوں میں بھر کر سمندر کے راستے سے سامان مشرقی ساحل کے بندرگاہوں تک پہنچایا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ چین کا ریشمی سامان ہندی چین کے ذریعہ بھی جنوبی ہندوستان میں پہنچتا تھا۔ اسی طرح ہندوستانی کشتیوں کے ذریعہ مغرب کو بھی سامان بھیجا جاتا تھا۔ ہندوستانی جہاز یہ تمام سامان بحر احمر کے ساحلی بندرگاہوں تک پہونچاتے، وہاں سے خشکی کے راستہ سے دریائے نیل تک لے جایا جاتا اور وہاں سے دو خشکی کے راستے دریائے نیل تک لے جایا جاتا۔ اور وہاں سے اسے سکندریہ تک پہنچایا جاتا

جب آگسٹس نے ۳۰ ق م میں مصر کو فتح کیا۔ تو اس نے ہندوستان سے براہ راست تجارت جاری رکھنے کی کوشش کی مگر اس میں اسے بہت محدود کامیابی ہوئی۔ وہ عرب و افریقہ کے قبایل پر قابو نہ پا سکا جو تجارتی حد فاصل کی حیثیت رکھتے تھے۔ پھر بھی تجارت کو کافی فروغ ہوا۔ اور ۲۵ ق م میں ۱۲۰ جہاز تک موجودہ موصل سے ہندوستان آتے تھے۔ ان تجارتی تعلقات کا یہ نتیجہ ہوا کہ ہندوستان نے روم کے شہنشاہ آگسٹس کے دربار میں ۲۵ ق م اور ۲۰ ق م میں سفارتیں بھیجیں۔ ایک سفارت شمالی ہند سے بھیجی گئی جو اپنے ساتھ یونانی زبان میں ایک مراسلہ کے علاوہ تحفے تحائف لے گئی تھی۔ ان تحائف میں ہندوستانی سانپ ایک بہت بڑا پرند اور چیتے شامل تھے۔ ایک دوسری سفارت میں شرامن آچاریہ نامی ایک فلسفی شامل تھا جس نے ایتھنس میں اپنے کو نذر آتش کر دیا تھا۔ اس کی سمادھی پر یہ عبارت کندہ کی گئی۔ یہاں زرمنوچگس[2] برگوزہ کا ایک ہندستانی آرام کر رہا ہے جس نے اپنے ملک کے مطابق اپنے نام کو دوام بخشا، جنوبی ہند کے چیرا، پانڈیہ اور چولا راجاؤں نے بھی بیرونی ممالک کو سفارتیں بھیجیں

ہندوستان سے افریقہ تک کا بحری سفر اس زمانہ میں ایک نہایت پر خطر مہم کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس لئے جہازراں اپنے جہازوں کو ساحل سے ملا کر چلنے میں اپنی عافیت سمجھتے تھے۔ لیکن ۴۵ء میں ایک یونانی ملاح ہپلس[3] کی اس دریافت کے بعد کہ مانسون ہوائیں بحر ہند میں برابر چلتی رہتی ہیں جہاز بحر ہند کو پار کر کے افریقہ تک سیدھے پہونچنے لگے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ہند

---

[1] جرنل آف رائل ایشیاٹک سوسائٹی ۱۹۱۷ء صفحہ ۲۳۷ تا ۲۴۱

[2] معلوم ہوتا ہے یونانیوں نے شرامن اچاریہ کو بگاڑ کر زرمنوچگس کہا۔ یہ ایک جین گرو تھے اور انکی خودکشی "سلیکھنا" کا ایک طریقہ تھی جو انسان تمام خواہشات دنیا کو ترک کرنے کے بعد اختیار کرتا ہے

[3] Hippalus

روم کی تجارت کو حیرت انگیز ترقی ہوئی۔

ایک عظیم کتاب جس کا نام "رہنمائے بحر ہند" ہے[١] ۶۰ء
میں تصنیف ہوئی۔ اس کا مصنف ایک مصری یونانی سوداگر
تھا۔ یہ مشرق اور مغرب کی منظم تجارت کی پہلی دستاویز ہے
اس میں ہندوستان اور روم کے درمیان تجارت کا تفصیل
سے ذکر کیا گیا ہے۔ اسی کتاب سے ہم کو معلوم ہوتا ہے
کہ سوراشٹر کے ساحل سے گیہوں، لوہا، بلور، سوتی کپڑا، دامرا
(کنول)، چاول، گھی، تل کا تیل اور کمر بند، سالی لینڈ کو
بھیجے جاتے تھے۔ اور وہاں سے ان کے بدلے میں ہاتھی
دانت، کچھوے کی پشت اور لوبان وغیرہ ہندوستان
آتے تھے۔ سوراشٹر کا خاص بندرگاہ بار وکچھ تھا۔ اس
کی اشیاء برآمد میں سوتی کپڑا، یشب (سنگ سلیمانی)
دلیسی تن زیب، سن کا کپڑا، جٹا ماسی (سنبل الطیب) ادرک
باؤبڑنگ (ویلم) اور چینی ریشم تھا۔ اشیاء درآمد میں شراب
تانبا، ٹین، سیسہ، مونگا، عقیق، گھٹیا کپڑا، رنگین کمربند
عنبر، تیتھی دوب (تیتیا)، بلور، سنکھیا۔ (رایج الفار) جستی
سونے اور چاندی کے سکے اور مرہم شامل تھے۔

عرب کے بندرگاہوں کو ہندوستان سے رنگ
برنگا کپڑا، زعفران، تن زیب، چاول، گیہوں اور تل کا
تیل جاتا تھا۔ اور تبادلے میں وہاں سے عود، عنبر، لوبان اور
کچھوے کی پشت ہندوستان لائی جاتی ہے خلیج فارس کے
بندرگاہوں سے یہاں سفید موتی، کھجوریں، مختلف قسم کی
شرابیں، سونا، اور خواصیں جنہیں باندیاں کہتے تھے۔ لائی جاتی تھی
جو ہندوستان کے شاہی خاندانوں میں ملازمت کرتی تھیں

اس کے عوض ہندوستان سے وہاں تانبا، صندل
ساگون اور آبنوس کی لکڑی بھیجی جاتی تھی۔ اسی طرح
سندھ کے بندرگاہوں کی اشیاء برآمد ادرک، ویلم (باؤبڑنگ)
بالچھڑ، فیروزہ، اونی کھالیں، چینی اور تبتی اون، سوتی کپڑا
ریشمی دھاگا۔ اور نیل وغیرہ تھیں۔ اشیاء درآمد کپڑا، عقیق،
مرجان، عنبر، لوبان، شیشہ کے برتن اور چاندی سونے کی
طشتریاں تھیں۔ ان میں سے بعض جنوبی ہند سے آئی ہوئی
ہوئی تھیں۔

آندھرا کے خاص بندرگاہ سپارا اور کلیان تھے آندھرا
کے بعد تامل گام کا نمبر تھا جس سے پریپلس کا مطلب چیرا
دیس سے ہے۔ اس کے بندرگاہوں کی خاص خاص اشیاء
برآمد تھیں موتی، ہاتھی دانت، چین کا ریشمی کپڑا، جٹا ماسی، ہیرے
نیلم اور دوسرے شفاف پتھر، اور ملکا کا کچھوا۔ اشیاء درآمد
تھیں سکے، عقیق، سن کا چھپا ہوا کپڑا، سرمہ، مونگا، کچا شیشہ
تانبا، ٹین، سیسہ، سنکھیا، ہڑتال۔ پانڈیہ دیس کا بندرگاہ کوبھی
(کورکئی) تھا جسے "موتیوں کی کان" کہا جاتا تھا جو لا بنگال
میں بیشتر مصری مصنوعات آتی تھی۔ پریپلس میں مشرقی ساحل
کی تجارت کا حال بہت مختصر ہے البتہ خشکی کے راستہ سے
کانی چیزوں کی آمد و رفت کا حال اس میں مندرج ہے
مثلاً بندر، چیتے، بھینس، ہاتھی، طوطے، مینا، تیتر اور مور
غرض یہ کہ عیسوی سن کی پہلی صدی میں روم کے ساتھ
ہندوستانی تجارت نے اس قدر ترقی کر لی تھی کہ ۲۲ء
میں ٹائبیریس[٢] نے روم کی مجلس مشاورت سے شکایت
کی کہ بیش قیمت ہندوستانی جواہرات کے باعث روم

---

[١] "Guide to the Indian Ocean" یا The periplus of Erythraean sea"
[٢] Tiberius

عورتوں میں عود نمائی کی ہوس خطرناک حد تک بڑھ گئی ہے نیرو (۵۴ء تا ۶۸ء) نے زمرد کا پیالہ دس لاکھ سسٹرس کے عوض خریدا جس کے بارے میں رومیوں نے کہا "یہ ہندوستان کی قیمت کا تھا" نیرو کے مرنے کے بعد اس تجارت میں قدرے کمی آگئی لیکن بہت جلد وہ پھر زور پکڑ گئی۔ ۷۷ء میں پلائنی نے لکھا کہ "ہندوستان روم کو ہر سال دس لاکھ سسٹرسی کنگال دیتا ہے یہاں تک کہ روم میں سکہ کا قحط پڑ گیا ہے اور بادشاہ کو اس سے کم قیمت کا سکہ جاری کرنا پڑا ہے۔"

ڈیون کرائسوسٹم[a] اپنے ایک خطبہ میں کہتا ہے کہ "ہندوستانیوں کی ایک بڑی نو آبادی [illegible]ء میں محض تجارت کے نقطۂ نظر سے سکندریہ میں مستقل طور پر قائم ہو گئی تھی"۔ روم کے کمانے ساحل مالابار پر موسیری میں رہتے ہیں۔ مدورائی میں انہوں نے اپنے بادشاہ آگسٹس کی یاد میں ایک مندر تعمیر کرایا تھا یہاں تانبے کے سکے جو رومی لوگ اپنے استعمال میں لاتے ہوں گے، بکثرت تعداد میں دستیاب ہوئے ہیں۔ اس قسم کے سکے چولا شہروں میں بھی برآمد ہوئے ہیں۔ روم کے سپاہی فوجی انجینئر اور بڑھئی، تامل راجاؤں کے ہاں ملازم تھے یہ بات تامل ادب کی کلاسکی کتابوں سے ثابت ہوتی ہے۔ ان رومیوں کو "یاونا" کہتے تھے۔ ان میں رومی اور یونانی دونوں قوموں کے لوگ شامل تھے۔

ہندوستان کی روم سے تجارت کا سلسلہ ۲۲۰ء تک جاری رہا لیکن یہ واضح رہنا چاہئے کہ یہ تمام تجارت شروع سے آخر تک روم کے مقابلہ میں ہمیشہ ہندوستان کے لئے زیادہ منفعت بخش ثابت ہوئی۔ سوائے مرجان، شراب سیسہ اور ٹین کے ہندوستان کو خارجی ممالک سے کسی چیز کے لینے کی ضرورت نہ تھی۔ برخلاف اس کی مغربی ممالک میں ہندوستانی سامان عیش وعشرت کی کافی مانگ رہی۔

فاہیان جو پانچویں صدی کے اوائل (۳۹۹ء تا ۴۱۴ء) میں ہندوستان آیا۔ بنگال کے قدیم مشہور بندرگاہ تامرلپتی سے ہندوستان کے ایک تجارتی جہاز میں سوار ہو کر لنکا ہوتا ہوا جاوا پہونچا تھا۔ اور وہاں سے چین چلا گیا تھا۔ اس نے بھی لنکا، چین اور ہندوستان کے درمیان تجارت کی تصدیق کی ہے۔ اس نے چولا بندرگاہ کاویری پٹنم۔ اور پلاوہ بندرگاہ مامل پورم، اور کرشنا، گوداوری، اور کلنگ کے بندرگاہوں سے تجارتی جہازوں کی چین، انام، سیام، برما، اور ملکا تک آمدورفت کا ذکر کیا ہے۔

ہندوستان کی بیرونی ممالک سے تجارت کا حال سکندہ کے کوربین نامی ایک ہندوستانی جہازراں[b] کے سفرنامہ میں ملتا ہے جو اگرچہ بہت مختصر ہے مگر بہت دلچسپ اور کارآمد ہے اپنی کتاب "ٹاپ اوگ یبافیہ کرسٹیانہ" میں جو ۵۴۷ء میں لکھی گئی، اس نے ہندوستان اور لنکا سے تجارت کے متعلق بہت سی کارآمد باتیں بیان کی ہیں۔ اس نے ہند کے مختلف قسم کے جانوروں کا ذکر کیا ہے۔ جو بہت دلچسپ ہے۔ لنکا کے بارے میں وہ کہتا ہے "یہ جزیرہ تجارت کا مرکز ہے۔ یہاں ہندوستان، عرب اور اتھوپیا سے جہاز سامان لے کر آتے جاتے ہیں۔ اس سے زیادہ دور کے ملکوں سے بھی اس میں ریشمی کپڑے، عود و اگر، لونگ، اور صندل وغیرہ آتے ہیں۔ یہ اشیاء یہاں سے مالابار، کلیان اور سندھ جاتی ہیں۔ مالابار میں سیاہ مرچ کثرت سے ہوتی ہے

Sesterces رومی سکہ [a] ۔۔۔ء میں پیدا ہوا اور ۔۔۔ء میں پیدا ہوا اور ۔۔۔ء میں انتقال کیا اس کی کتاب ۔۔۔ء میں شائع ہوئی [b]
Dion Chrysostom ۔۔۔ء پیدا ہوا اور ۔۔۔ء میں انتقال کیا۔ اس کے تقریباً ۸۰ خطبے [illegible]

جو باہر کو بھیجی جاتی ہیں کلیان سے تیل اور لکڑی کا شہتیر اور دیگر اشیاء اور سندھ سے مشک اور جٹاماسی باہر کو بھیجی جاتی ہیں کوزمس نے اس کے بعد ہندوستان کے مشرقی اور مغربی ساحل کے بندرگاہوں کے نام گنائے ہیں۔ ٹکلے کے راجہ کے بارے لکھا ہے "تامل علاقے سے وہ گھوڑے منگاتا ہے اور لوگوں کو خاص مراعات دیتا ہے جو گھوڑوں کی تجارت کرتے ہیں"۔ اس نے افریقہ سے ہاتھی دانت کے ہندوستان آنے کا بھی ذکر کیا ہے۔

اسی طرح ہیون سانگ نے جو ۶۲۹ء میں ہندوستان آیا، ہندوستان کی خارجی و داخلی تجارت کا ذکر کیا ہے وہ لکھتا ہے "سونا چاندی، دیسی تانبا، سنگ سفید اور موتی اس ملک کی قدرتی پیداوار ہیں۔ اس کے علاوہ نایاب ہیرے، جواہرات اور مختلف قسم کے قیمتی پتھروں کی، جو ساحلی جزیروں میں جمع کئے جاتے ہیں؛ یہاں بہتات ہے ان چیزوں کا یہ لوگ دوسرے سامان سے تبادلہ کر لیتے ہیں۔ اور یہ لوگ ہمیشہ تبادلے سے خرید فروخت کرتے ہیں"۔ ہیون سانگ اس کے بعد کہتا ہے "کپیشا میں ہر خطہ کا سامان تجارت پایا جاتا ہے جو فارس اور اس سے آگے کے ملکوں سے تجارت کا مرکز ہے"۔ اڑیسہ کے بارے میں وہ کہتا ہے "یہاں سے سوداگر دور دراز ملکوں کو روانہ ہوتے ہیں۔ اور غیر ملکی لوگ راستہ میں یہیں قیام کرتے ہیں ہر قسم کا یہاں نایاب اور بیش قیمت سامان جاتا ہے" وہ بھی کے متعلق کہتا ہے "یہاں تقریباً سو گھرانے کروڑپتی ہیں دور دراز ملکوں کی نایاب اور بیش قیمت چیزیں یہاں آسانی سے مل جاتی ہیں"۔

نویں صدی عیسوی سے تجارت کی باگ ڈور مغربی دنیا سے نکل کر کلیتاً عربوں کے ہاتھ میں آ گئی ہندوستان جو کتبے دریافت ہوئے ہیں۔ ان سے مختلف تاجروں اور ان کی تجارتی سرگرمیوں کا پتہ چلتا ہے۔ ویسالی کے قدیم شہر میں جو مہریں برآمد ہوئی ہیں۔ ان میں بہت سے تاجروں، ساہوکاروں اور سوداگروں، اور مختلف بیوپار منڈلوں کے نام مندرج ہیں۔ ڈاکٹر بلاک جنہیں یہ مہریں دستیاب ہوئیں اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ "اس وقت شمالی ہند میں ایک بڑے تجارتی مرکز، غالباً پاٹلی پتر میں آجکل کے اوپر منڈل جیسی کوئی چیز موجود تھی"۔ جنوبی ہند کے بیوپاری بھی اسی قسم کی جماعتوں میں منسلک تھے۔ ہم "۵۰۰ بیوپاریوں کی جماعت" اور "۹ ضلعوں کے ۱۸ پرگنوں کے بیوپار منڈل" کا اکثر ذکر سنتے ہیں۔ ایک کتبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ بڑے بہادر ہوتے ہیں۔ دنیا بھر میں گھومتے پھرتے ہیں۔ اور مختلف قسم کی چیزوں مثلاً گھوڑے، ہاتھی، قیمتی پتھر، عطریات اور دوائیوں کی خواہ تھوک سے، یا پھٹکر سے، تجارت کرتے ہیں"۔ ان میں سے بعض منڈلوں کو سرکار کی طرف سے رعایتیں اور سیاسی حقوق حاصل ہوتے تھے۔

قدیم ہندوستان میں خارجی ممالک سے تجارت کا یہ عظیم الشان سلسلہ اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ ملک کے اندر بھی تجارتی سرگرمیاں کچھ کم نہ تھیں اور یہ دور میں شمالی اور جنوبی ہندوستان کے درمیان تجارت بڑے پیمانے پر پہونچ گئی تھی۔ ارتھ شاستر میں لکھا ہے کہ کوڑیاں، موتی، ہیرے، نیلم، سونے کی اشیاء، کمبل اور سوتی کپڑا جنوبی ہند سے شمالی ہند کو آتا تھا جس کے عوض یہاں سے گھوڑے، خوشبودار چیزیں اور دوائیاں وغیرہ ادھر بھیجی جاتی تھیں تجارت کا یہ سامان تو تو بیل گاڑیوں میں لاد کر کا بعد ان کی صورت میں لے جایا جاتا تھا ہم اکثر رہنما کارپلیس کا ذکر کرتے

صفحہ ۲۴۴

دے بھر کے کوئی جام "مئے شعلہ فشاں اور" — ہاں پیرِ مغاں اور، مرے پیرِ مغاں اور

اے بلبلو! کرنی ہے تمہیں آہ و فغاں اور — "پھولوں کو چمن کے، ابھی روندیگی خزاں اور"

وہ وار کئے جائیں یہی لطفِ ستم ہے! — میں شوقِ شہادت میں کہے جاؤں کہ ہاں اور

محفل میں مجھے نیچی نگاہوں سے نہ دیکھو! — "دیکھو کہیں لوگوں کو نہ ہو جائے گماں اور"

کعبہ ہو کہ دَر تیرا قیامت ہو کہ محشر — "مسجد کے نشاں اور ہیں ٹھوکر کے نشاں اور"

میں اُن کے لئے اور وہ عدو کیلئے تڑپیں! — عشق ایک مگر حال یہاں اور وہاں اور

اے مہر کہاں ذوق سخنور، کہاں غالب

دلّی کی زباں اور ہے فارس کی زباں اور

کاتب راحت علی
رامپوری
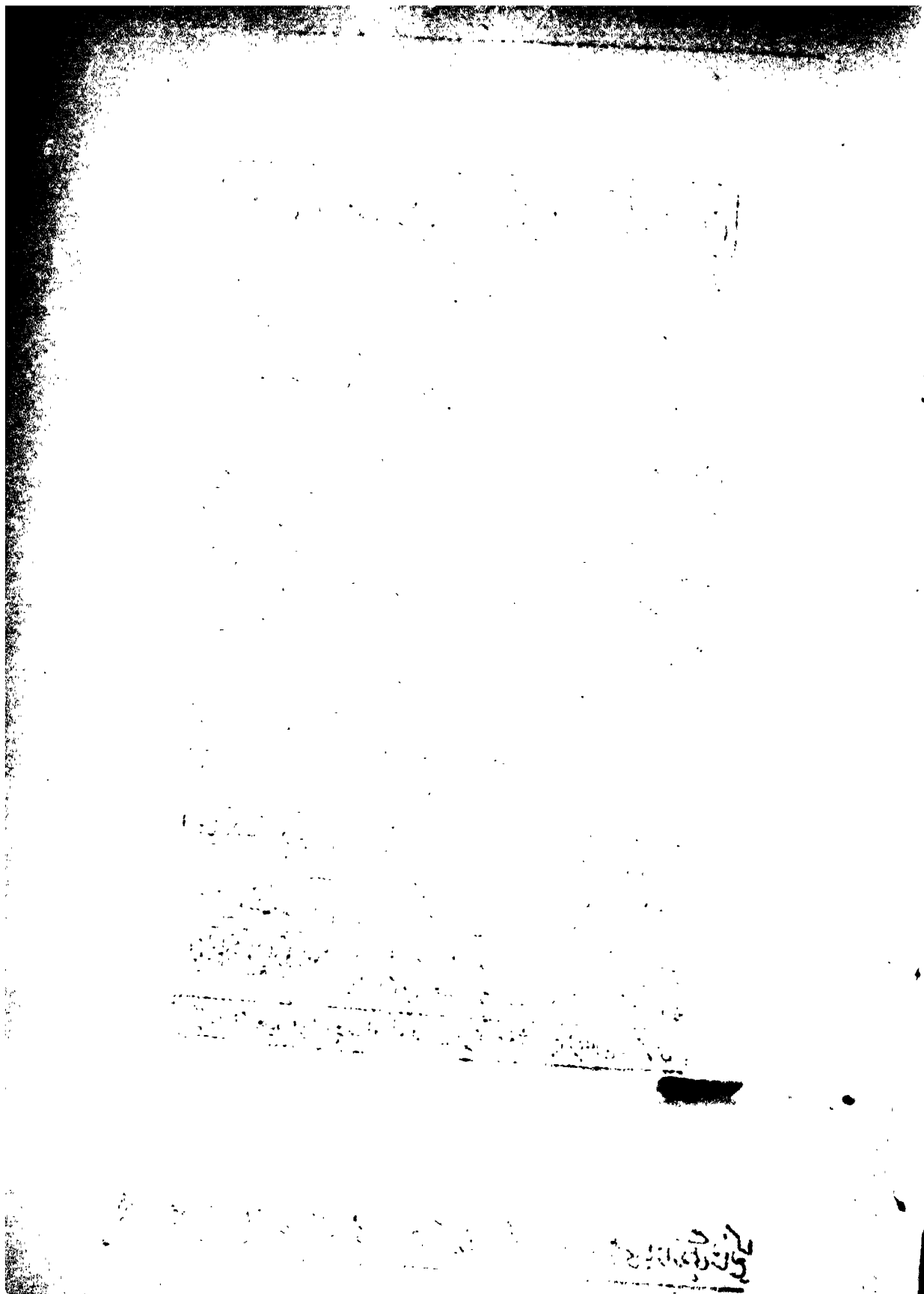
سید عظمت علی پرنٹر پبلشر نے الہ آباد پریس سے چھپا کر دفتر آہنگ ۳۱۰ چاوڑی بازار دہلی سے شائع کیا

AHANG DELHI

آہنگ

فارسی اُردو کا علمی ادبی ماہنامہ

دہلی

بادۂ امن

از عظمت علی

برای دیدِ جمالت، بدیدہ می آیم
بعزمِ شوقِ وصالت، دویدہ می آیم

اگر ببادۂ رنگینِ امن جرعہ دہی؟
زتلخیٔ غمِ دوران، رمیدہ می آیم

شرابِ تلخ زجامِ لبت اگر بخشی؟
بگردِ شمعِ جمالت، پریدہ می آیم

گہی بگوشۂ چشمت، اجازہ یابم!
بفرطِ شوق، گریبان دریدہ می آیم

ثبات و بندگیم گر قبولِ تو افتد
سرِ نیاز بپایت خمیدہ می آیم

بیک اشارۂ ابروِ مہرپرورِ تو
ہزار پردۂ ظلمت دریدہ می آیم

خمارِ چشمِ محبت، اگر اجازہ دہد!
بہ پیشِ عظمتِ حُسنت، بدیدہ می آیم

آہنگ
دہلی

مدیر مسؤل
سید عظمت علی رضوی

نگران:-
ڈاکٹر سید امیر حسن عابدی ایم اے پی ایچ ڈی -
" پروفیسر دلی یونیورسٹی دلی "

خیام الہند پروفیسر واقف
" لکچرر پنجاب یونیورسٹی دلی "

سالانہ چار روپے فی کاپی چھ آنے	مضامین این شمارہ	شمارہ ۵ مارچ ۱۹۶۰ء

شمارہ نمبر ۹ سنہ ۱۹۶۰ء

بہ گرامی جناب آقای دکتر علی اصغر حکمت وزیر خارجہ و سفیر کبیر سابق دولت شاہنشاہی ایران در دہلی

و اُستاد دانشگاہ تہران،

و وزیر سابق فرہنگ ایران۔

وزارت امور خارجہ

تاریخ ۲۔۱۰۔۱۳۳۷

آقای سید عظمت علی رضوی مدیر محترم مجلہ آہنگ

مرقومۂ گرامی کہ حاکی از مراتب وداد و محبت بود واصل گردید موجب خوشوقتی است کہ مجلۂ شریفہ آہنگ، درخطہ مینو نشان ہند بنشر معارف و ادبیات فارسی پرداختہ آثار شعرا و نویسندگان بزرگ ایند وزبان را منتشر میکند و مشعل فروزان ادب را در شہر تاریخی دہلی ہمچنان روشن نگاہمیدارد۔ بطوریکہ پیشنہاد فرمودہ اند اینجانب باکمال مسرت آمادہ ہمکاری با نویسندگان آن نامہ گرامیست و ازاینکہ بعض آثار و مقالات نویسندہ این سطور را در شمارہ ہای گذشتہ بطبع رساندہ اند مسرور و ممنون میباشد۔ مزید توفیقات جنابعالی و فاضل محترم آقای دکتر امیرحسن عابدی و سایر کارکنان و نویسندگان محترم مجلۂ شریفۂ آہنگ را از خداوند متعال مسئالت دارد۔

وزیر امور خارجہ

ع اصغر حکمت

از سید امیر حسن عابدی — دنبالهٔ شمارهٔ پیش

ملا طغرا

(۲)

ملا طغرا در نظم و نثر هر دو مهارت داشت :-

"دیوان این دیوانهٔ شاهد غیبی دفتریست از اسرار حقایق
بی - کوتاه بینان را دیدن قصیدهٔ بلندنگاه داشته و هوسناکان
شنیدن قطعه بفکر تعلق انداخته - مثنوی ناصحانه دل بستهٔ هنگامهٔ
رت - رباعی عارفانه مربع نشین چار بالش وحدت . . . . .
بوصهٔ نثر این زمزمه پرداز نزهتکده ایست عندلیب نواز"(۱)

و در شاعری بر خود فخر کرده :-

بیست طغرا در سخن شاگرد کس — گرچه صد شاگرد را استاد کرد
طغرا منم شاه سخن بر تخت جایگاه سخن — معنی ز درگاه سخن با من بگفتا آمده
چو لوح مزارم ز دیوان شود — زیارتگه هر سخندان شود
شعر طغرا پسند می گویم — نیست حاجت به انتخاب مرا
هم طغرا عندلیب نغمه ساز هند کیست — طوطی از بهر چه یاد بلبل آمل کند
بسر گل که بخوان در چمن بزم سخن — غزلی چند ز طغرا به نظیری برسان
اگر تتبع یک بیت این غزل کردی — به از هزار کمال خجند خواهی شد

و شکایت میکند که دیگران از آثار طبع وی استفاده می کنند :-

بهر کار ضایع بود رنج من — برد دیگری نفع از گنج من
چو مضمون بکری بمن رونمود — خورم غصه کین را که خواهد ربود

مؤلفین خلاصة الکلام و مجمع النفائس و باغ معانی دیوان و
کلیات طغرا را ده هزار بیت گفته اند و مؤلف صحف ابراهیم
کلیات را علاوه بر ساقی نامه قریب به ده هزار نوشته است -
اما اینجانب کلیات وی را به ترتیب ذیل بشمار آورده ام :

۱ - مثنوی ساقی نامه			شامل ۹۱۴۴	بیت
۲ - قصاید	۱۶۱	عدد	شامل ۴۴۵۲	بیت
۳ - غزلیات	۱۲۹۳	"	شامل ۱۱۴۷۴	بیت
۴ - قطعات	۱۳	"	شامل ۲۲۴	بیت
۵ - فردیات			شامل ۱۱۶	بیت
۶ - ترجیع بند	۷	"	شامل ۱۵۰۹	بیت
۷ - ترکیب بند	۴	"	شامل ۳۴۷	بیت
۸ - مخمس	۱	"	شامل ۱۱۷	بیت
۹ - مثنوی در مناجات	۱	"	شامل ۱۱۸	بیت

باین ترتیب تمام اشعار کلیم به ۲۷۴۸۴ بیت و ۱۱۷ بند بالغ میشود -

مثنوی ساقی نامه در پیروی ساقی نامهٔ ظهوری سروده شده و با مدح شاه عباس بپایان میرسد :-

خدیو جهان شاه عباس نام — که هندوی چرخش بود یک غلام

با وجود یکه مثنوی مزبور در هند تالیف شده است زیاد در آن شاعر آرزوی رفتن بایران و عتبات حرمین ابراز می نماید -
ساقی نامه مزبور دارای غزلهای گوناگون هم می باشد - از جمله

(۱) رسائل طغرا ص ۳۳ - ۳۴ - نولکشور پریس

مضامین مثنوی که در این ساقی نامه گنجانیده شده است انتقاد شدید جامعه بالخصوص از واعظ و مفتی و صدر و ملا میباشد :

زترو امنیهای آن (واعظ) بیوقار　　شده منبر وا علی آبشار
بنام فرو ماندگان حلب　　کند بهر خود در صفاهان طلب
اگر گنبد مسجد افتد ز پا　　بعمامهٔ خود کند اکتفا
چو قاضی در آید بدار القضا　　بود کار بیچارگان با خدا
نشیند چو بر مسند گیر و دار　　دو چشمش بود از پی رشوه چار
ز فتوای او بر سر هر گذر　　بود خون چندین مسلمان هدر
ز کثرت الجهالت لعنت دان شده (مفتی)　　غلط فهم آیات قرآن شده
اگر زن طلاقی نشیند برش　　بفرمایش عقد سازد کرش
که بیرون کند صدر را زین دیار　　که از لشکر جهل شد فوج دار
وظیفه ز هر کس بود مال اوست　　مظالم چو سایه بدنبال اوست
بملای جاهل متوهم و شاق　　که باشد نهان در کتابش نفاق

و همچنین در این مثنوی شاعر طرحهای گوناگون خم را بیان کرده است :

خم کیقبادی بود حلقه دار　　. . . . .
خمی کز فلاطون بر آورده نام　　سر او فراخ است مانند جام
خمی ما که خیام کرد اختراع　　افق پایه است و فلک ارتفاع
بود خم چو قسمی ز خم یک خود　　توانش بنزم بزرگانه برد

قصائد طغرا بیشتر در مدح حضرت علی و ائمه معصومین میباشد. از میان این قصیدها دو قصیده که با مطلعهای ذیل شروع میشود (کشف الرموز) و (عرض الحقایق) نامیده شده است :

شاهی که نداند بجهان نام کرم را　　عادل نبود تا نبود داد کرم را
ندیده ام ز تو بی خنده چین پیشانی　　درین صفت بگل نو شکفته میمانی

قصاید دیگر در مدح دولتشاه گجراتی. مهاراجه جسونت سنگ شاهزاده مرادبخش. شاه عبد الله وغیره سروده شده است.

در مدح شاه عبد الله می گوید :

شاه عبد الله بن عارف که چون عباس شاه
مردم ایران زمین را هد حقیقت رهبرا

طغرا بیشتر از محیط دربار دور مانده و نمی خواست که [زندگی] درباری بسر برد :

کرد خشم آن بت مغرور بطغرا پندی　　که مخوان پیش من از شعر ندیما

در غزل طغرا مقام خاصی ندارد :

طرح غزلسرائی رنگ دگر بر آورد　　طغرا عبث بپیچید چون جلد[ا]

اما گاه گاهی ابیات خوب سروده است چنانچه در ذیل میشود :

دوش دیدم آتشین رخساری　　شوخکی در دلبری طرار
سبزکی لعلش بسرخی رنگ بست　　همچو طوطی شکرین گفتا[ر]
جامکی در دست و مینا در بغل　　مستکی در کار خود هشیا[ر]
رو کیش گل گل شکفته از شراب　　صد بهارستان شده گلزا[ر]
خالکی افتاده هر سو بر رخش　　با کمال سادگی پرکا[ر]
جامکی[۱] پوشیده نازک غنچه وش　　شبنم آسا بر سرش دستا[ر]
زلفکش بی منت باد صبا　　پیچکی میزد بر نگ ما[ر]
زان نهالک خواستم گلچین شوم　　زد بدستم خوی تندش خا[ر]
بیتکی میخواند از خود هر نفس　　این چنین میخواست طغرا یا[ر]

یار سرگرم حیا من ادب آموز نگاه　　چشم تا کار کند شرم و حجاب آ[ید]
از عکس لب لعلت پیمانه شود پیدا　　وز سایهٔ مژگانت میخانه شود
مرد خدا نمی شود گرچه زن از کنار خود　　بر در مسجد افکند طفل حرامزاد[ه]

هر گل این بوستان روی نگاری بوده است
هر پریشان سنبل او زلف یاری بوده است
همچو شبنم در سرابستان قدم از دیده ساز
پا منه بر سبزه کابروی نگاری بوده است

---

(۱) ن ل : رختکی

ی ترک ره شوق جای ماست　　نقش قدم جنازهٔ آرام پای ماست

ده برخت پاسبان شود　　گلچین باین چمن چه رسد باغبان شود

ـار ذیل از انتخاب خانصاحب آرزو است :

همه صرف گلرخان شد　　من پیر شدم هوس جوان شد

و قامتت چمن سرو و سمن چه میکنید　　فاخته ای کرشمه ات راه سخن چه میکنید

ن گشود لب گوش نکرد هیچکس　　نیست چو همزبان کسی غنچه دهن چه میکنید

زا خضر شد همراه ترسم　　که سرگردان کند در نصف راه

ـزل ذیل تماما با ردیفی که دارای لغات فارسی و هندی میباشد

ده شده است :

ز بعلک کباب شد زود بیا جگی جگی　　آتش باده آب شد زود بیا جگی جگی

ز لبی تر از فغان بهر طلب نمودنت　　همنفس رباب شد زود بیا جگی جگی

تر ز بهر طرف کرد نگه ترا ندید　　از پی اضطراب شد زود بیا جگی جگی

تو نمی کشی قدح آب نمی رسد بگل　　باغ طرب خراب شد زود بیا جگی جگی

ز شب قصد لعت ندی ندید بزم ما　　دشمن ماهتاب شد زود بیا جگی جگی

شیشه ز دوری لبت زمزمه فسانه زد　　چشم قدح بخواب شد زود بیا جگی جگی

دیر مکن در آمدن کز گل نارسیده نت　　تازگی از گلاب شد زود بیا جگی جگی

شیفته ای کرشمه ات زد به پیاله دست رد　　بیمزه شراب شد زود بیا جگی جگی

یکی از مختصات طغرا در غزل این است که بعض غزلهای وی

با مطلع شروع و با مطلع تمام می شود :

طغرا در آخر غزل آورد مطلعی　　کاین گوشواره طرز سخندانی من است

در یک غزل دو مطلع هرگز کسی نگفته　　من اختراع کردم اینک برای شبیر

قطعات طغرا در مدح قطب شاه، نصرت خان، شاه شجاع،

مرادبخش، محمد امین، شاه فضل، عصمت الله ولی و عالمگیر میباشد

یک ترکیب بند او در مرثیه سید محمد است و در یکی از ترجیع بندها

هر بند با شعر ذیل تمام می شود :

مرا زین دیار سراپا خزینه　　نه لبنا نه دینا نه کانا نه پینا

یکی از بزرگترین و نمایانترین مختصات طغرا آزادی وی است

بالخصوص در گنجانیدن عناصر هندی نسبت بشعرای دیگر ایرانی

او هرچه بیشتر از عناصر هندی استفاده می کند و اشعار وی نماینده

محیط می باشد و این از خصوصیاتی است که او را از نویسندگان

و شعرای دیگر جدا می کند چنانکه از انتخابات ذیل پیدا می شود :

از مسلمانی برآورد آن بت هندو مرا　　داد زم از دیده ملت رام رام ما مرا

کی بجسن جوگیان هند خواهد جلوه کرد　　گر فلک صد بار خاکستر کند دنیا است

لاله جنبش میدهد در هر طرف ناقوس را　　ترسم آخر از صدایش گوش گل ما کر کند

گر بود زین چنین از تاب جین آتشکده　　سوختاتی طرح آتشخانهٔ دیگر کند

چو نشیند بر لب جو هندی زنار دار　　سجده ها از دیدن زنار نیلوفر کند

شوخ سوسن را بگو دل میرباید شقه ات　　ذات رجپوت است ترسم دست بر خنجر کند

ازین نظر مهمترین خصوصیت طغرا که امروزهای خیلی جاذبیت

دارد آوردن لغات هندی و محلی در ادبیات فارسی است مؤلف

خلاصة الکلام می گوید : "الفاظ هندی را اکثر صرف مینماید مجدیکه

بعضی جای رنگی هویدا می گردد"[1] اینک نمونهٔ اینگونه لغات چه

در نثر و چه در شعر در ذیل خواهیم دید :

زلف ما از تیل چنبیلی نماید چرب نرم　　تا فتد از حلقهٔ مویش بروغن ناجی

از چه بد چیپی نگردد راه گل　　وقت رفتن بلبلش فریاد کرد

سبز رجپوت بر چه دار افتاد　　سرو بالاله دستیار افتاد

گر نی آچی بدست خویش گیرد آن نگار

تا باچی از خط و خالش نگارستان شود

از آن برگ پان سرخ روی شود　　که دسانزیا قوت روی شود

گل تبکه بر طاق ابروی او　　بود خار مشکین ترازوی او

بگیسوی خود گر نریزد فلیل　　چسان بوی عنبر کند روبه تیل

(۱) ورق ۱- بانکی پور ۷۰۵

[illegible]و نباشد زردی خجل می‌شود بوتهٔ جعفری
[illegible] جلس نوا سنج تال توان خواندنت مطرب تیکال

بہر گوشه سناسی خاک مال تنی از قناعت برنگ خلال
زہیتیول چون یک شر کرده گل ضیا رفته تا روی نه سنبل
چو آتش در آب افکند پلجری در آب آید آتش بموج تری
بہندوستان چرخ ناگشته اہل بکامم نگردید چون چرخ بہل
دلم حاتی ابرسانی نیافت ز جاگیر و منصب نشانی نیافت
چو با پالکی نیست آرائشی نزیبد بکہار فرمایشی
بامر تو در پرگنات سرود کروری ز شغد ارشد چنگ رود
مغنّی تو کریالی محفلی ز کریال خود از چه رو غافلی
قدح در میان طاس کریالی است که چون گشت پر یک کری خالی است

گر دیده مینا راگ خوان رنگ صدا گشته عیان
وز نغمهٔ آب ارغوان در جوی تکرار آمده

شد وقت ہولی باختن با رنگ و بو پرداختن
خود را چو گلبن ساختن باغ ارم خوار آمده
آن شوخ کترائی لقب چون رخ گشاید نیم شب
پیدا شود صبح طرب خورشید رخسار آمده
رجیوتنی دل می‌برد جان نیز عاقل می‌برد
ایمان ز کامل می‌برد از بسکه طرار آمده
گردن بگردن مالعا یک سر فکنده مالدعا
نی نی که ہرسو ژالہا با شاخ گل یار آمده
زان چهره های بادله دستار گل دارد گله
تا بی شمیمش قافله در صحن گلزار آمده

سرو پنجابی نیارد رو بباغ ملکه
فاخته کرده گرو از شاخ گل مرعرکه
بسته می‌گردد زبان طوطی باغ ارم
نرگس جادوی سبزداکه چون منتر کند
بہر آن خورشید چاکر فیلبان روزگار
فیل گردون را ز سندور شفق زیور کند
بسکه می‌آید ہنر بری از کف آن شیردل
تیرمار برچهٔ او حمله اژدر کند

زبانی بپت آن کس که نوشید پانی چو طوطی شده سبز رطب اللسان
ز سامان کر یک فرقه انداز مہاجن کسی کوکه صد خانه اش زر نباشد
چو خاکستر تکیهٔ جوگیانش ندیداست چشم فلک تو تیا را
چو بازار این شہر را دیده ہندو بر از جته بازار لاہور خواند
خریدار شود ململ سرخ کارش کف مشتری ہمچو لعل تر افتد
درین سرزمین مہادیو ریشه کند گل پریزاد رنگی صنم را

برآورده جنتر ز ہرسو کدو که پر سازد از باده شور او
ندادی پکاوج گرش از شمیم پکاوج نوازی نکردی نسیم
بسر از شفق چیره مندلی بپا از گیه جوتی مخملی
به پچکاریش ہرکه پرداخته کج از نقرهٔ صبحدم ساخته

باد یک قلم جیت گریانیست اگر رشوه جیت قلمکار نیست
گل آفتابش به چسنی دمید که صد بدر را بلبل خویش دید
چو ہرسو حمایل کند ہار گل سبک سرو گردد گرانبار گل
چو مطرب پی گیت خوانی شود بنام خموشی فغانی شود
نوا فہم را صوت مردنگ تال بوجد آورد ہمچو ارباب حال

اگر شور بختیم بود در چیک | چه سوداگر بها کند از تمک
رسد کتهلش همچو گردون لبی | ہلالش بود کیلهٔ فارسی
ز تنبولیم چونه وش داغ پخت | که با من بود چون سپاری محت
درخت هلیلی که نامش براست | بشاخش چو دامی رسی بی براست

یک پیسه ازان نفع ندارند چو ماهی | جمعی که بس اندانخوبند درم را

غنچه بنشسته دو زانو در دبستان چمن | همچو طفلان برهمن بید را از بر کند
نسترن چون شاستر خوانان نمی گردد ازین | گر ز روی صحف گل یک سخن باز کند

۱. صراف بتوده کردن پیسه و روپیه دست برد (کلیات رسائل طغرا. نولکشور پریس)
۲. تنبولی بستن برگ تنبول سرخ روئی بدست آورد ص۱۲۷
۳. چون خواصانش بسرخی ہولی در آویزند ماه و آفتاب سوده شفق را برهم ریزند ص۵
۴. بدست دانچه کی نظرات در یک طرفة العین بدربار معلی خبر فرستاد ص۱۱۵
۵. دل بادل آسمانیست زرین .... بکتهو کهکشانیست سیمین ص۱۳۰
۶. کاسه ارگچه در هیأت مشرقیست مالامال تازگی صبح نشاط ص۱۳۱
۷. زره پوشان را بدگلهٔ سیمین چشم تنگ زره فراختر از چار آئینه گشت ص۱۴۷
۸. شیشهٔ تیل چون حباب سرزیر شده بود. ص۲۰۷
۹. بمناسب بهیل ہل نرگاو برخر چرا بنبدند ص۲۰۵
۱۰. میرزا اشرف ہمایون رقم در کچہری نوابخشی از نی خامه محرران بذوق باشد ص۲۲۲
۱۱. واردهٔ ما چون بانس پالکی نا راست افتاده ص۲۰۹
۱۲. برجلائی کناره دوپته لطافت پتکه پتنی ص۳۵
۱۳. در ہندوستان زمین رفتنش آسمان جوگی ست خاکستر مالیده ص۵۷
۱۴. اگر بلبل فریادی شود در ته کیرهٔ خار دار کشند ص۵۷
۱۵. مالهٔ گوہر.... جوہری فخر کنان بباز گاه می آرد ص۱۳۳
۱۶. دیوہرہ ص۱۳۵

طغرا یکی از آن شعرا و ہنرمندان است که قید و بند کلاسیک در خیلی چیزها از بین میبرد و از رسوم و حد بندیهای شاعرانه گریز میکند و هرچه میخواهد در شعر می سراید و از پایین ترین افکار و لغات تا بالاترین می رود و همین علت است که در اشعار وی اعتدال و یکنواختگی یافته نمی شود و خود او این را غریب گوئی نامیده است. پس می گوید

طغرا ز ما بیاموز طرز غریب گوئی | هم در غزل نگه کن هم در قصیدهٔ ما
بنیز ند طغرا القانون دگر مضراب نطق | رسم حافظ تا کجا طرز فغانی تا بکی

سپس گاهی در دیوان وی اشعار خوب و مضامین تازه و اضافتهای نازک دیده می شود چنانکه قبلاً نوشته شده است (اما گاه گاهی افکار دور دست و پیچیده و تشبیهات و استعارات تمثیلات غیر شاعرانه می آورد که فطرت طبیعت غزل از آن تکان میخورد چنانکه در ابیات ذیل دیده می شود:

از پی دامادی پروانه امشب ساخت عشق
در عروسی خانهٔ فانوس جای شمع را

است پروانه شو کاتوب اہل طاقت است
قبلهٔ حاجات گرداں موج آتش گاه را

من شمع نا حق کشته ام از شعله چون مسلم دهی
بهر کفن مقراض کن بال و پر پروانه را

می توان از شبنم خلوت سرای لاله یافت
کابر رحمت بی ترشح نیست آتش خانه را

تا شد از ترک نگاهت سرفراز آن تاج حسن
تخت گاه خرمی از کیقباد غنچه است

برای زینت عمنامه زرکوب تماشایش
طلای رنگ عاشق را ز پتنگ خود ورق کرده

مدار دست ز شمسیهٔ قدح زنهار
سه خط ببین و دو صد نکته بر جواب گیر

بخوان معوذتین ایاغ و مینا را | کز این تجنگ ددا بد بمد حاتمیا

ساقی کرد سوی ما بچشم خود نگاه — قامت بادام مخمورش بقد پسته بود

البته در اثر این آزادی بیان و وسعت سخن است که لغات و ترکیبات تازه عادة در اشعار و نثرهای دهلی دیده میشود و شاعر از ابتکار و طباعی خویش لغات تازه و ترکیبات نوین فارسی در آثار خود می گنجاند چنانکه در ذیل دیده میشود :

اگر دودی بباغستان درآید — برنگ دستهٔ ریحان درآید

نماید رقص در وحدت گه آب — فشاند هر طرف از شاخ آهنگ

دلم از یاد چشم او بود مانند نرگسدان — سرم از فکر لعل او کدوی باده را ماند

سنگ گر شهید است در باب خونفشانی — زخمی که بیدلا نرا در سنگ قبر باشد

اگر ز سرو قدش وصف خوان شود طغرا — صحیفه زار سخن با کرشمه ناز کند

تا از عبید نسترنبان آفریدند — مرا از ماتمستان آفریدند

طرفه جوشی در خیالستان طغرا دیده شد — نثرها می کرد شوخی نظمها برجسته بود

گوی مه افتان و خیزان از هلال آورده چوگان — در سوارستان میدان بهر خوبان شناس

تا می آشامی با آن دست نگارین میکند — جام ها در رنگ صورتخانهٔ چین میکند

در حریم آباد دل جای غم عشق نیست — بسکه بهر گوشه بخیت زان گل رعنا هوس

من بهوس زنده ام در طربستانی دهر — میرود جان ندست عقد ثریا بهوس

آتش کش چو در جامه ام کار کرد — تنم را ز داغش الف زار کرد

مقام آفرین خمستان می — ترنم گشای گره زار نی

قلمدانش از بس درم دان شده — غلافش بدستور همیان شده

ز مهتابی جامها تابدان — زرین خانه گردید مهتاب دان

ز بس نور تعظیم باروی اوست — قسمگاه حق طاق ابروی اوست

بسکه طغرا گشت بیدل در خزان آباد عشق — از صنوبر دام می گیرد دل عنکبوت ما

گر نمارد بر نزاکتخانهٔ لعل تو رشک — از چه رو پیوسته آتش در نهاد غنچه ها است

وسعت آبادی که طغرا کرده پیش خود بنا — او بهر جانبکه آید کو چه بند کثرت است

چرخ دون در مجلس آباد جهان بالا نشست — می کند دوران بپائینش زبس بیجا نشست

طغرا بعشوه خانهٔ دهلی چو راه نیست — سیر کرشمه زار بنارس غنیمت است

فرق بسیار است از سبزکن تا سبز هند — باغ دهلی همچو سروستان بیجاپور نیست

برات گون کدهٔ کلبه ام خرد نرسید — وگرنه از چه ته شیشه بر لب طاق است

عاقبت اندیشگان را در نشاط آباد کم — گریه می آید بر آن لب کاشنای خنده است

کرده آن گل پیرهن تا طرح استغنای حسن — دستگاه چاک پیمانی گریبان حسن است

طغرا غزل بگو ر سواد وطن مده — کو کاو کاو نامه معیوب می کند

هر کشمه آورده خاطر در نفاقستان دهر — گر به بیند سایهٔ خود را چو طغرا می رمد

ز طاقخانه طغری کتاب کاغذ را — برون فکنده کُه از شیشه و پیاله کند

غلط نما ز فکر است دیوان طغرا — بر اوراق او از چه مسطر نه خندد

پریخانه هر گوشه از روی خویش — ارم زار هر سوز گیسوی خویش

در جنون زار محبت وادهٔ مجنون تن بخت — کوهکن کهسار عزت کوهکن صحرا تواضع

میرود گل ز فراغت کده کار بهار — آنقدر عقل ندارد که شود رهزن گل

غیر سختی ز جواهرکدهٔ چرخ ندید — گشت تا از لب او لعل بدخشان غافل

همچو طغرا در کف آدم تراش روزگار

. . . .

خواهیم بلند تکدهٔ داغ تو پی برد — روزی که سر از کوچهٔ ناسور برآریم

تیره روئی دام می گیرد فلک از من بلی — از خیال دوست در خورشیدزار افتاده ایم

نه از باغ طرب گلچین میدم نه از دانش — بداغستان برد دل موسم کشت گلستانم

در فرازستان اگر جا خواهم از بخت نگون — میدهد جا در نشیبستان چو مرغ چاهیم

خواست چون طغرا پی دردوقوف آباد دهر

بسته شد از بند غفلت دفتر آگاهیم

حیرتی دارد دلم کاخر چسان گنجیده است

وسعت آباد ستم در تنگنای آسمان

تا نیفتد از سرت دستار زرتاری چو مهر

در هجوم آباد گیتی رخت گلناری مجر

ندیده ملک سخن غیر طغرا خسرو عادل

که در فریادگاه شاعری داد غزل داده

چون داشت از دو لی تنگ یار یگانهٔ ما

با مردمان نیامیخت در حشمخانهٔ ما

آنچه بلبل کدهٔ بزم بآن رنگی داشت
گل شمع و گل رخساره و گل ساغر بود

طغرا بشکر خانهٔ غم جای نگهدار — چند انکه ز رشک تو شود سوخته آتش
درچارسوی شعله فروشان محبت — از سوختنیم تازه بود کار چو آتش

...... میستان ......

۱- و غدغه ناک حوادث را چون دست پناه طلبی بدرش رسید، از حلقه اش صدای دمن دخله کان امینا شنیده -
(رسائل طغرا۔ نولکشور پریس ص ۹۷)

۲- از شرابزدگی گل غنچه دل آزرده است ص ۱۰۳

۳- درین شرارستان جز مجمر افروخته دواتی لائق نشمرده ص ۱۲۴

۴- اوج خوان هلال کمانی که چون تیر شهاب پروای آفتاب نداشت، بجهت قربان آن نشانه ارتقاب قوسین برکف نیاز گذاشت ص ۱۵۵

۵- فرمان عالی کاغذ دالاسیاهی در قلمزار ستهٔ فیض ورود بخشید ص ۱۷۲

۶- فرمان .... خرمی بخش چار حد امن آباد گردید ص ۱۷۴

۷- شطرنجدان تسخیر جهان سلامت ص ۱۷۷

۸- فرمان مهر صورت .... از نمک ورود منزل صبح آباد را ملیحستان گردانید - ص ۱۷۸

۹- در تحریر این پرتوستان خامه از برق نور تجلی افراختهٔ درتسطیر این شعارع زار کاغذ از برگ نخل ایمن ساخته ص ۱۲۳

۱۰- طوطی ناطقه بذکر بعضی از فواکه این چاشنی کده باخویش موعود شیرین زبان است - ص ۷

۱۱- شمیم نلوهٔ جودیش بشام سکنهٔ آمیزش زار ملک رسید ص ۱۲۹

۱۲- درصوفی خانهٔ کشمیر اختیار گوشه نشینی کرده ص ۱۹۷

می شیشه اش کیقباد انتظام — ز جاش برآورده جمشید نام
بخلوت سرای صراحی و جام — مکن غیبت آن نشاط انتظام

صبا گفت شاه باهت سرشت — چو گردید ستاده باغ بهشت
درین بوستان طراوت سرشت — دمیده ز هر بوتهٔ صد بهشت
همه چون سماعیل قربان شعار — بجانبازی راه پروردگار
خضر خان نژادی بود شهر یار — که عدلش کند کار صد نو بهار
بغیر از دو دندان آن شب شعار — نگردیده باهم دو صبح آشکار
درین کارگاه مصالح قطار — نکردیم کاری که آید بکار
بیا ای مه آسمانی نسق — ز جام و شراب هلال و شفق
درین مسجد از نور صبح انتظام — مؤذن سحر خوان بود وقت شام
درین فتنگه شمع صوفی نژاد — برآورد آهی چو دود از نهاد
ز دودش هنود مجاور قطار — سرافراز طوقش بتان فرخار
نباشد چرا عود هندو شعار — که از تار خود گشته زنار دار
چو صندل نواز برهمن مقال — رسانید خود را بناقوس تال
ز سنگینی آن رعونت شعار — سبک گشته سلمای کوه وقار
تیمم بدین خاک رونق سرشت — بود چون وضوئی آب بهشت
بود خاک او بوستان انتظام — بگردد چرا سبحه اش سبز فام
ز لیلی نژادی سراپا نمک — از و گشته مجنون سما تا سمک

آن مولوی هنگامه ام کز فیض جوش خامه ام
بیش از کتوبر نامه ام هر صبحدم یا هو زند

شانه هم نقلی ز سرگردانی کاکل کند — عشق اگر دلسوز گردد با سمندر طفتان
زآهن پایگی چون میل گنبد — گره بیرون نرفت از کار واعظ
آن کفر نژادیم که در پیش براهیم — هیزم ز پی آتش نمرود شکستیم
منکه فاسق طینت و عاصی نژاد افتاده ام
چون نبینم رو سیه خود را کمتر از گنا
رندی که طرب برد در صهبای سرود است
طغرا صفت از کاسهٔ طنبور خورد

۱- حرون طبعان مدتعریف جنگش بتیز جلوی تقریر مجبور ص ... رسائل طغرا
۲- بعد از چند مقام بهایات نیستان انتظام باغستان جلال آباد داد ...
(دیناکے اردو)

نوای درد

(از واقف)

بہ وفورِ جذبۂ دل۔ نہ بہ قصد مجرمانہ زنظر گناہ کردم۔ بہ نظارہ والہانہ

دلِ من۔ بتنگ آمد۔ زنگاہِ مہر پرور چو شکیب من ربودی۔ بہ ادای دلبرانہ

سرِراہ۔ بسنگ طفلان۔ بہ درت جفای دربان بحضور۔ صد رقیبان۔ چو سگانِ آستانہ

صنما۔ نمی پسندم۔ تفسی۔ ملالِ خاطر ولی چشم زخم دارم۔ ازین گردش زمانہ

عجب اضطراب پیہم۔ بہ سرم شدہ مسلّط نہ دلم قرار گیرد۔ بحضور و غائبانہ

بہ طریق اہل دلہا: یکے مسلکِ مودت بسی سجدہ نقش کردم۔ بسرِ سنگِ آستانہ

ازین صرصرِ حوادث۔ چو چمن خراب گشتہ نہ سُراغ صد نشیمن۔ نہ نشانِ آشیانہ

بہ لباس پارسائی۔ مفروش بندگیت بہ ہوائی حور و جنّت۔ بہ اصول تاجرانہ

بہ حریم ناز پیکر۔ بحصولِ باریابی

تو چرا۔ رسیدی واقف بطریق ابلہانہ

قصۀ ژاپونی

اوراشیا

اوراشیا ماهی گیر دریای میانه بود
هرشب پی کار خود میرفت. ساعتهای دراز در تاریکی روی دریا
ماهیهای بزرگ و کوچک میگرفت، و از این راه میزیست.
یکی از شبها که ماه دریای خود را در پیش گرفته بود و مهتاب
میدرخشید، اوراشیا در زورق خود چندک زده و دست راست خود
را در آب سبز دریا فرو برده بود. بقدری خمیده بود که زلفش روی
امواج کشیده میشد، و توجهی به زورقش نداشت که براه عادی
میرود یا اینکه ماهی تنورش خورده است. زورق بیراهه رفت
تا بجائی که سایه زده بود رسید، بطوریکه اوراشیا نه میتوانست بیدار
بماند و نه میتوانست بخوابد چون ماه او را گرفته بود
ناگهان دختر دریای ژرف برخاست و ماهیگیر را در آغوش
کشید و باهم غرق شدند و همین طور پائین رفتند تا بسردابهٔ دریائی دختر
رسیدند. دختر او را روی بستر شنی خوابانید و مدتها با دنگریست و
افسون دریائی خود را باو خواند در حالیکه چشمهایش باباو دوخته
بود آوازهائی دریای برایش سرود.
او گفت: "خانم تو کیستی؟"
دختر گفت: "دختر دریای ژرف"
گفت: "بگذار بخانه بردم، بچه های کوچکم چشم براه خسته
شده اند"
دختر باو گفت: "نی، کمی با من بمان"
"اوراشیا
ای ماهیگیر دریای میانه
تو زیبائی
موی بلند تو در قلبم پیچیده
از من دوری مکن
خانه ات را فراموش کن"
ماهی گیر گفت: "آه" حالا محض رضای خدا بگذار من میخواهم
بخانه ام بردم"
لکن دختر دوباره گفت: "اوراشیا،
ای ماهی گیر دریای میانه،
بر بسترت مروارید خواهم افشاند
بسترت را با چگن و گلهای دریائی خواهم پوشاند.
تو پادشاه دریای ژرف خواهی شد.
و ما باهم فرمانروائی خواهیم کرد"
اوراشیا گفت: "بگذار بردم خانه، بچه های کوچکم چشم براه خسته اند"
ولی دختر گفت: "اوراشیا
ای ماهی گیر دریای میانه،
هرگز از طوفان دریای ژرف بیم مدار.
ما تخته سنگها را بدرهای سفارهٔ خودمان میلغزانیم،
هرگز از مرگ در آب مترس تو نباید بمیری"
ماهی گیر گفت: "آه، حالا محض رضای خدا بگذار، من میخواهم
بخانه بردم"
"همین یکشب را با من بگذران"
"نی، نه همین یکشب را"

پس دختر دریا شروع به گریستن کرد و اورشیا اشکهایش را دید و گفت: "من همینجا یکشب را با شما خواهم ماند".

شب که به پایان رسید دختر او را به کنار دریا روی ماسه آورد.

دختر گفت: "آیا خانه‌ات نزدیک است؟"

گفت: "باندازهٔ سنگ پرتاب است".

دختر گفت: "این را بیاد من بگیر" جعبه‌ای از گوش ماهی که برنگ قوس قزح میدرخشید و جنس آن از مرجان و ابریشم بود باو داد.

دختر گفت: "در آنرا باز مکن، ای ماهیگیر درش را باز مکن". پس آن دختر دریای ژرف در آب رفت و ناپدید شد.

اما اوراشیا، زیر درختان کاج دوید تا بخانهٔ گرامیش برسید و همین طور که میرفت از شادی میخندید و مجری را جلوی خورشید تکان میداد و میگفت:

"آخ، کاجها چه بوی خوشی دارند". میرفت و همان طور که بچه‌هایش آموخته بود با آهنگ مرغ دریائی آنها را صدا میزد.

باخودش گفت: "آیا هنوز خواب هستند؟ عجیب است که جواب مرا نمیدهند". چون بخانه رسید، چهار دیوار سبزی دید که رویش خزه روئیده بود. بلادون در آستانهٔ خانه سبز شده بود، زنبق خشکیده در درون آن دیده میشد تا جریزی و علف هرزه بزمین روئیده بود و هیچ جاندار در آنجا نبود.

اوراشیا فریاد زد: "این چه چیز است؟ آیا هوش از سرم پریده؟ آیا چشمهایم را در دریای ژرف جا گذاشته ام؟"

روی علفهای زمین نشست و بفکر فرو رفت. باخودش گفت: "خدایان بیادم برسند! زنم کجاست و چه بسر بچه های کوچکم آمده؟"

بدهکده رفت که حتی سنگهای سر راهش را میشناخت، و هر سفال و هر لبهٔ شیروانی بچشمش خودمانی میآمد. آنجا مردمانی را دید که در آمد و شد بودند و پی کار خود میرفتند. اما همهٔ آنها بنظر او بیگانه می آمدند.

آنها میگفتند: "روز شما بخیر، ای مسافر روز شما بخیر. آیا شما هم شهری ما هستید؟" بچه‌ها را دید که سرگرم بازی بودند، اغلب دستش را زیر چانهٔ آنها میگذاشت و سرشان را بالا میگرفت. افسوس همهٔ اینکارها بیهوده بود.

او گفت: "ای کوانون بانوی بخشایشگر! پسر بچه‌های خودم، سال من کجا هستند شاید خدایان حتی همه اینها را میدانند، این ادهیر من زیاد است".

تنگ غروب قلبش بسنگینی سنگ شد بیرون شهر رفت و سر جاده ایستاد. همین طور که مردم از آنجا میگذشتند آستین آنها را میکشید و میگفت: "رفیق مرا ببخشید، آیا شما در اینجا ماهیگیری بنام اوراشیا میشناسید؟"

مردمانی که از آنجا میگذشتند جواب میدادند: "ما چنین اسمی را نشنیده ایم".

از آنجا بزرگان کوهنشین میگذشتند، برخی پیاده و بعضی سوار یا بوی مردنی بودند آنها میرفتند درحالیکه ترانه های بومی میخواندند و بارهای تمشک خود را روی پشتشان بسته بود و همین طور که میگذشتند سر سوسن ها تکان می خورد و زوار نیز از آنجا میگذشتند همهٔ آنها عصا و کلاه حصیری و پوزار چابک و قمقمه آب داشتند و سفید پوش بودند. همچنین آقایان دخانها با جامه‌های گرانبها و همراهان بسیار رد میشدند و کالاگوی زربفت بر داشتند. شب آمد.

اوراشیا گفت: "امید خیرم بباد رفت".

اما از آنجا پیرمرد بسیار سالخورده گذشت.

ماهیگیر فریاد زد: "اوه، ای پیرمرد، تو که روزهای بسیار دیده ای آیا چیزی از اوراشیا میدانی؟ او در اینجا بدنیا آمده و بزرگ شده".

پیرمرد گفت: "کسی باین نام بود، ولی آقا، آن شخص زمانیکه من بچهٔ کوچکی بودم، سالها پیش غرق شد. پدربزرگم بمن درت او را میگفت

میاید. - ای غریبه عزیز خیلی سالها پیش این اتفاق افتاد"

اوراشیا گفت: "آیا مرد؟"

"خیلی کسان دیگر هم بعد از او مردند. پسرانکش مردند، نیاکان

آنها هم مردند، ای غریبه خوش باش!"

اوراشیا ترسید و با خودش گفت:

که مرده ها خوابیده اند بروم." و بطرف ده رهسپار شد.

با خودش گفت: "چه باد سرد شبانه ای روی سبزه ها میوزد،

درختها پیچ و تاب میخورند و برگها بخت رنگ پریده خود را بجانب

من میکنند."

باز گفت: "درود بتو ای ماه اندوهگین، که همین گوره های

ساکت را فشان میدهی، تو هیچ با آن ماه دیرین فرقی نداری."

باز گفت: "اینجا گورستان پسرانم و گورستان پسر آنها

ست. اوراشیای بیچاره، مردمان بیشماری پیش از او مرده اند

اکنون من یکه و تنها در میان سایه ها هستم.

اوراشیا با خود گفت: "که از من دلجوئی خواهد کرد؟"

باد شب آهی کشید و دیگر هیچ نبود.

سپس اوراشیا بکنار دریا رفت و فریاد کشید: "که از من دلجوئی

خواهد کرد؟" اما آسمان آرام بود و امواج که در دریا روییم

پیچیده ند.

اوراشیا گفت: "این جعبه است" از آستینش آنرا درآورد

و بازکرد. دود سفید رقیقی از آن بیرون آمد، موج زد و دود گرداگرد

دور دست ناپدید گردید.

اوراشیا گفت: "من خیلی شکسته شدم." در حال نعلم موش

مثل برف سفید شد. بخود لرزید. بدنش چین خورد، چشمهایش تار شد.

او که آنقدر جوان و شاداب بود همانجا که ایستاده بود لغزید و

لرزه براندامش افتاد.

اوراشیا با خود گفت: "من پیر هستم"

خواهد ... در جعبه را ... ی آنرا بهت ...

"بخار دودی که در آن بود برای همیشه رفت. دیگر بچه ...

میخوردند"

روی ماسه دراز کشید و مرد.

ترجمه: صادق هدایت

کلمات قصار

مهاتما گاندی

(۱)

عدم تشدد

عدم تشدد نخستین اصل ایمان من است. در ... اجتماعی ام بارها اتفاق افتاده که میتوانستم ... بدیهای دیگران را تلافی کنم و انتقام بگیرم. ولی دست بچنین کاری نزدم و بدوستان نیز توصیه کرده ام چنین نکنند. حیات من وقف توسعه و تعمیم همین فلسفه است. در مواعظ بزرگترین شخصیت های اخلاقی و معنوی جهان زرتشت، مهاویر، و انبیا عیسی مسیح، حضرت محمد و نانک نیز جز این ندیده ام.

فلسفهٔ عدم تشدد من اجازه نمیدهد بهنگام خطر هزیمت اختیار و عزیزان خود را بی پناه گذارم. بین تشدد و فراری که مبتنی بر ترس باشد من حتما تشدد را ترجیح میدهم. موعظهٔ فلسفهٔ عدم برای آدم ترسو چنان است که انسان انتظار داشته باشد شخص کور مناظر زیبای طبیعت لذت برد. عدم تشدد منتها الیه دقله شجاعت است.

آزمایش اصلی عدم تشدد این است که در مبارزهٔ بدو عاقبة الامر بغض و عداوتی باقی نمی ماند و در پایان هر طرفین دوست صرف نظر از آنکه ممکن است شخص جنگا بسیار ضعیف باشد فرار آور و مایهٔ خجلت است. شخص باید برجای بماند و در محل نگهبانی جان

... و ... تا ... خود را بکار برد تا دشمن بزانو در آید. حتی اگر انتقام چنین عملی باعث نابودی خود وی گردد. این عمل شجاعت است ولی

ترجمہ فارسی:- حمید باقرزادہ

ترجمہ اردو :- سید عظمت علی

روس کا محبوب شاعر
ف ۔ ن ۔ توتچف

فیودور ایوانویچ توتچف (FEODOR IVONOVICH TUTTCHEV) در ۲۳ نوامبر ۱۸۰۳ء در دہی نزدیک شہر اوریول ORIOL بدنیا آمد۔ مادرش "کاترینا" از خانوادۂ توتسوی بود۔ در ۱۸۱۹ وارد دانشکدۂ مسکو شد و درہمین سال کہ چہاردہ سال بیش نداشت بواسطۂ ترجمۂ منظومی کہ کردہ بود بعضویت "انجمن دوستداران ادبیات روس" پذیرفتہ شد۔ در ۱۸۱۱ از روسیہ خارج گردید و بیست و دوسال در خارج از آن کشور می زیست۔ در آلمان شہرت و محبوبیتی یافت و با "ہاینہ" و "شیلینگ" دو شاعر معروف آلمانی، دوستی بسیار نزدیک داشت۔ درہمین کشور با "کنتس بوتمیر" کہ دوشیزہ ای نجیب زادہ بود، ازدواج کرد۔

در ۱۸۳۶ پوشکین کہ چند سال پیش از آن توجہش باشعار توتچف جلب شدہ بود، شانزدہ شعر او را در مجلۂ "تجدد" کہ پوشکین خود مدیر آن بود، بچاپ رساند۔

شہرت توتچف از ۱۸۴۴ یعنی آخرین باری کہ از اروپا بروسیہ بازگشت، آغاز گردید، و عاقبت در ۱۸۷۳ زندگی بدرود گفت۔

روی ہمرفتہ در حدود سیصد شعر از او باقی ماندہ است توتچف در اشعارش غالباً بطبیعت از دریچۂ روح خود می نگرد و بیشتر احساسات درونی خود را در آن ہا منعکس می سازد۔ ہمیشہ معتقد است کہ انسان باسرار طبیعت پی نخواہد برد و تلاشی کہ در این راہ می کند عبث و بیہودہ است۔

آنچہ را کہ انسان از طبیعت در می یابد کلمات و موسیقی و دیگر

فیودو ایوانویچ توتچف (FEODOR IVANOVICH TUTTCHEV) ۲۳ نومبر ۱۸۰۳ء کو شہر اوریول کے ایک دیہات میں پیدا ہوا۔ اس کی والدہ کاترینہ توتسوی خاندان سے تھیں۔ ۱۸۱۹ء میں توتچف ماسکو کالج میں داخل ہوا اور اسی سال جبکہ اس کی عمر ۱۴ سال سے زائد نہ تھی ایک منظوم ترجمہ کی وجہ سے "انجمن دوستداران روس" نے اسے اپنا ممبر بنا لیا۔

۱۸۱۱ء میں وہ روس سے باہر گیا۔ چنانچہ ۲۲ سال تک اس نے اپنے وطن سے دور جرمنی میں زندگی بسر کی۔ جرمنی میں اسے بیحد مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی اور جرمنی کے دو مشہور شاعر ہائینہ و شیلنگ سے بہت گہری دوستی ہوگئی اور وہیں اس نے کنتس بوتمیر سے جو ایک اعلیٰ خاندان کی لڑکی تھی شادی کی۔

پوشکن کو توتچف بہت پسند تھا چنانچہ ۱۸۳۶ء میں اس کی سولہ نظمیں اپنے رسالہ "مجدد" میں شائع کیں۔ توتچف کی شہرت درحقیقت ۱۸۴۴ء سے شروع ہوئی جبکہ وہ آخری بار یورپ سے اپنے وطن عزیز ماسکو کو واپس ہوا اور آخرکار ۱۸۷۳ء میں اس نے انتقال کیا۔

توتچف کے تقریباً تین ہزار شعر ملتے ہیں۔ توتچف فطرت کو اپنی روح کے دریچے سے دیکھتا اور زیادہ تر اپنے اندرونی احساسات کو اشعار میں منعکس کرتا ہے۔ وہ ہمیشہ اس کا معتقد رہا ہے کہ انسان فطرت کے اسرار کو معلوم نہیں کر سکتا اور اس راہ میں اس کی ہر کوشش بیکار ہوتی ہے۔

رشتہ ہای ہنری از بیان آن عاجزند۔ از این رو بہتر است ہنرمند آنہا را در درون خود نگاہ دارد۔ این نظریہ بعدہا در اشعار سولیف بسیار بسط دادہ شدہ و در اغلب اشعارش بچشم می خورد۔

جو کچھ انسان فطرت سے پاتا ہے، کلمات موسیقی اور دوسرے ... سے اُسے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے بہتر ہے کہ ہنرمند اُن کو اپنے اندر محفوظ رکھے۔ اس نظریہ کو اس کے بعد سولیف نے اپنے ... بہت وسعت دی چنانچہ اس کے اکثر اشعار میں یہ چیز دکھائی دیتی ہے۔

"خاموش رہ"

نمونۂ علامہ ف۔ ن۔ تو تچیف

احساسات و رویای خویشتن را،
نہفتہ دار و از نظرہا پنہان کن
کاش آنہا در ژرفنای روانت
طلوع و غروب کنند
بسان اختران روشنگر شب
از دیدار آنہا شادان شو و خاموش باش!

اپنے احساسات اور خیالات کو
پوشیدہ رکھ اور منظر عام پر نہ لا،
کاش، وہ تیری روح کی گہرائیوں میں
طلوع و غروب کریں۔
رات کے جگمگا دینے والے ستاروں کی طرح
تو انھیں دیکھ کر خوش ہو، اور "خاموش رہ"

چگونہ دل می تواند خویشتن را بنمایاند؟
دیگران چسان می توانند پردہ از ضمیر تو برگیرند؟
آیا او می تواند جوہر زندگی تو را دریابد؟
اندیشہ ای کہ بسیائی کلمات درآمدہ دروغ است!
گر چشمہ را بیاشوبی، آب آن گل آلود می شود
از چشمہ زلال بنوش و خاموش باش!

دل کس طرح اپنے کو ظاہر کر سکتا ہے
اور دوسرے لوگ ضمیر سے کس طرح پردہ اُٹھا سکتے ہیں؟
کیا وہ تیرے جوہر زندگی کو پا سکتا ہے۔!
وہ خیالات، جو کلمات کی ظاہری شکل سے پیدا ہوتے ہیں جھوٹ ہیں
اگر چشمہ کا پانی ہلا دیا جائے تو وہ گدلا ہو جائے گا۔
آب حیات پی اور "خاموش رہ"

بیاموز کہ در خلوت درون خود زندگی کنی
دنیای در درون توست،
این دنیا، رؤیائی و افسون زاست،
غوغای خارج، این رؤیا را از میان خواہد برد
و پرتو روز آنرا نابینا خواہد کرد
بزمزمہ اش گوش فرادہ و خاموش باش!

تنہائی میں زندگی گزارنے کی عادت ڈال،
خود تیرے اندر ایک دنیا موجود ہے۔
بیرونی آوازیں، اس خواب کو نیست و نابود کر دیں گی۔
اور دن کی روشنی انھیں اندھا بنا دے گی
تو اس کے زمزموں کو سُن، اور "خاموش رہ"

صفوی بادشاہوں کے زمانہ۔ ایران میں تمام سرکاری اور کاروباری خط وکتابت فارسی زبان میں ہوتی تھی۔ شاعروں کے فارسی دیوان بھی شائع ہونے لگے تھے۔ صائب کے بھی بہت سے عاشق اس کے کلام کی چھان بین میں مشغول ہوگئے اور اکثر اشعار اسی زمانے میں مرتب کئے گئے۔ تربیت تبریزی پہلا شخص ہے جس نے صائب کے اشعار کو ترتیب دے کر شائع کیا۔

جب کوئی ملک یا قوم ترقی اور عظمت کی بلندیوں پہ پہنچتی ہے تو اس کا تمدن اور حرکات وسکنات دنیا کے لئے مورد تقلید و توجہ ثابت ہوتے ہیں اور دوسرے ممالک اس ترقی یافتہ ملک کی زبان اور ادب سیکھنا اور پڑھنا اپنا فرض اور اپنی ترقی کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں لیکن فارسی کی ترقی کا باعث صرف یہی چیزیں نہ تھیں بلکہ اس زبان کی شیرینی اور گرانقدر ادبی خزانوں نے اس کی روز افزوں ترقی میں بہت مدد دی۔ اسی طرح صائب کا کلام اول زبان کی شیرینی اور دوسرے خیالات کی نزاکت اور تیسرے مواد کی فراوانی سے کر اٹھا اور تمام دنیا میں پھیل گیا۔

هرگز نمیرد آن که دلش زنده شد بعشق
ثبت است بر جریدهٔ عالم دوام ما

در توصیف بودا [illegible]

" بودا "

بنشسته او خموش
چندین هزار سال
بر مسندی سپید
در معبدِ نپال

در قعرِ چشمهاش
غم می برد نشان
در خنده اش بلب
ماندست صد گمان

بگشوده دست ها
تلخیش بر لب است
چشمش کبود رنگ
همچون رخِ شب است

خونسرد و پُر شکیب
خاموش و خوف ناک
پیمان شکسته است
با مردمانِ خاک

چشمش نظاره جوست
بر این جهان راز
پیوسته این دو چشم
افسرده است و باز

۴۴

این رنج مرتسم
بس سالهای سال
تنها نشسته است
در معبد نپال

۴۴

تهران

فریدن - کار

غزل

(از ابوالقاسم لاهوتی که هجرِ وطن می‌سراید)

چه کرده ام که ز جانانِ خود جُدا شده ام ؟ — چه گفته ام که گرفتار این بلا شده ام ؟

بمن نگفته کسی تاکنون، گناهم چیست — کز آن گناه سزاوار این جزا شده ام

گر خدای من است او، که تا از و دورم — ز خود برآمده غرقِ "خدا خدا" شده ام

خوشا بحالِ دلِ من که پیشِ دلبر ماند — خبر ندارد ازین غم که مبتلا شده ام

صبا به محضرِ جانان سلامِ من برسان — بگو که از تو جدا سخت بینوا شده ام

ز آبِ دیده زمین را نموده ام دریا — درونِ کشتیِ غم بی تو آشنا شده ام

به آه، و غصه، و افسوس، و اشک بیداری — میانِ همسفران بی تو آشنا شده ام

برآید ار ز دهانم سخن، فقط این است

"چه کرده ام که ز جانانِ خود جدا شده ام؟"

در مسکو - ستالین آباد - ۱۹۳۴

ادبیاتِ ہند

غالب دہلوی

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

پیوں شراب اگر خم بھی دیکھ لوں دو چار
یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے!

جلا ہے جسم جہاں، دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو جو اب راکھ، جستجو کیا ہے

ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

رہی نہ طاقتِ گفتار، اور اگر ہو بھی
تو کس اُمید پہ کہیے کہ آرزو کیا ہے

رَوِش صدیقی

رَوِش یہ شکوۂ حسنِ رمیدہ خو کیا ہے
رمیدگی کے سوا رازِ رنگ و بو کیا ہے

یہاں تو غازۂ روئے حیات ہے درکار
یہ آنسوؤں میں لرزتا ہوا لہو کیا ہے

اگر نہیں ہے غمِ تشنگی کی رسوائی
تو پھر یہ گردشِ پیمانہ و سبو کیا ہے

فریبِ منزلِ ترک و طلب سمجھتا ہوں
یہ کیا کہوں کہ تقاضائے جستجو کیا ہے

چلی ہے مصلحتِ وقت کے قدم چھو کر
ہوائے دامنِ ساحل کی آبرو کیا ہے

سکوتِ تمکنت ناز کچھ تو ہو ارشاد
دلِ رَوِش میں یہ طوفانِ آرزو ہے

تاجکستان کا ایک باوقار شاعر
رودکی سمرقندی

ابھی حال ہی میں ماسکو کے چائیکوفسکی کنسرٹ ہال میں مشرق کے عظیم شاعر و مفکر رودکی کی گیارہ سو سالہ یادگار منائی گئی جس میں ایشیا اور افریقہ کے بڑے بڑے ادیبوں نے شرکت کی۔ سوویٹ عوام نے رودکی کے کلام کے ناقدین اور محققین کا بھی دلی شکریہ ادا کیا جن کی جانفشانی اور عرق ریزی کی بدولت اس عظیم شاعر کا کلام اور اس کے حالات معلوم ہوئے۔ ان عالموں میں ہندوستان کے علامہ شبلی نعمانی مرحوم ایران کے پروفیسر سعید نفیسی اور افغانستان کے آغا زابلی کا خاص احترام و عقیدت کے ساتھ ذکر کیا گیا۔ رودکی کا قول ہے:-

"صاحب عقل ہمیشہ امن و محبت کا خواہاں ہوتا ہے"

ابوعبداللہ جعفر بن محمد رودکی سمرقند کے قریب قصبۂ رودک میں جو پہلے کبھی ایران کا حصہ تھا مگر اب روس کے ترقی یافتہ صوبہ تاجکستان کا ایک جزو ہے پیدا ہوا۔ رودکی کو ایران کا سب سے بڑا شاعر مانا جاتا تھا اس لئے کہ اس کے اشعار اس کی فضیلت اور بلند خیالی کو ثابت کرتے ہیں بلکہ گزشتہ اور اس کے ہمعصر شاعروں میں سب سے زیادہ باقی ہیں۔ تمام تذکرہ نویسوں نے اس کا اسی طرح ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے شاعروں نے خاص کر اس کے ہمعصر شعرا جیسے شہید بلخی اور معروف بلخی وغیرہ نے اس کی بڑی تعریف کی ہے اور ان لوگوں نے جو اپنے آپ کو بڑا شاعر گردانتے تھے رودکی کے ساتھ رقابت کا اظہار کیا ہے چنانچہ معری گرگانی جو اپنے آپ کو بڑا شاعر سمجھتا تھا اور جس کے اشعار سے بھی قوت سخن آشکارا ہے رودکی کے ساتھ اپنا مقابلہ کرتا ہے اور کہتا ہے ؎

اگر بدولت با رودکی نہ ہم سانم عجب مکن سخن از رودکی نہ کم دانم

عنصری جو قصیدہ کا استاد تھا رودکی کی ہنرمندی کی تعریف کرتا ہے ؎

غزل رودکی وار نیکو بود غزل ہای من رودکی وار نیست
اگرچہ بکوشم بباریک وہم بدین پردہ اندر مرا بار نیست

کسائی مروزی اس کے بارے میں کہتا ہے ؎

رودکی استاد شاعران جہان بود صد یک از وی تو ای کسائی بگست

مسعود سعد فخریہ کہتا ہے ؎

سجود آرد بہ پیش خاطر من روان رودکی واین ہانی

خاقانی اپنے شعر کی تعریف میں کہتا ہے ؎

رودکی آنکہ در ہمی سفتی مدح سامانیان ہمی گفتی

عالموں اور فاضلوں نے بھی رودکی کی تعریف کی ہے اسمٰعیل بن احمد سامانی کے مشہور وزیر ابوالفضل بلعمی کا قول ہے کہ عرب اور عجم میں رودکی کا جواب نہیں۔ بلعمی نے رودکی کی نہ صرف تعریف کی ہے بلکہ اس کی قدردانی کی ہے اور اسے صلہ و انعام دیا ہے چنانچہ چھٹی صدی کے شاعر سوزنی نے اس طرف اشارہ کیا ہے ؎

صد یک از انچہ تو بکین شاعری دہی
از بلعمی بعبری نگرفت رودکی

رودکی کو رباعی۔ مثنوی۔ قطعہ۔ غزل غرض تمام فنون سخن اور انواع شعر میں مہارت حاصل تھی اور وہ ہر طرز میں کامیاب تھا خاص کر قصیدہ سرائی میں وہ سب کا پیشرو ہے اس لئے کہنا

چاہئے کہ رودکی بعد اسلام ایران پہلا شاعر ہے جس نے نہایت بلند پایہ اور محکم قصیدے لکھے ہیں۔

رودکی نہ صرف سخن پردازی اور الفاظ کے تناسب کا استاد تھا بلکہ اس نے نہایت دقیق معانی سے بھی کام لیا ہے اور عبرت آموز قطعات اور حکیمانہ اشعار اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔ مثلاً اس کے پند آمیز قطعات میں سے ایک قطعہ ہے ؎

زمانہ پندی آزادہ وار داد مرا ! — زمانہ را چو نکو بنگری ہمہ پند است !
بروز نیک کسان گفت غم مخور زنہار — بسا کسا کہ بروز تو آرزو مند است

اس موضوع پر اس نے بہت سے شعر کہے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر دنیا کے غم و اندوہ کے مقابلہ میں قوی دل اور توانا فکر تھا اور ہر موقع پر بردباری کی دعوت دیتا تھا کیونکہ اس کے نزدیک مرد وہی ہے جو پہاڑ کی طرح اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ حوادث کی بڑی سے بڑی موجیں اسکو دوڑا نہ سکیں۔ اس مضمون کو رودکی نے ایک قصیدے میں خوب بیان کیا ہے۔ یہ قصیدہ مشاہیر میں سے کسی کی وفات پر لکھا گیا ہے اور اس کے آخر میں آسیبِ روزگار اور تشویش افکار کا ذکر کر کے دلداری کی کوشش کی ہے۔ اس قصیدے کے چند شعر ہیں ؎

ای آنکہ غمگنی و سزاواری — وندر نہان سرشک ہمی باری
رفت آنکہ رفت و آمد آنکہ آمد — بود آنکہ بود خیرہ چہ غم داری
ہموار کرد خواہی گیتی را — گیتی است کی پذیرد ہمواری
رو تا قیامت آید زاری کن — کی رفتہ را بزاری باز آری
مستی مکن کہ نشنود او مستی — زاری مکن کہ نشنود او زاری
اندر بلای سخت پدید آید — فضل و بزرگی مردی سالاری

اس شاعر نے بڑی طویل عمر پائی تھی اور اس نے جو فرحت بخش اشعار لکھے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود بھی اپنے اقوال پر کاربند تھا۔ اس نے تندرست اور شادماں زندگی بسر کی تھی اور اگر اس کے اندھے ہونے کی روایت صحیح ہے تو اس کی بردباری اور سبک روحی کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح اسکی اندرونی روشنی نے بیرونی تاریکی پر غلبہ حاصل کر لیا تھا ایسی توانائی اور ایسی سعادت حاصل کرنے کے لئے چار وسائل دریافت کئے ہیں سچ تو یہ ہے کہ ان چار وسائل کو زندگی کے چار رکن کہنا چاہئے یہ چار رکن کیا ہیں، خرد، تندرستی، نیک خوئی اور نیک نامی، چنانچہ کہتا ہے

چہار چیز مر آزادہ را ز غم بخرد — تن درست و خوی نیک و نام نیک و خرد
ہر آنکہ ایزدش این ہر چہار روزی کرد — سزد کہ شاد زید جاودان و غم نخورد

باوجود اس کے کہ رودکی ہمیں زندہ دلی شادمانی اور اس دنیا کی نعمتوں سے استفادے کی دعوت دیتا ہے۔ دوسری طرف وہ یہ بھی کہتا ہے کہ شان و شکوہ اور اس کے جلوے کے فریب میں نہ آنا چاہئے اور نعمت و جاہ پر مغرور نہ ہونا چاہئے ؎

مہتران جہان ہمہ مردند! — مرگ را سر فرو ہمی کردند
زیر خاک اندرون شدند آنان — کہ ہمی کوشکہا بر آوردند
از ہزاران ہزار نعمت و ناز — نہ بآخر بجز کفن بردند

اگر انسان نیکی، خدمت اور مردانگی کو فراموش کر دے اور دنیا گیر اور خود پرست بن جائے تو آخر کار بھی دنیا اُسے پچھاڑ دیتی ہے اس لئے زندگی کے تھوڑے سے دن ہنسی خوشی کے ساتھ کاٹ دینے چاہئیں لیکن غفلت کے ساتھ نہیں بلکہ بیداری کے عالم میں!

ریاکاری، ظاہرداری، خوش ظاہری اور بد باطنی خرد مند دل کے مذہب میں حرام ہیں۔ کیا فائدہ اگر کوئی شخص نماز میں کھڑا ہوا ہو اس کا دل کسی اور جگہ پھنسا ہوا ہو ؎

روی بمحراب نہادن چہ سود — دل بہ بخارا و بتان طراز
ایزد ما وسوسۂ عاشقی — از تو پذیرد نہ پذیرد نماز

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے کہ رودکی قصیدہ کا استاد تھا اور ایک خاص سبک میں جسے اب خراسانی سبک یا ترکستانی سبک کہا جاتا ہے، شعر کہتا تھا۔ اس سبک کی ایک خصوصیت سادگی اور ہر حال میں متانت و سنجیدگی ہے۔ رودکی کے جو قصائد باقی رہ گئے ہیں اُن میں سے ایک قصیدہ وہ ہے جو حسب ذیل مطلع سے شروع ہوتا ہے:

ادرمی را اگر د باید فتراک / بجز اورا گرفت و کرد بزندان

رودکی نے یہ قصیدہ امیر ابوجعفر احمد صفاری کی مدح میں لکھا ہے یہ امیر یعقوب صفاری کے خاندان سے تھا اور نصیر الدین احمد سامانی کے دربار میں بڑا مرتبہ رکھتا تھا۔ نصیر الدین احمد سامانی نے اسے سیستان کی امارت عطا کی تھی۔ رودکی نے یہ قصیدہ اس وقت لکھا تھا جب کہ بادشاہ نے اپنے اس رئیس کو اپنی مجلس میں یاد کیا تھا۔ یہ قصیدہ خراسانی سبک کی طرح سادہ اور محکم ہے اور وہ پُر تکلف مدح سرائی جو رودکی کے بعد کی صدی میں رائج ہو گئی تھی اس قصیدہ میں ناپید ہے۔

لڑائی کے روز میر گویا "پیل دمان" "اسفندیار زمان" اور سارا عالم اس کے تیروں سے ترساں و لرزاں ہے۔ یہ امیر سخاوت سے کام لیتا ہے شاعروں اور سخنداںوں کو نوازتا ہے۔ انصاف کے وقت قوی اور ضعیف دونوں اس کے سامنے برابر ہیں۔ اس کی رحمت کا دسترخوان سب کے لئے ہے اور اس کی بخشش کی بارش سب پر ہوتی ہے۔

رودکی کے قصیدوں میں ایک اور قصیدہ ہے جو اس نے اپنے بڑھاپے کے زمانہ میں اپنی حالت پر لکھا ہے اور اس قصیدہ میں اُس نے جوانی کے دنوں کے مزوں اور بڑھاپے کے ضعف کا نقشہ کھینچا ہے اسی قصیدہ کے سلسلہ میں اس نے اپنی شاعری کی شہرت اور اس کے اثر و نفوذ کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس قصیدہ کے چند شعر ہیں۔

مرا بسود و فرو ریخت ہرچہ دندان بود / نبود دندان لا بل چراغ تابان بود

سپید سیم زدہ بود و در و مرجان بود / ستارہ سحری بود و قطرہ باران بود

دلم خزانہ پر گنج بود گنج سخن / نشان نامہ ما مہر و شعر عنوان بود

ہمیشہ شاد و ندانستمی کہ غم چہ بود / دلم نشاط و طرب را فراخ میدان بود

بسا دلا کہ بسان حریر کردہ بشعر / از آن سپس کہ بکردار سنگ و سندان بود

عیال نہ زن و فرزند نہ مؤنت نہ / ازین ستم دلم آسودہ بود و آسان بود

تو رودکی را ای ماہ رو ہمی بینی! / بدان زمانہ ندیدی کہ این چنینان بود

بدان زمانہ ندیدی کہ در جہان رفتی / سرود گویان گوئی ہزار دستان بود

ہمیشہ شعر ورا زی ملوک دیوانست / ہمیشہ شعر ورا زی ملوک دیوان بود

شد آن زمانہ کہ شعرش ہمہ جہان نبشت / شد آن زمانہ کہ او شاعر خراسان بود

کنون زمانہ دگر گشت و من دگر گشتم / عصا بیار کہ وقت عصا و انبان بود

رودکی کے اور کمالات میں سے ایک کمال جس کا تمام تذکرہ نویسوں نے ذکر کیا ہے موسیقی میں اس کی مہارت اور نغمہ سرائی کا کمال ہے چنانچہ خود کہتا ہے ؎

رودکی چنگ برگرفت و نواخت / بادہ انداز کو سرود انداخت

سامانی بادشاہوں کی خدمت میں رودکی اپنے شعر گا کر سناتا تھا اور اس کے ساتھ چنگ بجاتا تھا۔ اس کی خوش نوائی کے اثر کا اندازہ کرنے کے لئے یہ واقعہ کافی ہے کہ نصر بن احمد سامانی اپنے سفر میں بخارا کو بالکل بھلا بیٹھا تھا۔ درباریوں کو اپنے وطن اور اپنے وطن کی یاد ستا رہی تھی لیکن اتنی جرأت ان میں نہ تھی کہ خود نصر بن احمد سامانی سے وطن چلنے کے لئے کہتے۔ ان درباریوں نے رودکی کا وسیلہ ڈھونڈھا اور اس سے درخواست کی کہ وہ کسی طرح امیر کو بخارا چلنے پر آمادہ کرے۔ رودکی نے کچھ شعر کہے صبح امیر کی خدمت میں حاضر ہوا اور چنگ اٹھا کر وہ مشہور قصیدہ گانا شروع کر دیا جس کا مطلع یہاں نقل کیا جاتا ہے

بوی جوی مولیان آید ہمی / یاد یار مہربان آید ہمی

رودکی نے یہ قصیدہ کچھ اس طرح گایا کہ امیر کے دل میں اتر گیا اور اسے کچھ ایسا مست و بے خود کیا کہ وہ موزے تک پہنے بغیر بخارا کی طرف چل پڑا۔

رودکی کی ایک اہم منظوم تصنیف کلیلہ و دمنہ تھی اس کو ایک ایرانی عالم ابن مقفع نے پہلوی سے عربی میں ترجمہ کیا تھا رودکی کی یہ منظوم تصنیف اب ناپید ہو گئی ہے اور اس کے کچھ شعر فرہنگ اسدی طوسی اور تحفۃ الملوک نامی ایک اور کتاب میں ملتے ہیں اس خدمت کے صلہ میں اسے بادشاہ کی طرف سے انعام ملا تھا اور جیسا کہ عنصری کی طرف منسوب شعر میں کہا گیا ہے اسے انعام میں چالیس ہزار درہم ملے تھے۔

کیا الفاظ کے لحاظ سے اور کیا معنی کے لحاظ سے رودکی کے کلام میں بڑی تازگی پائی جاتی ہے۔ اس کے اکثر شعر عربی زبان کے اثر سے آزاد نظر آتے ہیں۔ رودکی کے اشعار کی تعداد میں مبالغہ سے کام لیا گیا ہے

صاحب لباب الالباب کہتا ہے کہ اس کے اشعار کے سو دفتر ہیں اور اسی سلسلہ میں رشید سمرقندی کا شعر پیش کیا جاتا ہے۔

شعر او را بر شمردم سیزده ره صد هزار   هم فزون آید اگر چونانکه باید بشمری

بہر حال اس سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اُستاد رودکی نے شعر بہت کہے تھے افسوس ہے کہ ان اشعار میں سے ایک دیوان کے سوا اور کچھ باقی نہیں رہا ان میں سے بہت سے شعر قطران تبریزی کی طرف منسوب ہیں۔ ان دو شاعروں کے ممدوحوں میں متاخرین کو جو اشتباہ ہوا ہے اس کی وجہ سے قطران کے اشعار رودکی کے اشعار میں مخلوط ہو گئے ہیں۔ رودکی نے ۳۲۹ھ میں وفات پائی یعنی وہ اپنے ممدوح اور سرپرست نصر بن احمد سامانی سے دو سال پہلے فوت ہو گیا۔

دلم خزانهٔ پر گنج بود و گنج سخن
نشانِ نامهٔ ما مهر و شعر عنوان بود   (پایان)

از صائب تبریزی

شوره زار

از نمودِ نقشها بی اختیار افتاده ام
مهرهٔ مومم بدست روزگار افتاده ام

ز انقلاب چرخ می لرزم بآب روی خود
جام لبریزم بدست رعشه دار افتاده ام

بر لب بامِ خطر نتوان بخوابِ امن رفت
دیده بستم تا ز اوجِ اعتبار افتاده ام

هر که بردارد مرا از خاک اندازد بخاک
میوهٔ خامم بسنگ از شاخسار افتاده ام

دست موج از زخمِ دندانِ گهر نیلی شد است
تا من از دریای هستی برکنار افتاده ام

هیچ کس حقِ نمک چون من نمی دارد نگاه
داده ام حاصل اگر در شوره زار افتاده ام

خواری و بیقدری گوهر کسادِ جوهری است
نیست جرم من اگر در رهگذار افتاده ام

دیده ام در نقطهٔ آغاز انجام فنا
چون شرر در جانفشانی بیقرار افتاده ام

نیست غیر از ساده لوحی خط پاکی در جهان
من چو طفلان در پی نقش و نگار افتاده ام

عشق و عاشقان

گردونِ صدفِ گوهر یکدانهٔ عشق است
خورشید جهان تاب ببین خانهٔ عشق است
خورشید و مه است کز سر زنند داغ جهان را
از سوختگان شمع دیوانهٔ عشق است
صائب تبریزی

(از عبید زاکانی)

ناز!

در ما بناز می نگرد دلربای ما
بیگانه وار میگذرد آشنای ما

بی جرم دوست پای ز ما درکشید باز
تا خود چه گفت دشمنِ ما در قفای ما

با هیچ کس شکایتِ جورش نمی کنیم
ترسم بگفتگو کشد این ماجرای ما

ما دل بدرد هجر ضروری نهاده ایم
زیرا که فارغست طبیب از دوای ما

مردم ز شوق حلقهٔ زنجیر زلف او
دیوانه می شود دل آشفته رای ما

بر کوه اگر گذر کند این آه آتشین
بیشک بسوزد ش دل سنگین برای ما

شاید ز خون ز دیده بریزی عبید اشک
او می کند همیشه خدایی بجای ما

سفیر انجم

صائب تبریزی

ایران شعر و ادب کا گہوارہ تھا اور ہے اور وہاں کی ہر چیز میں شعریت پائی جاتی ہے۔ وہاں حافظ، سعدی، فردوسی و خیام جیسے بیشمار نامور شاعر پیدا ہوئے۔ جن کا نام دنیائے علم و ادب میں ہمیشہ عزت کے ساتھ لیا جائے گا اور ان کے اشعار لوگوں کو وجد میں لاتے رہتے ہیں۔ حافظ کی بلند خیالیاں، سعدی کی پند نصیحت۔ خیام کی رباعیاں۔ فردوسی کا شاہنامہ اور ان کے ترنم خیز تاثرات ایران کے مایۂ ناز خزانے ہیں۔ یہ وہ دولت ہے جس میں ہمیشہ اضافہ ہوتا رہا ہے۔ ان ہی نامور ہستیوں میں ایک صائب بھی ہے۔

صائب کا سلسلۂ نسب

شمس الدین تبریزی تک پہنچتا ہے۔ اس کے والد محترم میرزا عبدالرحیم عباس آباد اصفہان کے ایک بہت معتبر تاجر تھے اور آپ کا شمار وہاں کی سربرآوردہ ہستیوں میں سے ہوتا تھا۔ آپ نے شاہ عباس اول کی دل سوز باتوں سے تنگ آکر تبریز چھوڑا اور عراق میں سکونت اختیار کرلی۔ لیکن صائب کی نشو و نما اصفہان میں ہوئی اور اسی شہر سے اس نے شہرت پائی۔ صائب کو اپنے وطن تبریز سے والہانہ محبت تھی چنانچہ اس کے بارے میں اس نے کہا ہے ؎

صائب از خاک پاک تبریز است
ہست سعدی گر از گل شیراز

صائب سن بلوغ کو پہنچنے کے بعد بیت اللہ کی زیارت کے لئے گیا واپسی میں اس نے حضرت رضا علیہ السلام کی منقبت میں ایک قصیدہ لکھا۔ ذیل کا شعر اسی قصیدہ سے ہے۔ ؎

شکر الحمد کہ بعد از سفر حج صائب
عہد خود تازہ بسلطان خراسان کردم

صائب کی بعض غزلوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اصفہان میں سکونت پذیر ہونے اور ایران کی روش سے کچھ دلگیر اور رنجیدہ خاطر ہو گیا تھا اس لئے اس نے ۱۰۳۴ھ میں اصفہان چھوڑ دیا اور ہرات و کابل کے راستے ہندوستان آگیا۔ ذیل کی غزل اسی سلسلہ سے مناسبت رکھتی ہے اور اس بات کی شاہد ہے کہ اس کو ہندوستان کی ادب پروری سے پوری پوری امید تھی کہ اسے دل کھول کر داد و تحسین ملے گی۔ ؎

طلائی شد چمن ساقی بگردان جام زرین را
بحش بر روی اوراق خزان دست نگارین را
دلم ہر لحظہ از داغی بداغ دیگر آویزد
چو بیماری کہ گرداند ز تاب درد بالین را
بجای لعل و گوہر از زمین اصفہان صائب
بملک ہند خواہد برد این اشعار رنگین را

جس وقت صائب کابل پہنچا تو ظفر خاں احسن سے تعارف ہوا ظفر خاں کے والد خواجہ ابو الحسن تربتی یا سبزواری ہندوستان کے بادشاہ شاہجہاں کی طرف سے کابل کے حکمران تھے یہاں صائب نے اس ادب دوست مربی کی وجہ سے بہت ترقی پائی۔ صائب سے تعارف حاصل ہونے کے بعد عرصہ تک اس بزرگ ہستی کو ظفر خاں نے بہت احترام سے اپنے ساتھ رکھا۔ ان کی شان میں بہت سے اشعار کہہ کر ان کو افغانستان میں بھی زندہ جاوید بنا دیا

صائب بھی ظفر خاں کی عنایات سے بہت متاثر تھا۔ چنانچہ کہتا ہے۔

خان خانان را ببزم و رزم صائب دیدہ ام
درسخاو در شجاعت چون ظفر خان تو نیست

اسی طرح ظفر خاں نے بھی جو صائب کو اپنا اُستاد کہہ چکا تھا اور اس کی بے حد عزت کرتا تھا اس طرح خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

طرز یاران پیش احسن بعد از این مقبول نیست
تازہ گو یہای او از فیض طبع صائب است

ظفر خاں نے اپنی اکثر غزلوں اور قطعوں میں صائب کے نام نامی کو استعمال کر کے کافی فائدہ اُٹھایا ہے۔

میر غلام علی آزاد بلگرامی نے سرو آزاد میں لکھا ہے کہ جب ظفر خاں شاہجہاں کے ساتھ دکن گیا تو صائب کو بھی ساتھ لیتا گیا جب شاہجہاں کا تعارف صائب سے کرایا گیا تو وہ بہت متاثر ہوا اور ایک قطعہ کے صلہ میں جو صائب نے اس کے جلوس کی تاریخ پر لکھا تھا اس کو مستعد خاں کا خطاب، منصب ہزاری اور بارہ ہزار روپیہ عطا کئے۔ ایک مورخ کا کہنا ہے کہ بادشاہ نے تین ہزاری منصب عطا کیا۔ اس کے برخلاف ریاض الشعراء کے مصنف کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ صرف بیس ہزار روپیہ بطور انعام دیا گیا تھا۔ بہر صورت شاہجہاں نے اس کی قدردانی اور ہمت افزائی کی۔

تذکرۂ خیر البیان کے مؤلف نے لکھا ہے کہ ہندوستان کے سفر سے پہلے صائب ایک روز اپنے دوستوں میں بیٹھا تھا۔ وہاں "حق آہ" نامی ایک درویش بھی موجود تھے اور انھوں نے اس کو اس محفل میں مستعد خاں کے نام سے پکارا اور اس کے بعد وہ اسی نام سے مشہور ہو گیا۔

تاریخ شاہد ہے کہ تاج محل کا خالق اور سنگ مرمر کا گرویدہ بادشاہ اپنی بے نظیر یادگاریں چھوڑ گیا ہے جو اس کے نام کو ہمیشہ تاریخ کے اوراق میں جلی قلم سے پیش کریں گی۔ لیکن بہت کم لوگ ایسے ملتے ہیں جو اس کا اعتراف کریں کہ اس کو جاودانی شہرت دینے میں یہی چیزیں نہ تھیں بلکہ اہل علم اور بے مثال شاعروں کا گروہ بھی تھا جنھوں نے دور دور ممالک میں ادب نواز ہستیوں تک اس کا نام پہنچایا۔ ان ہی میں صائب بھی شامل تھا جس نے شاہجہاں کے دربار کو رونق بخشی۔

۱۶۴۲ء میں ظفر خاں حکومت کی طرف سے کشمیر کا گورنر مقرر ہوا اور چلتے وقت اس والہانہ جذبے کے تحت جو اس کو صائب سے تھی اسے کشمیر لیتا گیا۔ شاہجہاں اس وقت برہانپور میں تھا انھیں دنوں خبر ملی کہ صائب کے والد اپنے فرزند کو اصفہان واپس لے جانے کی غرض سے ہندوستان آئے ہیں۔ صائب کو اس خبر سے بہت خوشی ہوئی۔ اس نے اس موقع پر ایک غزل لکھ کر ظفر خاں کو بھجوائی غزل کے چند شعر یہ ہیں۔

شش سال بیش رفت کہ از اصفہان بہند
افتادہ است توسن عزم مرا گذار
ہفتاد سالہ والد پیری است بندہ را
کز تربیت بود بمنش حق بے شمار
باجبہۂ گشادہ تر از آفتاب صبح
دست دعا ببدرقۂ راہ من برآر

ذیل کا شعر بھی صائب کی اس مشہور غزل سے ہے جو اس نے اصفہان آکر لکھی اور نواب جعفر وزیر اعظم کو بھیجی تھی مشارالیہ نے اس کے بدلے میں پانچ ہزار روپیہ ہندوستان سے صائب کو بھیجدیا۔

وہ دستار ا باحسان یاد کردن ہمت است
ورنہ ہر نخلی بپای خود ثمر می افگند

صائب جب تک ہندوستان رہا۔ ایک بہت بلند زندگی گزاری اور راحت و عشرت اس کے قدم چومتی رہی۔ اس کو شاہی قرب بھی حاصل تھا۔ لیکن اس کے باوجود اپنے وطن عزیز "ایران"

کی یاد ان کو بہت ستاتی تھی اور ہمیشہ وہ اصفہان جانے کا خواہشمند
رہا کرتے تھے ہندوستان سے جاتے وقت اپنے وطن پہنچنے کے اشتیاق
میں اس نے لکھا۔

خوش آں روزی کہ صائب من مکان در اصفہان سازم
زدعت زندہ رودش خامہ را رطب اللسان سازم

ایران پہنچکر صائب نے اصفہان میں سکونت اختیار کی اور
پھر کوئی بڑا سفر نہ کیا اور آخر دم تک ایران کے صفویہ سلاطین کی نظروں
میں معزز رہا۔ شاہ عباس ثانی کی طرف سے ان کو ملک الشعراء کے
خطاب سے سرفراز کیا گیا۔ لیکن شاہ سلیمان کے جلوس پر جب اس نے
ایک غزل لکھی جس کا مطلع یہ تھا۔

احاطہ کرد خط آن آفتاب تابان را
گرفت خیل پری درمیان سلیمان را

تو بادشاہ کو جو اپنے حسن پر بہت نازاں تھا بہت غصہ
آیا اور آخر عمر تک صائب سے کلام نہ کیا۔ اس جلوس کے تین
چار سال بعد اس کی عمر نے بھی وفا نہ کی اور اصفہان میں انتقال
کیا اور اس کو وہیں دفن کر دیا گیا۔ ان کی تاریخ وفات ذیل کے
جملہ سے نکلتی ہے۔

صائب وفات یافت

۱۰۸۱ھ

صائب کے تمام ہمعصر اور بعد کے تذکرہ نویسوں نے متفقہ
طور پر لکھا ہے کہ اصفہان اس زمانہ میں علم و دانش کا گہوارہ تھا
اور اپنے پورے شباب پر پہنچ چکا تھا۔

صائب کے متعدد دیوان ہیں اور کل مجموعہ ایک سو بیس ہزار
اشعار پر مشتمل ہے۔ شروع شروع میں اس نے صرف غزلیں لکھیں لیکن
پھر قصیدے، مثنویاں، فصیح و بلیغ مضامین اور دیوانی خطبے بھی
لکھے۔ اس کا ایک دیوان ترکی زبان میں بھی ہے۔ اس کا کلام نیرنگیوں
کا ایک ایسا سرچشمہ ہے جو نصائح آداب اور حکمت و امثال

سے بھرا ہوا ہے۔ مضامین بحر ذخار کی طرح لہریں مارتے ہیں [illegible]
کے اکثر اشعار ضرب المثل ہو گئے ہیں اور روزمرہ کی زبان [illegible]
بیٹھتے انھیں دہرایا جاتا ہے۔ صائب کے اشعار پڑھ کر انسان [illegible]
اُٹھتا ہے کہ یہ مضمون انسانی دماغ کی نشوونما نہیں ہے لیکن [illegible]
ورق گردانی اس کے اس شک کو مٹا دیتی ہے۔

بڑی حیرت و تعجب کا مقام ہے کہ ایک ایسا نامور شاعر جس کے
اشعار سے لوگ وجد میں آنے لگتے ہیں اور جو روح کو
تڑپا دیتے ہیں۔ ایک عرصہ تک ایران میں کچھ شہرت نہ حاصل کر سکا

. . . .

لطف علی صاحب نے اپنی کتاب "آتشکدہ" میں لکھا ہے کہ
صائب کا طرز سخن نرالا ہے اور متقدمین کے رنگ کی بو اس میں ذرا
نہیں پائی جاتی۔ وہ فصاحت و بلاغت کے دلدادہ نہیں بلکہ بلند
پروازی و بلند خیالی کے مالک ہیں۔ اس کا دیوان ایک سو بیس ہزار
اشعار پر مشتمل ہے لیکن کافی رعایت کے بعد اس میں سے صرف تھوڑے
سے اشعار اس کے دیوان کے لئے چنے گئے ہیں۔

رضا قلی خاں نے بھی کم و بیش ان ہی الفاظ میں صائب کو
خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ لیکن اکثر سخن پرداز وں نے صائب کو امام غزل
کے نام سے مخاطب کیا ہے۔

ان کے علاوہ دو نئے تذکرہ نویسوں نے بالاتفاق صائب کو
سب سے بہتر قرار دیا ہے۔ طاہر نصر آبادی جو صائب کے معاصرین میں
سے تھا اپنے تذکرہ میں ایک مفصل شرح لکھتے ہوئے کہتا ہے کہ مرزا
صائب کو عالی فطرتی۔ شہرت اور بلند مرتبگی ہونے کی ذرا بھی خواہش
نہ تھی اور نہ ان کے کلام کے جوہر پارے عوام کے دلوں سے دور [illegible]
ان کا کلام فصاحت و بلاغت سے پُر ہے اور دنیا کو روشن کرنے
والے سورج کی طرح تاباں ہے۔ ان کا قلم رنگینی اور خوش اخلا[illegible]

کا ترجمہ ہے۔ تین انگلیوں کے اتحاد سے اس نے دو زبانوں کی باتیں سنوائی ہیں۔

تذکرہ "ریاض الشعراء" کے مولف کا کہنا ہے کہ صائب کے کلام اور سخنوری کی شہرت دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پھیل گئی۔ مشرق سے مغرب تک ان کا کلام لوگوں کے دلوں پر اپنا رنگ جما چکا ہے۔ صائب کی برابری کرنا محال ہے اور ان کے معاصرین میں تو کوئی ایسا پیدا ہی نہ ہوسکا۔

مرزا غلام علی آزاد نے "سرو آزاد" میں لکھا ہے کہ صائب کا کلام صبح کے سورج کی طرح دلفریب اور معنی خیز ہے اور اس کے حسن کی کوئی برابری نہیں کرسکتا۔ چنانچہ اس نے خود ایک شعر میں کہا ہے:

ز صد ہزار سخنور کہ در جہان آید
یکی چو صائب شوریدہ حال برخیزد

سرخوش نے "کلمات الشعراء" میں لکھا ہے کہ اس زمانہ میں اس طرح کی معنی خیزی، خوش خیالی اور بلند فکری ایک عرصہ تک شعر کی دنیا میں کوئی دوسرا شاعر پیدا نہ کرسکا۔ صائب کا دیوان اس کی زندگی ہی میں عالمگیر شہرت پا چکا تھا۔ روم کے اہل ادب اور ہندوستان کے فرمانروا شاہ ایران سے اپنے مراسلات و مکاتبات میں صائب کے دیوان کی فرمائش کیا کرتے تھے اور اکثر شاہ ایران نے صائب کا دیوان ان لوگوں کو بطور تحفہ بھیجا بھی ہے۔ صائب کی طرح شعر و سخن کی دنیا میں کسی نے بھی اس قدر جان جوکھوں کی محنت نہ کی اور ایسی نکتہ سنجی، باریک بینی، معنی خیزی اور بدیع النظری غزلیات میں ان کے کسی معاصر نے نہ پیدا کی۔ صائب نے خود اپنے ایک شعر میں کہا ہے۔

تلخ کردی زندگی بر آشنایان سخن
این قدر صائب تلاش معنی بیگانہ چیست

ایک اور ایرانی نقاد مرزا محمد علی خاں تربیت تبریزی نے صائب کے احوال کے بارے میں لکھا ہے کہ غزلیات کے علاوہ ان کے اشعار کے انتخاب میں قصیدے اور نظمیں بھی شامل ہیں اور اس کا مرتبہ اتنا بڑھا ہوا ہے کہ الفاظ اس کی تعریف میں بیان نہیں کئے جا سکتے۔

جو لوگ شعر کو حقیقت میں دل کا ترجمان۔ احساسات و عواطف کی روح تجسم حالات و ادراک دقایق کے اظہار کا ذریعہ سمجھتے ہیں ....

اور چاہتے ہیں کہ .... شاعر کے کلام اور اس کی فطرت میں رقت طبع۔ باریک بینی اور اظہار بیان پر قدرت ہو اور اس کے اشعار گہرے معنی اور آسمانی الہامات سے بھرے ہوئے ہوں ان کو چاہئے کہ صائب کے دیوان کی ورق گردانی کریں۔ ان کو وہ سب چیزیں جن کی ان کو تلاش ہے وہاں مل جائیں گی۔

صائب کے اشعار یورپ میں بہت مقبول ہوئے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ہر حیثیت سے کامل ہیں اور دوسرے ممالک کے باشندوں کے ذوق طبع کو پورا کرنے میں پورے اترتے ہیں۔ جن لوگوں کو فارسی زبان و ادبیات سے ذرا بھی شغف ہے یا جنہوں نے صائب کے اشعار کے ترجمے کو صحیح معنوں میں پڑھا اور سمجھا ہے ان پر ایک خاص کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔ پروفیسر براؤن فرماتے ہیں کہ "جب میں نے ایران کے منتخب شعراء کے کلام کو مختلف لوگوں کی زبانی سن کر جمع کیا اور اس کا مطالعہ کیا تو پتہ چلا کہ ان میں سے بیشتر اشعار صائب کے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ صائب کتنا مقبول شاعر ہے۔ صائب ہی کے اشعار میں یہ وصف پایا جاتا ہے کہ ان کو ان کی اصلی خوبی اور کشش کے ساتھ دوسری زبانوں میں ترجمہ کیا جاسکتا ہے اور اس کے مفہوم میں کوئی فرق نہیں آتا۔ یہ صائب کے اشعار کی ایک بہت بڑی خصوصیت ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر ہر شعر میں لطافت و ظرافت جو کہ اب تک کسی نے استعمال نہ کی تھی کوٹ کوٹ کر بھری گئی ہے۔ اس کا ہر ہر شعر اپنی جگہ ایک پوری کتاب ہے جو دریائے معانی و ظرافت کی رو میں بہا چلا جا رہا ہے۔

یغمای شب

(داکتر پرویز ناتل خانلری)

شب به یغما رسید و دست گشود ــ درهٔ دره هرچه بود و نبود
رود دیری است تا اسیرِ دی است ــ بشنو! این هایهای زاری رود
کنج باغ از سپید و سرخ و بنفش ــ همه در چنگ شب به یغما رفت
شاخ گردو زبیم پای نهاد ــ بر سر شاخ سیب بالا رفت
شب چو دود سیه تنوره کشید ــ ره نهاد از نشیب سوی فراز
دست و پای درختها گم شد ــ برنیامد ز هیچ یک آواز
بانگ برداشت مرغ حق شب؟ ــ برگ بر شاخ بید لرزان شد
راه وامانده بر زمین بخزید ــ لای انبوه بوته پنهان شد
شب دمی گرم برکشید و بخفت ــ اینک آسوده از هجوم ستیز
یک سپیدار و چند بید کهن ــ بر سر پشته اند پا بگریز...

نامهٔ وداع

(محمد علی اسلامی)

پرسان پرسان رسیدم از راه ــ پیدا کردم نشان او را
بفشردم زنگ و در گشودند ــ گفتم گوئیدش آید اینجا

دیدم کاید ز خانه بیرون ــ سنگین سنگین و سرفکنده
ترسان چون کودک گنهکار ــ لرزان چون آهوی رمنده

آمد رویش ز شرم گلگون ــ لبها بیرنگ و سرد و خاموش
چشمان تبدار و پرز غم انگیز ــ زلفان آشفته بر بناگوش

بسپردم نامه را بدستش ــ گفتم با طعنه ای دل آزار
بستان این نامهٔ وداع است ــ رفتم رفتم خدا نگهدار

گفتم و گفت

(نما یوشیج)

گفتم :- سخت -
گفت :- شنیدن دارد -
گفتم که :- لبت -
گفت :- مکیدن دارد!
گفتم که :- چو جامه از تنت برگیرم!
گفتا که :- حکایتی است، دیدن دارد!

"فکاهی"

قمر مصنوعی

قیل وقالیست بپا از قمرِ مصنوعی　　گردش دوره کره در سفرِ مصنوعی
بعد ازین دیدهٔ تحقیق اگر باز کنی　　عالمی بینی با خشک و ترِ مصنوعی
گر که امروز سگی سوی هوا پر زد و رفت　　میپرد روزِ دگر کره خرِ مصنوعی
بعد صد سال دگر از رادیو می شنوی　　نغمهٔ غیر طبیعی خبرِ مصنوعی
خانمِ خوشگلِ آینده یقیناً دارد　　شکلِ مصنوعی و پا و کمرِ مصنوعی
گرچه ما را پدری صلبی و روحانی هست　　بعد ازین وای بما با پدرِ مصنوعی
هر کجا صحبتِ نفع است دو گوشت شنواست　　می شود وقتِ ضرر کور و کرِ مصنوعی
بوسهٔ یار ازین پس عسلِ مصنوعیست　　لبِ دلدار بود نیشکرِ مصنوعی
نالهٔ غیر طبیعی کشد از دل عاشق　　دارد از هجر بتی چشم ترِ مصنوعی

ای خوشا قسمت مخلص شود از لطف خدا
یارِ مصنوعی اندر سحرِ مصنوعی

(چاقالو)

"فکاهی"

قطعه

بگفتم بمردی سیاست مآب　　که ای نازنین مرد عالیجناب
میانِ نمایندگان جنگ چیست؟　　چک وسیلی و مشت وارد نگ چیست!
نزاع دو کس گرچه بد منظر است　　میانِ نمایندگان بدتر است
و داد ست یارِ نمایندگان　　نه جنگ است کارِ نمایندگان
بپاسخ چنین گفت آن نکته سنج　　که از جنگ و دعوای آنان مرنج
بنی مجلس اعضای یکدیگر ند
فقط گاه گاهی بهم می پرند

جناب سید شارق زیدی حنفی

تارِ نفس

بیدِ جمالِ یار کو اے دل ترس اس ابھی
ہوگی نہ چلمنوں کے اُدھر دسترس ابھی

دل پر ہے اختیار نظر پر ہے بس ابھی
جائیں گے بزمِ یار میں بے پیش و پس ابھی

خونِ گشتہ حسرتیں ہیں مری ہم نفس ابھی
رشکِ بہارِ باغ بنے گا قفس ابھی

پھولوں میں تازگی بھی ہے کلیوں میں رس ابھی
صحنِ چمن میں حسن کی ہے دسترس ابھی

جلوے بھی اُن کے ہوں تو بہاریں ہیں کام کی
ورنہ لگا دے آگ انھیں ہم نفس ابھی

اُس نے کہا کہ یہ بھی پرستارِ حسن ہیں
بولی نظر کہ ٹھہریئے آتی ہوں بس ابھی

تنکے اگر نہیں ہیں نہ ہوں بال و پر تو ہیں
اک آشیاں بنے گا درونِ قفس ابھی

جب سُن چکے وہ حال دلِ بے قرار کا
بولے کہ تیرے دل میں ہے باقی ہوس ابھی

کھٹکا لگا ہوا ہے مجھے اپنی موت کا
آنے دے اُن کو بزم میں اے دل نہ ہنس ابھی

میری نگاہِ شوق ہے مدت سے بے قرار
اُس کی نگاہِ ناز نہیں ٹس سے مس ابھی

ان سے بھی یاد ہوتی ہے تازہ بہار کی
رہنے دو میرے سامنے کچھ خار و خس ابھی

تھی باغباں کی فکر نہ صیاد کا خیال
دل سے مرے گئی ہے نہ یادِ قفس ابھی

ہم بھی حریمِ خاص میں پہنچے تھے اے شرف
سنتا ہے دل کی بات کو وہ دادرس ابھی

محترمہ بینا رانی ناز (علیگ)

رازِ محبت

جب جوشِ جنوں گزرے حد سے جب یار کی منزل پاس آئے
پاس آئے نہ کوئی ایسے میں، آئے تو غمِ دل پاس آئے

تو دیکھ تو اپنا دل پہلے، اے ڈھونڈنے والے منزل کے
ہو ذوقِ طلب کامل جو ترا، پھر دوڑ کے منزل پاس آئے

آئے وہ تصور میں اکثر، لیکن نہ ستم سے باز رہے
تڑپا کے اُٹھے وہ دل کو مرے، بن کر وہ غمِ دل پاس آئے

یہ کشتیِ الفت ہے ناداں، منجدھار میں جانا ہے اس کو
اک موجِ تلاطم خیز اُٹھے، جب کشتی و ساحل پاس آئے

یہ رازِ محبت بھی اب تک، سمجھا ہے نہ کوئی سمجھے گا
کیوں دل کی تڑپ بڑھ جاتی ہے، جب کوچۂ قاتل پاس آئے

نظروں میں سماتے ہیں اکثر، دل میں بھی وہ آتے ہیں اکثر
بے ہوش بنا دیتے ہیں مگر، جب عشق کی منزل پاس آئے

کھل جائے گھڑی بھر میں تم پر، سب حال غرور و نخوت کا
جب عشق بھری محفل میں لئے، اک مدِ مقابل پاس آئے

دشوار ہیں اُلفت کی راہیں، دشوار ہوں ناممکن تو نہیں
آئے گی وہ منزل پاس مرے، ہر چند بہ مشکل پاس آئے

اے نازؔ مرا اعجاز ہے سب، ورنہ یہ مناظر دنیا کے
بے خود سے ہو جائیں فوراً، گر ہستیِ باطل پاس آئے

"ریڈیو کا اصل مقصد ثقافتی و جذباتی یگانگت"

جلسۂ تقسیمِ انعامات کے موقع پر ڈاکٹر کیسکر کی تقریر

ریڈیو ڈرامے لکھنے کے انٹر یونیورسٹی مقابلے میں کامیاب ہونے والے طلباء میں تقسیم انعامات کے موقع پر مرکزی وزیر اطلاعات و نشریات ڈاکٹر بی وی کیسکر نے تقریر کرتے ہوئے کہا۔

"آل انڈیا ریڈیو وطن کے نوجوانوں میں ڈرامہ سے متعلق صلاحیت کی حوصلہ افزائی کرنے کے لئے کوشاں ہے۔ ریڈیو زیادہ سے زیادہ مورچوں پر ثقافتی اور ادبی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کے لئے کوشش کر رہا ہے اور اس امر میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ موسیقی کے پہلو بہ پہلو ڈرامہ کی بھی حوصلہ افزائی ہونی چاہیئے۔ کیونکہ اس کا شمار بھی ریڈیو کے بنیادی موضوعات میں ہوتا ہے۔

رنگا رنگ ترقی بھارت میں بہت سی زبانیں بولی جاتی ہیں اور جہاں تک ڈرامہ کا تعلق ہے اس میں گوناگوں قسم کی ترقی ہوئی ہے۔ بعض زبانوں کا اسٹیج نہایت شاندار ہے جبکہ بعض زبانیں ابھی ترقی کے مختلف مرحلے طے کر رہی ہیں۔ اسی طرح کچھ زبانیں ایسی بھی ہیں جنھیں میں قدرے بچھڑی ہوئی زبانیں ہی کہوں گا۔ ان حالات میں ہمارا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ ہم مختلف بھاشاؤں میں ادبی شاہپاروں اور خیالات کے باہم تبادلے کے لئے کوشش کریں تاکہ جن زبانوں میں ڈرامہ اور اسٹیج ابھی تک کچھ بچھڑی ہوئی حالت میں ہے ان کی حوصلہ افزائی ہو اور وہ آگے بڑھ کر ان زبانوں میں دوسری زبانوں سے اثر و فیضان حاصل کرنے کے جذبے کو تیز کر دیں۔ اس طرح یہ طریق عمل ہمارے ملک میں حقیقی اتحاد و یگانگت کا موجب بنے گا۔

ثقافتی اتحاد آل انڈیا ریڈیو کا یہ مقصد رہا ہے کہ وہ ملک ثقافتی اتحاد اور قومی تصور کی تخلیق میں ممد و معاون ہو۔ یہ اتحاد ایک نفسیاتی تصور ہے۔ جس کی تکمیل ایک ایسے ملک میں جو پشتوں تک غیر ملکی اقتدار کے ماتحت رہا ہو۔ آسان کام نہیں ہے۔ کیونکہ ملک میں لسانی، جغرافیائی اور دیگر تمام اقسام کے اختلافات موجود ہیں۔ جن کے پیش نظر ہماری سب سے بڑی ایک ضرورت یہ بھی ہے کہ ہم ایک دوسرے کو جان جائیں۔ اس وقت جب کہ مختلف مورچوں پر تمام اقسام کے معمولی اور تلخ مباحثے جاری ہیں، جن میں زبان کا مبحث بھی شامل ہے۔ میری رائے میں یہ نہایت ہی لازمی ہے کہ ہم ایک دوسرے کو مختلف زبانوں کے بیش قیمت خزانوں سے واقف کرائیں۔

یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ آل انڈیا ریڈیو کی سرپرستی میں ہم ہر سال دو اہم تقریبیں مناتے ہیں۔ جن میں سے ایک "ساہتیہ سمیلن" ہے۔ اس سمیلن کا مقصد یہ ہے کہ وہ مختلف بھارتی بھاشاؤں کی بڑی بڑی ادبی شخصیتوں کو ایک جا پلیٹ فارم پر جمع کرے۔ چنانچہ ہر سال اس قسم کی شخصیتیں اس سمیلن میں شامل ہوتی ہیں۔ ان میں باہم تبادلۂ خیالات ہوتا ہے اور وہ بہترین تصانیف اور مختلف زبانوں کا لٹریچر پیش کرتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس سمیلن میں انھیں دوسری زبانوں میں اپنے ہم نقاد کار سے ملنے ان سے تبادلۂ خیالات کرنے اور ذاتی تعلقات استوار کرنے کا موقع بھی مل جاتا ہے۔ اس طرح اس سمیلن کا اصل مقصد یہی رہتا ہے کہ

مختلف زبانوں سے تعلق رکھنے والے اشخاص ایک دوسرے کو بخوبی جان جائیں اور اس حقیقت کو سمجھ سکیں کہ ہر ایک زبان ایک عظیم دولت کی مالک ہے۔

بیش بہا ادب ہر ایک زبان میں خداداد قابلیت کے مالک اشخاص نے بیش بہا ادب کی تخلیق کی ہے اور ہم سچ مچ اس وقت تک ثقافتی ورثے سے مالا مال بھارتی نہیں کہلا سکتے جب تک ہم تمام بھارتی زبانوں کے بہترین ادبی خزانوں سے واقف نہ ہو جائیں۔ یہی آل انڈیا ریڈیو کا مقصد ہے اور ہم اس مقصد کے حصول کے لئے ہی کوشش کر رہے ہیں۔ بلاشبہ ہمارا یہ اقدام ایک اولوالعزمانہ قدم معلوم ہوتا ہے۔ لیکن میری رائے میں یہ اب بھی کافی اولوالعزمانہ نہیں ہے۔ اگر ہم اس منتہائے مقصود تک پہنچنے میں ذرا سی بھی کامیابی حاصل کر سکیں تو یہ ملک کے اتحاد کے لئے ایک بہت بڑی اور مستقل دین ثابت ہوگی۔

ہمیں معلوم ہے کہ تمام بھارتی بھاشاؤں میں بہت اچھا لٹریچر موجود ہے لیکن ایسے کتنے اشخاص ہیں جو اپنی زبان کو چھوڑ کر دوسری زبانوں کے متعلق کچھ واقفیت رکھتے ہیں، مثال کے طور پر آپ ان اشخاص کو لیجئے جو پنجاب یا اتر پردیش میں رہتے ہیں اور پھر یہ دیکھئے کہ ان میں سے کتنے اشخاص تامل یا ملیالم کے عظیم و طرفہ شہ پاروں سے واقف ہیں۔ شاید ہی کوئی واقف ہو بلکہ ان کی تعداد نفی کے برابر ہی ہوگی۔ یہی بات تامل ناڈ کے اشخاص پر صادق آتی ہے کیونکہ وہ ہندی لٹریچر سے واقف ہی نہیں ہیں۔ اگر ہم ایک زبان کی اعلیٰ پایہ کی کم از کم چند ایک تصانیف سے دوسری زبان کے اشخاص کو واقف کرانے میں کامیاب ہو جائیں تو ہم سمجھیں گے کہ ہم نے بھارتی عوام کو ایک دوسرے کے نزدیک لانے میں کافی حصہ ادا کیا ہے۔ اس موقع پر ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ہم سب بھارتی ہیں اور ہم سب ایک ہی راشٹر ہیں اور نفسیاتی و اخلاقی تصورات کی وحدانیت کے باعث سب متحد ہیں اور جب تک نفسیاتی اور جذباتی طور پر ایک نہ ہو جائیں تب تک جسمانی اتحاد ناممکن ہے۔ نیز اس کا کوئی دوسرا نعم البدل بھی نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ ہر ایک زبان اپنی اہمیت حیثیت اور خوبصورتی رکھتی ہے۔ ملیالم کی خوبصورتی کا پنجابی کی خوبصورتی کے ساتھ مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ ہر ایک زبان دوسری زبان کے مقابلہ میں سدا ہی کسی خاص خصوصیت کی مالک بنی رہے گی۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ ہم ان تمام زبانوں کی سب سے عمدہ تصانیف کو لے کر ان کی خوبصورتی کی اقدار عوام کے سامنے لائیں کیونکہ یہ خوبی کسی نہ کسی صورت میں بھارت ہی کی خوبصورتی ہے۔

اختلاف میں اتحاد بھارت میں وسیع پیمانے پر رنگا رنگی موجود ہے اور رنگا رنگی نہ صرف اس کی عظمت کا بلکہ اس کی طاقت کا بھی باعث ہے۔ ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ ہمارے یہ تمام اختلافات ہمارے کے مختلف پہلوؤں کے مظہر ہیں اور ہمیں لازمی طور پر مختلف زبانوں کے توسط سے ان مختلف پہلوؤں کی قدر و قیمت لگانی چاہیئے۔ اس مجھے یہ پوری توقع ہے کہ آل انڈیا ریڈیو اس پہلو یا دیگر پہلوؤں پر جو مساعی صرف کر رہا ہے ان سے عوام کو اپنے پڑوسیوں، پڑوسی صوبوں اور پڑوسی زبانوں کی بابت واقفیت حاصل کرنے میں مدد ملے گی اور اس کے بعد وہ اسی واقفیت کے باعث ایک دوسرے کے زیادہ نزدیک آ جائیں گے۔

پہلے یورپی زبانوں کا علم حاصل کرنے والوں کے لئے اصول تھا کہ جب کوئی طالب علم اپنی کتابی تعلیم ختم کر لیتا تو اس کی اس وقت تک نامکمل سمجھی جاتی تھی جب تک وہ یورپ کے ممالک میں تعلیم و تعلیم مختلف مرکزوں اور یونیورسٹیوں میں ایک نہ رہے۔

جبری روابط میری خواہش ہے کہ اسی قسم کی

بری چیز بھارت میں بھی ہو۔ گریجویٹ بننے کے بعد یہ ضروری قرار دیا جائے کہ طالب علم ملک کے دو یا تین اہم ثقافتی مرکزوں میں کم از کم ایک سال تک ضرور رہے اور یہ مراکز اس کے اپنے تعلیمی مرکز سے بہت دور ہونے چاہئیں۔ اس سے اسے اپنے وطن کا ٹھیک ٹھیک حال معلوم ہو جائے گا اور اس کے مختلف حصّوں میں وقوع پذیر امور کی بابت صحیح تصوّر مل جائے گا۔ یہ ملک کے لئے ایک ہمت مندانہ اقدام ہوگا اور مجھے امید ہے کہ یہ رواج جلدی ہوگا اور اس کے باعث زیادہ سے زیادہ طلباء کو ملک کے مختلف حصّوں میں جانے کا موقع ملے گا۔ ہمیں یہ جان لینا چاہیئے کہ جہاں تک طلباء کا تعلق ہے اس سے پیشتر کہ وہ زندگی میں کوئی کام دھندا اختیار کرلیں ان میں یہ رواج زیادہ اچھے اور زیادہ دانشمندانہ ڈھنگ پر عمل کرتا ہے۔

اس حالت میں وہ اپنے ملک کے ساتھ ذاتی طور پر راہ و رسم بڑھا کر براہ راست یہ محسوس کر سکتے ہیں کہ ان کا وطن کتنا وسیع اور کس قدر گوناگوں پہلوؤں کا متحمل ہے۔

ریڈیو تکنیک } جن طلباء نے اس مقابلے میں انعام حاصل کئے ہیں ان کا سواگت کرتے ہوئے مجھے از حد مسرت ہو رہی ہے۔ ڈائرکٹر جنرل نے یہ بجا طور پر کہا کہ ریڈیو اور راہ و ربط کے دیگر وسائل میں بالکل مشابہت موجود نہیں ہے۔ ایک ڈرامہ جو کسی دوسرے اسٹیج پر پیش کیا جا سکتا ہے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ ریڈیو پر بھی اوّل درجہ کا ڈرامہ ثابت ہو۔ تاوقتیکہ اسے ریڈیو کے مناسب صورت میں پیش نہ کیا جائے کیونکہ اسٹیج پر پیش ہونے والا ڈرامہ سامعی اور بصری ہوتا ہے۔ مگر ریڈیو پر وہ صرف سامعی ہوتا ہے یعنی وہ صرف سنا ہی جا سکتا ہے۔ اس لئے ریڈیو ڈرامے کی تکنیک ذرا مختلف ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس ملک میں اس تکنیک کو فروغ حاصل ہوگا اور اس لئے شاید کچھ وقت بھی درکار ہوگا لیکن مجھے یقین ہے کہ اسے روز افزوں فروغ حاصل ہوگا۔ نوجوان اس میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی لیں گے اور جلد ہی ہمارے پاس اوّل درجہ کے ریڈیو ڈرامہ نویس ہوں گے جو ریڈیو کو مقبول بنانے میں اہم کردار ادا کریں گے کیونکہ ڈرامے کا شمار ریڈیو کی مقبول ترین مدات میں ہوتا ہے۔

میری خواہش ہے کہ میں ان اشخاص کو ایک بار پھر مبارکباد دوں جنھوں نے یہ انعام حاصل کئے ہیں اور میرا خیال ہے کہ وہ مستقبل میں زیادہ سے زیادہ ریڈیو ڈرامے تیار کرنے کے موضوع پر سنجیدگی سے سوچیں گے۔

یر دہلوی

غزل

ہان جانے کو سو بار جائے
شکوۂ حسن لب پہ نہ آئے

جن کو بادل سمجھتی ہے دنیا
مے کشوں پہ ہیں رحمت کے سائے

وہ تصور میں ہیں جلوہ فرما
تا سحر نیند یارب نہ آئے

دیکھ کر اُن کا رنگِ تبسم
غنچہ و گل سبھی مسکرائے

میری پلکوں پہ شب بھر ستارے
جگنوؤں کی طرح جھلملائے

یہ فضا یہ چمن یہ بہاریں
کاش اُن کی نہ اب یاد آئے

اے امیرؔ اُن سے نظریں ملا کر
زندگانی نہ کیوں جھوم جائے

انجمن تعمیرِ اردو دہلی کے ایک طرحی مشاعرہ کی

غزل

(سید عظمتؔ علی)

دل میں کیوں ہوک اُٹھی، آپ کا نام آتے ہی
ابرِ شب تار، جواں ساقی و جام آتے ہی

حسن نے ثبت کیا نقشِ دوام آتے ہی
دامنِ صبر چھٹا، ہاتھ میں جام آتے ہی

منکشف ہوگئے، اسرارِ حقیقت ہم پر
دلِ حساس کو، فطرت کا پیام آتے ہی

شبِ تاریک میں ہے "وعدۂ دیدار اُن کا"
جانے کیا دل کا بنے گا مرے، شام آتے ہی

میری طینت ہے محبت، مری فطرت ہے یقیں
سجدے بیتاب ہوئے آپ کا نام آتے ہی

اپنی آنکھوں سے پلا کر مئے عرفاں کے جام
میری اُلفت کو دیا نقشِ دوام آتے ہی

جگمگا دیگا سبھی "عشق کے تاریک محل"
حسنِ رخشندہ سے، وہ ماہِ تمام آتے ہی

بخدا اتنی ہی اُلفت ہے انھیں بھی مجھ سے
مسکرا دیتے ہیں فوراً، مرا نام آتے ہی

تجھ پہ کھل جائے گی پھر ساری حقیقت عظمتؔ
اُن کی پیچیدہ لٹوں کے یہ دام آتے ہی

غزلیں

اسد اللہ خاں غالب

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی
در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا

وائے دیوانگیٔ شوق کہ ہر دم مجھکو
آپ جانا اُدھر اور آپ پریشاں ہونا

جلوہ از بسکہ تقاضائے نگہ کرتا ہے
جوہر آئینہ بھی چاہے ہے مژگاں ہونا

عشرتِ قتل گہہِ اہلِ تمنا مت پوچھ
عید نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

لے گئے خاک میں ہم داغ تمنائے نشاط
تو ہو اور آپ بصد رنگ گلستاں ہونا

عشرتِ پارۂ دل زخمِ تمنا کھانا
لذتِ ریشِ جگر غرقِ نمکداں ہونا

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ
ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

ہائے اُس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

قمر مرادآبادی

ہم سکھا دیں گے ہر اک قطرے کو طوفاں ہونا
بے ادب ہم سے نہ اے گردشِ دوراں ہونا

مستقل طنز ہے آئینِ چمن بندی پر
اپنے ماحول سے خوشبو کا پریشاں ہونا

شکوۂ جور و ستم لاکھ بجا ہے لیکن
کون دیکھے گا اُن آنکھوں کا پشیماں ہونا

پھول کو گرمیِ احساس ہے درکار ابھی
مشتعل اور ذرا سوزِ بہاراں ہونا

میرے افکار سے جب گردشِ دوراں اُلجھی
یاد آیا تری زلفوں کا پریشاں ہونا

کچھ تو ہر موج میں ہوتا ہے تلاطم خود بھی
اور کچھ وقت سکھا دیتا ہے طوفاں ہونا

میں بہارِ گل و لالہ میں سما جاؤں گا
تم جمالِ مہ و انجم سے نمایاں ہونا

ہائے آغازِ محبت کی وہ پیہم اُلجھن
کچھ نہ ہونا تو خیالوں سے پریشاں ہونا

وہی موجیں لئے جاتی ہیں بہا کر ہم کو
اے قمر ہم نے سکھایا جنھیں طوفاں ہونا

غزل

سید اعجاز حسین ضامن

آپ سے ملنے کا امکان نہیں ہے نہ سہی
میں سمجھ لوں گا کہ اک جان نہیں ہے نہ سہی

وہ تو کر دیتے مجھے مرتبۂ وصل عطا
میرے ہی دل میں یہ ارمان نہیں ہے نہ سہی

حسن کی قوتِ تسخیر کا قائل ہے جہاں
متفق اس سے اک ایمان نہیں ہے نہ سہی

عشق میں رہبری خضر گوارا کیوں ہو
راستہ کی مجھے پہچان نہیں ہے نہ سہی

اپنی ہستی کو مٹا دینا بھی کیا مشکل ہے
وصل ان کا اگر آسان نہیں ہے نہ سہی

آنکھوں کی راہ سے سب دل کا لہو کھینچ لیا
وہ نظر پھر بھی پشیمان نہیں ہے نہ سہی

گھر کو ویرانہ بنا دوں گا جنوں کی خاطر
اس کی قسمت میں بیابان نہیں ہے نہ سہی

تم تو اپنی نگہِ ہوش رُبا کو روکو
میرے قابو میں گریبان نہیں ہے نہ سہی

اپنے محبوب کی یکتائی کا دم بھرتا ہے
ضامن اے شیخ مسلمان نہیں ہے نہ سہی

غزل

شباب زیدی لکھنوی

جب کبھی لطف و عنایت کی نظر ہوتی ہے
تو مری شامِ تمنا کی سحر ہوتی ہے

ہر نئی طرح جو پڑتی ہے اقامت کے لئے
وہ بھی منجملۂ اسبابِ سفر ہوتی ہے

شبِ تنہائی کے عالم میں تسلی کے لئے
تو نہیں دوست، تری یاد مگر ہوتی ہے

چھین لیتی ہے جو ہستی کا سکوں، دل کا قرار
وہ کسی شوخ کی دُزدیدہ نظر ہوتی ہے

پھوٹنے لگتی ہیں مینا سے گلابی کرنیں
شام ہوتی ہے کہ رندوں کی سحر ہوتی ہے

کون خاروں میں ہے پامال انہیں کیا معلوم
زندگی جن کی شگوفوں میں بسر ہوتی ہے

فکر کیا ہے، نہ سہی دولت دنیا، نہ سہی
جان دے کر بھی ہم عشق کی سر ہوتی ہے

تیری تزئین کے صدقے، کبھی اتنا تو بتا
ہم ہیں کس حال میں کچھ یہ بھی خبر ہوتی ہے

اُن سے شکوہ نہ کرو جورِ مسلسل کا شباب
کہتے ہیں یوں بھی عنایت کی نظر ہوتی ہے

نئی دنیا کے علامہ روحانی کے خیال میں

نکاھی

چاند کا سفر

اس زمین کا شاعر اقبال اب سے بہت پہلے کہ گیا ہے کہ ؎

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

چنانچہ اقبال کی اس زمین سے جستجو کرنے والے، ستاروں سے آگے کے جہاں ڈھونڈھتے ہوئے چاند سے آگے نکل چکے ہیں اور اب یہ طے ہو چکا ہے کہ کائنات کی تسخیر انسانی اختیارات سے باہر کی چیز نہیں عنقریب وہ زمانہ آنے والا ہے کہ ہمارے بچے مریخ یونیورسٹی میں پڑھیں ہم ان کو اپنی خیریت کے خط کبھی زہرہ سے لکھا کریں گے اور کبھی مشتری سے کہ الحمدللہ میں بخیریت ہوں اور تمھاری خیریت نیک مطلوب ہے میں سرکاری کام سے ایک ہفتہ کے لئے مشتری آیا ہوا ہوں۔ والدہ تمھاری چاند ہی میں اپنی کچھ سہیلیوں سے ملنے اتر گئی تھیں واپسی میں ان کو لیتا ہوا دنیا کی طرف چلا جاؤں گا۔ تم اپنی خیریت کا خط دنیا ہی کے پتہ پر بھیج دینا۔ سنا ہے کہ آئندہ ماہ مریخ میں ایک کل کائناتی مشاعرہ ہو رہا ہے اور مجھ کو بھی بلایا جا رہا ہے اگر یہ درست ہے تو اس مشاعرے کے موقع پر تم سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔

جی ہاں اس قسم کے مشاعرے عام طور پر ہوا کریں گے ممکن ہے کہ وہ اردو۔ فارسی یا عربی کے بجائے کسی کائناتی زبان میں ہوں اور مصرعہ طرح کچھ اس قسم کا آیا کرے کہ ؏

۲/۴ × چوغ غاف ÷ ۱/۸ + آخ آخ آخ

آپ کہیں گے کہ اس قسم کے مصرعہ طرح پر غزل کیوں کر ہو سکے گی۔ یہ تو ہم کو بھی فی الحال نہیں معلوم مگر یہ طے ہے کہ شاعری کچھ اسی قسم کی ہوگی اور طبع آزمائی کے لئے اسی قسم کے مصرعے دیئے جائیں گے۔ اگر ہمارے شعرائے کرام یہ چاہتے ہیں کہ ان کی شاعری یہ شکل اختیار نہ کرے تو ان کو بھی چاہیئے کہ وہ بھی ان ستاروں کی طرف جانے میں کسی سے پیچھے نہ رہیں۔ تاکہ وہاں جا کر شعر و ادب کے وہی چرچے شروع کرائیں جو وہ چاہتے ہیں مگر سنا ہے کہ بعض ستارے ایسے ہیں جنھیں تخلص کے بجائے دُم رکھنا پڑتی ہے۔ شروع شروع میں تو شرم آئے گی اس دُم پر مگر جب سب ہی دُمدار نظر آئیں گے تو یہ حجاب اٹھ جائے گا۔ غرض مدعا یہ کہ شعراء کو بھی تکلف سے کام نہ لینا چاہیے ورنہ ان ستاروں کی ادبی فضائیں ان کے قابو سے باہر ہو جائیں گی۔

مشاعرے تو مشاعرے بہت سی ایسی شادیوں میں بھی شرکت کرنا پڑے گی کہ ہم اپنی دنیا میں ہیں۔ برات جا رہی ہے زحل سے اور دلہن کا گھر عطارد میں، مگر تعلقات کچھ اس قسم کے ہیں کہ اس تقریب میں شریک ہونا بے حد ضروری ہے لہذا ہمیں کے راکٹ پر اور روانہ ہو جائیں گے۔

اس وقت تو آپ اس کو مذاق سمجھ رہے ہوں گے مگر چاند تک راکٹ کے پہنچنے پر بھی تو آپ ہنسا کرتے تھے اور بڑے تمسخر سے کہتے تھے کہ

؏ ایں خیال است و محال است و جنوں

آخر انسانی تخلیق نے اس وہم کو واقعہ کر دکھایا یا نہیں۔ اگر یہ ہو سکتا ہے تو باقی باتوں پر آپ کو تعجب کیوں ہے۔

پہلے جب کبھی ہم چکور کو چاند کے گرد چکر کاٹتے دیکھا کرتے تھے تو اس کا مذاق اڑایا کرتے تھے کہ ع

چکھی باورا چاند سے پیت لگائے

اس کے بعد جب روسیوں نے چاند کی طرف اپنا راکٹ چھوڑا تب بھی ہم نے روسیوں کا مذاق اڑایا۔ ع

روسی باورا چاند سے پیت لگائے

پھر اس کے بعد جواب الجواب کے طور پر امریکنوں نے بھی اپنا راکٹ چاند کی طرف روانہ کیا، تب بھی ہم مذاق اڑانے سے باز نہ آئے کہ ع

یانکی باورا۔ چاند سے پیت لگائے

لیکن ۴ جنوری کی صبح کو روس نے جو راکٹ چھوڑا ہے اس نے تو الٹا ہم سب کا مذاق اڑایا ہے، اور زبان خاموشی سے یہ مصرع پڑھ کر ہم سب پر طنز کر رہا ہے کہ ع

جس نے لگائی ایڑ وہ سورج کے پاس تھا

آپ تو جانتے ہیں کہ روس امریکہ کا مخالف ہے اور امریکہ روس کا۔ روسیوں نے جو یہ راکٹ چھوڑا ہے اس سے امریکنوں میں یقیناً تشویش کی لہر دوڑ گئی ہوگی۔ اب کہنے کو امریکنوں کے پاس یہ مصرعہ بھی نہیں رہا کہ ع

یہ ہوائی "کسی" دشمن" نے اڑائی ہوگی

روسی سائنسدانوں نے دعویٰ کیا ہے کہ عنقریب چاند پر ایسا راکٹ بھیجا جائے گا جس میں انسان سوار ہوں گے۔

اگر ایسا ہونے لگا اور ہوائی جہازوں کی جگہ راکٹوں نے لے لی اور اگر سات میل فی سیکنڈ کی رفتار سے راکٹ اڑنے لگے تو پھر وہ دور بھی آجائے گا جب آپ اپنے دوست سے کہیں گے۔

"یار تم ذرا پانچ منٹ میرے ڈرائنگ روم میں انتظار کرو میں ذرا چاند ہو آؤں"

بس ایک منٹ میں پہنچا، تین منٹ وہاں ٹھہرا اور ایک میں لوٹ آیا۔

خلائی سفر کے آغاز سے ان محبوباؤں اور محبوبوں کو بڑی خوشی ہوگی جن کے سخت گیر والدین یا "ظالم سماج" ان کی آپس میں شادیاں نہیں ہونے دیتا۔ خلائی سفر کے آغاز کے بعد ان کی یہ دیرینہ تمنا بر آئے گی۔ ع

آ جا کہیں دور چلیں

دنیا کی نظروں سے دور چلیں

چھپ چھپ کر پیار کریں

اس کے بعد شادی شدہ لوگوں کو "ہنی مون" منانے کا صحیح لطف آئے گا۔ شادی کی زمین پر اور ہنی مون منانے تک پہنچ گئے۔

"مون" میں "ہنی" بھی اصلی۔ اور "مون" بھی اصلی۔

جن لوگوں کی شادیاں نہیں ہوئی ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو ملاقات کے وقت دیا کریں گے۔

"آج شام کو کہاں ہوگی؟

"چاند میں"

"چاند میں کہاں ڈھونڈتا پھروں گا؟"

"چاند میں جو بڑھیا بیٹھی چرخا کات رہی ہے اس سے پوچھ لینا"

آئندہ سے لوگ چاندنی رات میں سیر کرنے کے بجائے چاند پر چہل قدمی کریں گے۔ رات کا سناٹا چھایا اور بیگم کو دعوت دی۔

"آؤ بیگم، ذرا چاند پر ٹہل آئیں"

جن بچوں کے کوئی ماموں نہیں ہیں اور انھیں یہ شکایت ہے کہ

چندا ماموں دور کے

ہم کو دیکھیں گھور کے

ان بچوں کے والدین انھیں خوش کرنے کے لئے اس طرح کہیں گے۔

"چلو منی تمھیں چندا ماموں سے ملا لائیں !" منی خوشی خوشی چندا ماموں کے پاس جائے گی اور چندا ماموں کے بجائے وہ خود بڑی بھی حیران اپنی ننھی ننھی آنکھوں سے چندا ماموں کو "گھور کے" دیکھے گی۔

منی چاند کو گھور رہی ہے۔

اور چاند منی کو گھور رہا ہے۔

اس قسم کی گفتگو بھی سننے میں آئے گی۔

"کیوں رخسانہ! تمھارے خاوند کہاں گئے ؟

بی رخسانہ جواب دیں گی۔

"آپ تشریف رکھئے۔ ابھی پانچ منٹ تک آئے جاتے ہیں۔ ذرا چاند تک گئے ہیں۔"

گویا چاند نہیں اپنی گلی کے نکڑ تک گئے ہیں۔

یہ ہے انسان کی زندگی کا مستقبل، اس لئے زمین کے مطالبات زمین پر چھوڑیئے اور گردن اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھئے۔ چاند کی کرنیں ہمیں اپنی طرف آنے کا اشارہ کر رہی ہیں۔

اردو کے ایک شاعر نے کہا تھا۔

انھیں اشاروں سے ہوتی ہے گدگی اے چاند
وہ جاگ اٹھیں نہ ستاروں کے جھلملانے سے

دو برس پہلے تک یہ شعر نازک خیالی کی ایک مثال تھا۔ لیکن اب حقیقت بنتے دکھائی دے رہا ہے۔ اور ہو سکتا ہے کہ آئندہ عاشق مزاج لوگ انھیں بیدار کرنے کا کام چاند سے لینے لگیں گے۔ اور ان کی بدگمانی کا وہ اندیشہ بھی باقی نہ رہے جس میں حضرت غالب مبتلا ہو گئے تھے۔

اور انھیں کہنا پڑا تھا ؎

لے تو لوں سوتے میں اس کے پاؤں کا بوسہ مگر
ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائے گا

طاہرہ کاظمی

غزل

فضا کی اداسی میں چشم تمنا، شب غم سے مانوس تر ہو گئی ہے
کہیں مضمحل ہیں امیدوں کے سائے، کہیں دشت میں آرزو سو گئی ہے

بہت تیز ہیں قافلے زندگی کے، کوئی مڑ کے دیکھے کسی کو تو کیوں کر
ابھرتا نہیں کوئی بھی نقش روشن، صدائے جرس رات میں کھو گئی ہے

ہیں نوخیز غنچوں کے دامن میں آنسو، فریب تمنا نے کیا گل کھلایا
یہ شبنم بھی جو پر دۂ شب میں چھپ چھپ، خزاں کے اشارو ں پہ خوں رو گئی ہے

فریب گلستاں میں آجانے والو، نشیب گلستاں سے آگاہ رہنا
جفا کیش صیاد کی چیرہ دستی، گلستاں میں کچھ خار بھی بو گئی ہے

سکھایا مجھے زندگی کا قرینہ، امیدوں کا مسکن یقیں کا خزینہ
تری یاد اتری ہے زینہ بہ زینہ، تو ظلمات میں روشنی ہو گئی ہے

وہ اس سمت اک سحر آگیں خموشی، دل منتظر کو وہی ارمغاں ہے
نہ گونجا ادھر کوئی نغمہ تو کیا غم، وہاں تک ہماری صدا تو گئی ہے

ثقافتی خبریں

پاکستان ہندوستان سے دوستانہ تعلقات چاہتا ہے

پاکستان کی وزارت خارجہ کے ترجمان نے کانگریس کے ۶۴ ویں سالانہ اجلاس میں پنڈت نہرو کی اس تقریر پر جس میں انھوں نے کہا تھا کہ ہندوستان اور پاکستان کو امن کے ساتھ مل جل کر رہنا ہوگا تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان کی بھی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ ہندوستان سے اس کے دوستانہ تعلقات قائم ہو جائیں۔ اگر دونوں ملکوں میں دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے تو پاکستان کی حکومت کو اس سے زیادہ کوئی اور خوشی نہ ہوگی۔ جب پاکستان کی وزارت خارجہ کے ترجمان سے وزیر اعظم پنڈت نہرو، وزیر داخلہ پنڈت پنت اور وزیر دفاع کرشنا مینن کی تقریروں پر تبصرہ کرنے کو کہا گیا تو موصوف نے کہا پاکستان اچھی طرح جانتا ہے کہ دھمکیوں سے کوئی مفید نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ اگر ہندوستان پاکستان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائے تو پاکستان اس کا خیر مقدم کریگا۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ذریعۂ تعلیم اُردو ہو

معلوم ہوا ہے کہ انجمن ترقی اُردو ہند کی مقامی شاخ کی مجلس عاملہ نے اپنی میٹنگ میں ایک تجویز پاس کر کے حکومت ہند اور علی گڑھ یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد سے مطالبہ کیا ہے کہ یونیورسٹی مذکور میں آئندہ تعلیمی سال سے مستقل طور پر اُردو زبان کو ذریعۂ تعلیم بنایا جائے۔

چینی آرٹسٹوں کا وفد بھارت میں

بھارت سرکار کی دعوت پر چار چینی آرٹسٹوں کا وفد بھارت آیا جنہوں نے چھ ہفتہ تک ملک کا دورہ کیا اور یوم جمہوریہ کی تقریبات دیکھیں۔

قرآن کریم کے پشتو میں ترجمے

پشاور کے ایک پشتو ادارے نے اعلان کیا ہے کہ وہ عنقریب قرآن کریم کا پشتو زبان میں ترجمہ کرنے کا کام شروع کر رہا ہے۔

امریکہ اور روس میں اعصابی جنگ ختم کرنے کے لئے تجارتی بحالی پر زور

روس کے نائب وزیر اعظم مسٹر میکویان نے اپنے دورۂ امریکہ کے دوران فرمایا کہ امریکہ اور روس میں اعصابی جنگ ختم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ دونوں ملکوں کی تجارت کی پابندیوں کو جلد از جلد ختم کر دیا جائے۔ امن کے قیام کے لئے تجارت کی توسیع نہایت ضروری ہے۔

ہندی طریقہ علاج

عالیجناب حکیم عبدالحمید صاحب صدر آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس نے ایک خط مسٹر یو۔ این۔ دھیبر صدر آل انڈیا کانگریس کو لکھا ہے۔ جس میں انھوں نے کانگریس کی ۱۹۲۰ء کی قرارداد کے وہ الفاظ یاد دلائے ہیں جن میں کہا گیا تھا کہ "ہم کوشش کریں گے کہ مفاد عامہ کے پیش نظر ہر دو طریق علاج کو رائج کرانے کے لئے ہر ممکن طریقہ اختیار کریں اور تمام ملک میں اسکول و کالج قائم کریں اور ہسپتالوں میں ان کو زیادہ سے زیادہ رواج دیں"

اس یاد دہانی کا مقصد یہ ہے کہ حال ہی میں گورنمنٹ نے دیسی طریقہ علاج پر ناواجب پابندیاں عائد کی ہیں جس سے ہندوستان کے متوسط اور کثیر طبقہ کو تشویش پیدا ہوئی تھی۔ عوام کا خیال ہے کہ اگر دیسی طریقہ علاج کو حکومت نے بجبر بند کر دیا تو یہ غریبوں کے لئے

علاج سے محروم کرنے کے مصداق ہوگا اور ڈاکٹری علاج کی گرانبہائی ایک غریب کے لئے کرتوڑ ثابت ہوکر اس کو مرنے پر آمادہ کردے گی۔ ہمیں امید ہے کہ حکومت ہند اپنے اس آثار کہنہ کو مٹی کے ڈھیر سے پاٹنے کی کوشش ہرگز نہیں کرے گی بلکہ ۱۹۵۴ء کے خواب کی تعبیر کے طور پر اس کو عملی شکل دینے کا فوری بندوبست کرے گی اور اس کو اونچے معیار پر لانے کی ہر ممکن کوشش سے گریز نہیں کرے گی۔

پاکستان کا قومی عجائب گھر

محکمۂ آثار قدیمہ قومی عجائب گھر کی ایک وسیع عمارت تعمیر کرا رہا ہے جس پر تقریباً ۵۰ لاکھ روپیہ صرف ہوگا۔ اس کی تعمیر شروع ہو چکی ہے تیاری کے بعد اس میں پاکستان کے قومی آثار رکھے جائیں گے۔

پاکستان میں نیشنل تھیٹر کی تعمیر

دوسال کے اندر کراچی میں ایک نیشنل تھیٹر ۶۰ لاکھ کی لاگت سے تیار کیا جائے گا جس میں جدید قسم کا اسٹیج ہوگا۔ یہ تھیٹر ثقافتی پروگراموں اور بین الاقوامی کانفرنسوں کے لئے استعمال کیا جایا کرے گا۔

ملکۂ ایلزبتھ کے شوہر بھارت کے دورہ پر

ڈیوک آف ایڈنبرگ یعنی ملکۂ ایلزبتھ دوئم سربراہ دول مشترکہ کے شوہر سائنس کانگریس میں شرکت کرنے کے لئے جنوری کے آخری ہفتہ میں بھارت تشریف لائے۔ موصوف نے جمہوریہ کی تقریب میں بھی شرکت فرمائی...... اور ۳۱ جنوری کو آپ کلکتہ بھی پہنچے جہاں ایسٹ انڈیا کمپنی کی بنیاد پڑی تھی۔

صدر آئزن ہاور آئندہ موسم سرما میں بھارت کا دورہ کریں گے

معلوم ہوا کہ جب وزیر اعظم پنڈت نہرو امریکہ گئے تھے تو انھوں نے ذاتی طور پر صدر موصوف کو بھارت کا دورہ کرنے کی دعوت دی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ناٹو کے دسویں سالانہ اجلاس کی شرکت کے دوران یورپ جائیں گے اور پھر بھارت کا بھی دورہ فرمائیں گے۔

ہند سوویٹ معاشی تعاون کی ایک جھلک

ہندوستان اور سوویت یونین کی تجارت اب بہت بڑھ گیا ہے۔ پہلے کل تجارت تقریباً نوے لاکھ کی تھی۔ پچھلے سال تجارت کی مجموعی رقم پانچ کروڑ روبل تھی۔

پچھلے سال ہندوستان نے جو مال سوویت یونین کو برآمد کیا اس میں چھوٹی کھالیں ہندوستان کی مجموعی برآمد کا ۵۶ فیصدی، جوتوں کی مجموعی برآمد کا ۳۰ فیصدی اور گرم مصالحوں کا ۲۷ فیصدی اور اون کا ۳۰ فیصدی حصہ سوویت یونین گیا۔

ہندوستان اور سوویت یونین کے معاشی تعاون کی مختلف صورتیں ہیں۔ اس تعاون کی ایک صورت وہ امداد ہے جو سوویت یونین بھلائی کارخانۂ آہن و فولاد کی تعمیر اور ہندوستان میں تیل اور گیس کے ذخیروں کی کھوج لگانے میں دے رہا ہے۔ برما چلانے کے سوویت اوزار اور مشینیں ہندوستان پہنچا دی گئی ہیں اور تیل اور گیس کے لئے گہری ڈرلنگ اسی سال شروع ہو جائے گی۔

پچھلے سال سوویت یونین نے ہندوستان کو اک رپ۔ ۴ ٹائپ کے چار چلتے پھرتے سینما اور ریڈیو یونٹ بھیجے ہیں۔ ایک سینما یونٹ کا مجموعی وزن سو کلو گرام ہے جو بیٹری کے وزن کے ساتھ ۲ سو کلوگرام ہو جاتا ہے۔ یہ سینما اور ریڈیو یونٹ دور کے گاؤں میں بھی لے جائے جا سکتے ہیں اور بیٹری کی توانائی سے انھیں چلا کر گاؤں والوں کو فلمیں دکھائی جا سکتی ہیں۔

☆

اعلان متعلقہ ملکیت و دیگر تفاصیل

(بابتہ رسالہ آہنگ فارسی و اردو)

۱۔ مقام اشاعت:۔ الہ آباد پریس ۳۱۰ چاوڑی بازار دہلی۔
۲۔ وقفہ اشاعت:۔ ماہانہ۔
۳۔ نام پرنٹر:۔ سید عظمت علی۔
۴۔ قومیت:۔ ہندوستانی۔
پتہ:۔ ۳۱۰ چاوڑی بازار دہلی۔
۵۔ نام پبلشر:۔ سید عظمت علی۔
قومیت:۔ ہندوستانی۔
۶۔ نام ایڈیٹر:۔ ″
قومیت:۔ ″
۷۔ نام ایسے افراد جو اخبار ہذا کے مالک حصہ دار یا شیئر ہولڈر جنکے شیئر ایک فی صد سرمایہ سے زیادہ ہیں۔

جواب:۔ واحد مالک مطابق ۳ اور میں عظمت علی اعلان کرتا ہوں کہ تفصیل متذکرہ بالا میرے بہترین علم و یقین کے مطابق صحیح ہیں۔

دستخط پبلشر
عظمت

کاغذی نایابی

اور گرانی نے ہمیں اس حد تک مجبور کر دیا کہ ہم آہنگ کے مسلسل شمارے شائع نہ کر سکے جسکے لئے جملہ خریداروں اور دانشوروں سے ہم معذرت خواہ ہیں۔

کوٹہ کا کاغذ چونکہ آجتک ہمیں حاصل نہ ہو سکا، اسمیں ہماری کوتاہی ہے۔ یا کیا۔

بہر حال ہم آپکے مسلسل انتظار سے شرمندہ ہیں۔ ابھی تک اگرچہ فراہمی کاغذ میں ہم ناکام ہیں، پھر بھی کوشش کرینگے کہ رسالہ متواتر آپ تک پہنچتا رہے۔

مینجر

فرہنگ جدید فارسی

ہندوستان میں جدید فارسی کا کوئی مکمل لغت موجود نہ ہونے کے باعث طلبار کو بڑی دشواریاں لاحق تھیں۔ آجکل ہندوستان میں جو لغات دستیاب ہیں وہ قطعی نامکمل اور موجودہ و مروجہ الفاظ سے خالی ہیں طلبا، کی ان مشکلات کو دیکھتے ہوئے ادارہ آہنگ نے ایران کے تازہ ترین لغات کا مطالعہ کرکے **فرہنگ جدید** کے نام سے ایک جامع لغت مرتب کیا ہے جس کی آقای سید امیرحسن عابدی ایم اے پی ایچ ڈی نظر ثانی فرمائی ہیں۔ یہ لغت، دانشجویانِ ادب فارسی کے لئے ایک بیش بہا خزانہ ہے جس کا ہر طالب علم کے پاس رہنا نہایت ضروری ہے۔

اس کی اصل قیمت اگرچہ ۲۵ روپے ہے لیکن ادارہ اس شرط پر صرف ۱۵/ پندرہ روپے کا اعلان کرتا ہے۔ کہ پانچ روپے قیمت پیشگی بھیج کر اپنی جلد محفوظ کرالیں۔ زاں بعد وہی مقررہ قیمت ۲۵ روپے پر مل سکے گا۔

آہنگ پبلشنگ 310 چاوڑی بازار دہلی

سید عظمت علی پرنٹر پبلشر نے الہ آباد پریس دہلی سے چھاپکر ۳۱۰ چاوڑی بازار دہلی سے شا[ئع کیا]